حیاتِ بقا
اور
کچھ یادیں

محمد مظہر بقا

حیاتِ لقا

اور

کچھ یادیں

محمد مظہر بقا
فاضلِ دیوبند، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی
اُستاد جامعہ اُمّ القریٰ
مکہ مکرمہ

نام کتاب	:	حیات بقا اور کچھ یادیں
مصنف	:	مولانا ڈاکٹر مفتی محمد مظہر بقا
تعداد	:	گیارہ سو
اشاعت	:	ربیع اول ۱۴۲۷ھ / اپریل ۲۰۰۶ء
صفحات	:	۴۰۸
ناشر	:	زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

ملنے کے پتے

دارالاشاعت	اردو بازار، کراچی
فضلی بک سپر مارکیٹ	اردو بازار، کراچی، فون: ۲۲۱۲۹۹۱
مکتبہ انعامیہ	اردو بازار، کراچی فون: ۲۲۱۶۸۱۴
اسلامی کتب خانہ	نیو ٹاؤن، کراچی، فون ۴۹۲۷۱۵۹
بیت الکتب	گلشن اقبال ۲، مدرسہ اشرف المدارس، کراچی
مکتبہ جامعہ بنوریہ	جامعہ بنوریہ، سائٹ، کراچی
کتاب سرائے	فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۳۲۰۳۱۸
مکتبہ رحمانیہ	غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور
ادارہ اسلامیات	۱۹۰، انار کلی۔ لاہور، فون: ۷۲۲۳۹۹۱، ۷۳۵۳۲۵۵
مکتبہ فیض القرآن	قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی، ۲۲۱۷۷۶۰
مکتبہ القادر	نزد جامعہ خیر العلوم، خیر پور ٹامیوالی۔ بہاولپور

فہرست حیاتِ بقا

فہرست کچھ یادیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام تعریفیں سزاوار ہیں اس حی و قیوم کو جو دوام "بقا" کے ساتھ متصف ہے۔

اور کامل رحمتیں نازل ہوں سید البشر "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عالم خلق کا اوّلین "مظہر" ہیں۔

انتساب

اپنے والد مرحوم کے نام؛

جن کے جوتوں نے کسی قابل بنایا

اور اپنی والدہ مرحومہ کے نام

جنہوں نے خواب میں فرمایا:

"بیٹا جو کچھ تجھے مل رہا ہے، میں ہی تو دلا رہی ہوں"

پیش گفتار

آہ حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی محمد مظہر بقا بھی رحلت فرما گئے، اور ۲۰ اگست ۲۰۰۵ بروز ہفتہ دار فانی سے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دار العلوم دیوبند کے فاضل، عدالت شرح شریف ٹونک کے مفتی، دار العلوم کورنگی کے نائب مفتی، جامعہ کراچی کے شعبے معارف الاسلامیہ کے صدر شعبہ، جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ کے پروفیسر اور عربی اور اردو میں متعدد علمی، تحقیقی اور ادبی کتب کے مصنف، محقق ومولف، پھر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے فیض یافتہ اور صاحب اجازت بزرگ۔ یہ تھے حضرت مولانا مفتی محمد مظہر بقا، جن کے ساتھ کل تک مدظلہ لکھا جاتا تھا، اور آج افسردہ قلم متلاطم جذبات کے ساتھ اس کی جگہ رحمۃ اللہ علیہ لکھ رہا ہے۔

مولانا مفتی محمد مظہر بقا رحمہ اللہ بہت سی کتب کے مولف، محقق اور مصنف تھے۔ لیکن اردو داں قارئین کے حلقے میں ان کی تین کتابیں معروف ہیں۔ جن میں حیات بقا۔ کچھ یادیں اور یادگار سفر شامل ہیں۔

ان میں سے حیات بقا اور کچھ یادیں کچھ عرصے سے دستیاب نہیں تھیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اپنی حیات مستعار کے آخری ایام میں اپنی یہ دونوں کتابیں حیات بقا اور کچھ یادیں اشاعت کی غرض سے راقم کے سپرد کی تھیں۔ اس کے چند ہی ایام کے بعد آپ شدید علیل ہو گئے، اور اسی علالت میں انتقال فرما گئے۔ اب یہ دونوں کتابیں یک جا ایک جلد میں شائع کی جا رہی ہیں۔ افسوس کہ یہ کتاب اس شکل میں مصنف رحمہ اللہ کی حیات میں سامنے نہیں آسکی، مگر کل امر مرھون باوقاتھا، کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔

سید عزیز الرحمٰن

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ عزوجل نے جن حضرات کو کسی امتیازی مقام سے نوازا ہو حالاتِ زندگی انہی کے مرتب کئے جاتے ہیں، یا کم از کم انہی کو زیب دیتے ہیں۔ مجھے اپنی حیثیت معلوم ہے کہ "ہیچم و کمتر از ہیچ"۔ پھر ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا طبیعی امر ہے کہ میں نے اپنے قلم سے اپنے حالات کیوں لکھے!

وجہ یہ ہے کہ:

"بقا" میرے نام کا آخری جزو ہے۔ میرے چاروں بیٹوں نے بھی میری ترغیب کے بغیر، اس لفظ کو اپنے ناموں کا آخری جزو بنایا اس کے بعد پوتوں میں بھی یہی سلسلہ قائم رہا۔

اس مرحلے پر مجھے خیال آیا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آئندہ نسلوں کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ یہ لفظ ان کا خاندانی نام کیسے بنا اور وہ پہلا شخص کون تھا جس کی طرف یہ خاندان منسوب ہوا۔

یہی خیال ہے جس نے مجھے اپنی شخصیت کے تعارف پر آمادہ کیا اور یہی لئے میری میری آئندہ نسلیں ہی اس کتاب کی اصل مخاطب ہیں۔

تاہم کچھ بعید نہیں کہ دوسروں کو بھی اس میں عبرت کا کچھ سامان میسر آجائے کیونکہ میری زندگی اللہ کے فضل اور محض اسی کی توفیق سے اپنی جدوجہد کی ایک مسلسل داستان ہے۔

مظہر بقا

۸/۸/۱۹۹۴ء

"ہمارے مولانا" کی یادوں کا نگارخانہ

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

"حیات بقا" پر نام کی جگہ دعوے کا گمان ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہمارے مولانا نے کتاب کے نام کے ساتھ اپنے نام کا پیوند لگا دیا ہے اور یہ حیات کو بقا دینے کی ایک صورت ہے۔ خدا کرے کہ وہ اپنے اخلاف کے سینوں میں بھی دھڑکتے رہیں اور کتاب کے اوراق میں بھی زندہ رہیں ...... اور اس دعا سے پہلے یہ دعا لب پر آتی ہے کہ وہ عرصہ تک ہمارے درمیان موجود رہیں ...... مولانا کے نام اور کتاب کے نام میں ایک لفظی رعایت موجود ہے اور رعایتِ لفظی تو اس نسل کی زندگی کا حصہ رہی ہے، جس سے ہمارے مولانا کا تعلق ہے۔ یہ کتاب ان کا نقشِ حیات ہے، مگر دل چاہتا ہے کہ میں نے انہیں جیسا پایا ہے اور ان کو جس طرح دیکھا ہے اس کی دو چار جھلکیاں آپ کو بھی دکھا دوں۔ ویسے کتاب کے سات ابواب میں انہوں نے دیانت اور سلیقے کے ساتھ اپنے خاندانی پس منظر کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم، دیگر مشاغل اور کارشوق (ہابی) کھیل کود اور شکاریات کو بھی پیش کیا ہے۔ کچھ کا ذکر راقم الحروف بھی آنے والی سطروں میں کرے گا۔ ہمارے مولانا نے اپنی علمی و عملی زندگی کی تفصیل سے بھی قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ ان کے عقائد و افکار بھی آپ کو اس کتاب میں ملیں گے اور اپنے بزرگوں کی روایت کو نبھاتے ہوئے اپنا وصیت نامہ بھی شامل کتاب کر دیا ہے۔

میں بات صاحب کتاب کے ذکر سے شروع کرنا چاہتا تھا، مگر آغاز تذکرہ کتاب سے ہوا ہے۔ اس سے انسان کی مجبوری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا قلم بھی ہمارے قابو میں کب ہوتا ہے۔ ہمارے مولانا علماء کے اس گروہ کے فرد ہیں جس نے ہمیں اپنے عظیم ماضی سے ہم رشتہ اور پیوستہ رکھا ہے۔ جو مولوی زور زور سے ڈکار نہ لیتا ہو،

کھانا کھا کر توند پر ہاتھ نہ پھیرتا ہو، بات بات پر انسانوں کو لاحول کا ہدف نہ بناتا ہو اور تکفیر کے سکے نہ ڈھالتا ہو کمال کی چیز ہوتا ہے، چاہے اس کا نام مفتی محمد شفیع ہو یا ابوالحسن علی ندوی، محمد عبدالرشید نعمانی ہو یا محمد مظہر بقا۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ اسلام ان کی شخصیتوں میں اسی طرح شامل ہے۔

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

یہ لوگ دبستان مودت و محبت کے نمائندے اور آداب حیات کے نمونے ہوتے ہیں اور یقین جانیے کہ سینوں پر ہریں لیتی ریش مبارک کے باوجود ہنسنا ہنسانا بھی جانتے ہیں۔ یہ قہقہے تو نہیں لگاتے لیکن ان کی تربیت یافتہ ہنسی اور گوشہائے لب سے آگے نہ بڑھنے والا تبسم زندگی کے خاصے متلاطم دریا میں ایسی کشتی کی طرح ہوتا ہے جو ساحل تک پہنچنے کی نوید ہو۔ اور گوشہائے چشم میں نمی اور آنکھوں میں شب بیداری کی علامات ان کے رب سے ان کے رشتے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مولانا مفتی ڈاکٹر محمد مظہر بقا ہماری زندگی میں کس طرح آئے، یہ یاد نہیں۔ ذرا آپ بھی یہ یاد کرنے کی کوشش کیجیے کہ آپ کے بہترین دوستوں سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کوشش میں آپ کو پوری طرح کامیابی نہیں ہوگی۔ اس کوشش کو ترک کرتا ہوں۔ آئیے اب ذرا آئینہ۔ ایام میں اپنے مولانا کی کچھ ادائیں دیکھیں۔

ایک رات "جامعہ نگر" (اسٹاف ٹاؤن، کراچی یونی ورسٹی) میں ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل آراستہ ہونے جا رہی تھی۔ ابھی محفل شروع نہیں ہوئی تھی کہ کسی مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ مولانا نے کوئی نامعقول بات کہی اور جواباً میں نے نامعقول تر بات کا سہارا لیا۔ کچھ دیر کے بعد جلسہ۔ سیرت شروع ہوا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئے اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حلاوت نے اس تلخی کو بھلا دیا۔ جلسہ کے بعد کوئی دو ڈھائی بجے میں ملاقاتی کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا، اوپر خواب گاہ تک جانے کی زحمت نہ کی۔ صوفا کھڑکی کے پاس بچھا تھا اور گرمی کی وجہ سے میں نے کھڑکی

کھول رکھی تھی۔ لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی تھی کہ کھڑکی کی چٹخنی کھلنے کی آواز سے میں جاگ پڑا۔ دیکھا تو اپنے مولانا تھے۔ کہنے لگے "میں نے جتنی سخت بات کہی تھی اس کی وجہ سے سو نہ سکا۔ اگرچہ ہمارے تعلقات رسمی معذرت سے بالاتر ہیں، لیکن مجھے اپنے ضمیر کی خلش کو دور کرنے کے لئے معذرت کے واسطے آنا پڑا۔" میں ہنس پڑا اور پھر بناوٹی خفگی سے کہا "معذرت تو اب کیجیے اس طرح سوتے سے جگانے کے لئے۔"

ایک بار جامعہ کراچی کے شعبہ ء معارف اسلامیہ کے تین اساتذہ کے درمیان کچھ ایسے "نشیبی فرازی معاملات" پیدا ہوئے کہ سارے اساتذہ کو وائس چانسلر کے حضور حاضر ہونا پڑا۔ وائس چانسلر صاحب نے اخلاقیات پر کلام شروع کیا۔ نہ جانے کیسے ہمارے مولانا شروع ہو گئے۔ یہ صورتِ حال ان کے لئے ناقابلِ تصور تھی۔ شدتِ جذبات سے پلکوں پر ستارے لرزنے لگے۔ "یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے کہ آج اساتذہ ء علوم اسلامیہ، اخلاق کا درس لے رہے ہیں۔ اخلاق کے نکات بیان کرنا تو ہمارا منصب ہے، مگر عمل سے محرومی ایسے ہی تماشے دکھاتی ہے۔ جہل، محض نہ جاننے کو نہیں کہتے۔ جانے بوجھے حقائق اور فرموداتِ نبویؐ پر عمل سے گریز بھی جہل ہے۔ اب تو ہم اس میں مبتلا ہیں۔ آپ کے ارشادات سننے کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔ معاملہ اخلاقی ضوابط سے آگہی کا نہیں، انہیں اپنی ذات اور شخصیت کا حصہ بنانے کا ہے۔" ایک سناٹا چھا گیا، "حریفانِ بادہ پیما" پر سکوت مسلط ہو گیا اور پھر عالم سکوت و حیرت میں لوگ رخصت ہو گئے۔

ایک بار ہمارے مولانا کو تجرید بخاری کے سلسلہ درس میں وہ حدیث شریف پڑھانی تھی جس میں معلم اعظم نوع بشر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے قطع تعلق رکھے۔ ہمارے مولانا کی بات چیت اپنے ایک ساتھی سے بند تھی۔ جس دن مولانا کو یہ حدیث پڑھانی تھی۔ وہ علی الصباح اپنے رفیق کے گھر پہنچے اور ان سے کہا کہ "بھئی! آج مجھے یہ حدیث پڑھانی ہے۔ طبیعت نے یہ بات گوارا نہ کی کہ اس حدیث کا دوسروں کو

درس دوں جس پر میرا عمل نہ ہو۔ آپ کی خدمت میں غیر مشروط معذرت پیش کرتا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ نہ جانے اس لمحے ہمارے مولانا کے چہرے پر تعلیماتِ نبویؐ کے کون سے نقوش روشن تھے اور نسبتِ مصطفویؐ کے کون سے چراغ فروزاں تھے کہ ان کے ساتھی نے سروقد کھڑے ہو کر ان کا اکرام کیا اور وہ تلخی ختم ہو گئی۔

نسبتِ مصطفوی کی بات آ گئی ہے تو ان کی خوش نصیبی اور فیروز بختی کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ انھوں نے متعدد بار حضرت نبی۔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت فرمائی ہے اور اس کتاب میں انھوں نے اپنے خوابوں کی ان دیکھی دنیاؤں کو آپ کے لئے مناظر دیدہ بنا دیا ہے۔ نبی۔ کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے کتنی بار ان کی آنکھوں سے گردِ ایام اور آشوبِ زمانہ کو اپنے جلوہ۔ دوام سے دور کر دیا ہے۔ جب اس حاضر باشِ بزم نبوت کے خوابوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو جمیل نقوی صاحب کا شعر یاد آتا ہے؛

میں بھی من جملہ۔ اربابِ حضوری ہوں جمیل
میری خاصان محمدؐ سے شناسائی ہے

خاصان سرکارؐ سے یہ شناسائی میرا بھی سرمایہ۔ حیات ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مولانا محمد مظہر بقا کی ذات کتنی جہات رکھتی ہے اس کا کچھ اندازہ "حیاتِ بقا" سے آپ کو ہو جائے گا۔ دار و رسن سے آگے جو مرتبہ بلند ہے اور جس کی مدعیوں کو خبر بھی نہیں وہ مولانا کو یوں ہی نہیں مل گیا۔ فوج کی نوکری، کیمیاگری کا شوق، افسانے کی دنیا.......... ان سب سے گزر کر وہ یہاں تک آئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی بھارت پاکستان جنگ کے موقع پر جامعہ۔ کراچی کے اساتذہ نے بھی مختصر مدت کی فوجی تربیت لی۔ نشانہ بازی کی مشق ہو رہی تھی۔ تربیت دینے والے افسر کی نو گولیاں ہدف پر لگیں۔ ہمارے مولانا نے دسوں گولیوں کو وصل ہدف سے سرشاری بخشی۔ یہ ریش مبارک اور یہ نشانہ۔ شاید اس افسر نے اس دن کے بعد سے ظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھنا سیکھ لیا ہو۔

میٹھے کا وہ شوق کہ ایسے مرحلے بھی آئے جب اچھی سے اچھی مٹھائی بھی پھیکی معلوم ہوئی اور شکر خالص سے کم کسی چیز سے تسکین نہ ہوئی۔ سوچتا ہوں کہ شکر اور

میٹھے کا شمار منشیات میں کیا جائے یا نہیں ۔ شیریں اور شیرینی خوری کی تفصیلات تو "حیات بقا" میں آپ پڑھ ہی لیں گے، ایک واقعہ یاد آگیا، آپ بھی سن لیجئے۔ میٹھے کا مجھے بھی بے حد شوق ہے، خاصا شوق اور اسی لئے تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے دو چار دانتوں کی قربانی دے چکا تھا۔ میرے پھوپھی زاد بھائی طلحہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ میٹھا کھانے سے زندگی اور بندگی کے آداب آجاتے ہیں ۔ ایک دن مولانا بقا مجھے مکہ مکرمہ سے جدہ طلحہ کے گھر پہنچانے آئے۔ طلحہ نے کھیر اور حلوہ تیار کیا تھا۔ میٹھا پکانا ان کے تفریحی مشاغل میں سرفہرست ہے۔ دونوں چیزیں خوب میٹھی تھیں ۔ مولانا ایک چمچہ کھیر کھاتے اور ایک چمچہ حلوہ ۔ اور یہی کہتے کہ آخر کیا چیز کھاؤں، کس کے حق میں فیصلہ دوں ۔ میں نے عرض کیا کہ کھیر کھالیجئے، حلوہ ساتھ لیتے جایئے۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور اس فتوے کی دل کھول کر تعریف کی۔

ایک بار مکہ شریف میں مولانا کے در دولت پر کھانے کے بعد سفید رنگ کی ایک مٹھائی آئی ۔ بے حد لطیف، خوش شکل اور خوش ذائقہ، مگر بقا صاحب نے برجستہ لاحول پڑھا اور بولے: "یہ کوئی مٹھائی ہے۔ کہیں مٹھائی اتنی کم میٹھی ہوتی ہے۔" مولانا ایک ایرانی کا لطیفہ مزے لے لے کر سناتے ہیں، جو ہر مٹھائی کھانے کے بعد یہی کہتا ہے کہ خوب ہے مگر کاش کچھ اور میٹھی ہوتی ۔ ایک بار اس سے کہا گیا کہ بندہ خدا! پانچ سیر شکر میں صرف آدھ پاؤ سوجی ہے تو بولا کہ آدھ پاؤ غیر شکر ہے تو۔ مٹھائی کا تذکرہ کچھ طویل ہو گیا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ اور ہم اب صید شکر میں یعنی ذیابیطس میں مبتلا ہیں۔

میرے رب نے مولانا مظہر بقا کو کتنے پہلوؤں سے اور کس کس طرح نوازا ہے استاد وہ ملے جو اپنے اپنے شعبہ میں سند سمجھے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس عہد کے برگزیدہ اور متقی لوگوں میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے۔ بقا صاحب اپنے استادوں کے احترام کے باب میں ہمارے عظیم علی ماضی کا ایک کردار معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر استاد کے احترام کو مسلک حیات بنانے والے بقا صاحب سچ کو اپنے استاد سے کم عزیز نہیں جانتے ۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک استاد سے کہہ دیا کہ "حضرت! خدا شاہد ہے کہ میں نے بارہا نمازوں کے بعد دعا کی ہے کہ وہ آپ کے علم اور عمل کے درمیان مثالی

نسبت پیدا فرما دے "...... جملہ ہے یا انصاف کی تلوار کی دھار۔

ہمارے مولانا برسہا برس سے ام القریٰ میں مکین ہیں۔ام القریٰ جو بلدامین بھی ہے، وہاں مولانا اپنے علم کی امانت کو مسلسل کاغذ پر منتقل کر رہے ہیں اور مدینہ منورہ کی زیارت کے تسلسل میں بھی فرق نہیں آنے پاتا۔ہم جب بچپن میں "مکہ مدینہ سنتے تھے تو بقول علی میاں مدظلہ یہی سمجھتے تھے کہ یہ ایک شہر ہے۔ بڑے ہو کر ہم اس وحدت کے تصور سے محروم ہو گئے، مگر مظہر بقا صاحب کے لئے یہ دونوں شہر ایک ہی ہیں۔عطائے مسلسل ہے کہ ان کے لئے جاری ہے۔ کبھی حرم کعبہ میں حجر اسود اور رکن یمنی کے درمیان نشست عطا بن جاتی ہے، کبھی مواجہ شریف میں مراقبہ کے عالم میں یا بیداری میں بارش عطا میں بھیگتے رہتے ہیں۔عطا اور نوازشوں کی تھیلی دونوں طرف سے کھلی ہوئی ہے اور اس نفق نور کی کیا تھاہ کہ اس کی گنجائش ختم ہی نہیں ہوتی۔

"حیات بقا" اور "کچھ یادیں" ...... دو جلدیں ہی، مگر زندگی تو ایک ہی آدمی کی ہے۔اگلی کتاب میں وہ اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کی یادوں کے چراغ روشن کریں گے۔مولانا کی خود نوشت کی دونوں جلدوں میں ان کے اسلاف ہیں۔ان کے اسلوب نے سب کے ساتھ انصاف کیا ہے۔اس کتاب کے کئی کردار فرد سے آگے بڑھ کر مختلف اسالیبِ حیات کے نمائندے بن گئے ہیں۔یہ وہ لوگ تھے جو عشق و زہد، خوش طبعی اور گدازِ شب کو اپنی ذات میں جمع کرنا جانتے تھے۔

مولانا مظہر بقا بھی ایک "عجوبہ" ہیں کہ مولوی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی اور زندہ نثر لکھتے ہیں۔یہ زندگی اور تخلیق جو آج مولویوں میں ناپید ہے، کبھی انہیں کے ذہن اور قلم سے ہماری زبان کو نصیب ہوئی تھی۔مولانا مظہر بقا انہیں اسلاف کی یادگار ہیں۔

یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب نوجوانوں کو ہمارے ماضی سے باخبر کرے گی اور میری عمر کے پڑھنے والوں کو بہت سی کہانیاں یاد آجائیں گی۔

باب اول

خاندان

محمد مظہر بقا

نام ونسب:

نام: اصل نام ''محمد مظہر'' اضافہ کے ساتھ ''محمد مظہر بقا'' مزید ترمیم اور اضافت کے ساتھ ''بقاء اللہ''۔

والد صاحب مرحوم نے ''محمد مظہر'' نام رکھا۔ ان کے دوست احمد مرتضیٰ صاحب نظر وکیل نے ''بقا'' کا اضافہ کر کے اسے تاریخی نام بنا دیا۔ اتنا طویل نام کون لیتا۔ زبانوں پر صرف ''بقا'' آنے لگا تو اس کی اضافت ''اللہ'' کی طرف کر دی گئی۔ اس طرح ''بقاء اللہ'' ہو گیا۔ گویا ابتدا ''محمد'' سے ہوئی اور انتہا ''اللہ'' پر۔ کیسا خوشگوار اتفاق ہے۔ محمد ہی نے تو اللہ تک پہنچایا ہے۔ علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات۔ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں: خدائے تعالیٰ را ازان دوست می دارم کہ رب محمد است۔ (میں اللہ کو اس لئے دوست رکھتا ہوں کہ محمد کا پروردگار ہے)

''مظہر بقا'' کو اگر اضافت کے ساتھ پڑھیں تو اس میں معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور جب محمد کے بارے میں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ الٰہی ارشاد پیش نظر ہو کہ اذا دعـــاکم لـمـا یحییکم (جب وہ تمہیں اس طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشے) تو میرے ذہن میں ایک لطیف سا خوشگوار احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

اسم کے تقلبات اور تقلبات کے نتیجہ میں اس کی انفرادیت گویا قدرتی اشارہ تھا مسمی کی منقلب فطرت اور منفرد قسمت (خاندان میں) کی طرف اور پوری زندگی شاہد ہے کہ ہوا بھی یہی۔

''محمد مظہر بقا'' کے اعداد (۱۳۴۰) ہیں اور یہی میرا سن پیدائش ہے، والد صاحب

مرحوم نے زبانی بھی بتایا تھا اور ان کی ڈائری میں بھی درج تھا کہ ۲۲ شعبان ۱۳۴۰ھ (۲۱ اپریل ۱۹۲۲ء) بروز جمعہ بارہ اور ایک بجے دن کے درمیان، نماز جمعہ سے قبل میری ولادت ہوئی۔ گویا بقا کو اس دار فنا میں آنے کے لئے مبارک دن بھی ملا اور مبارک ساعت بھی۔

ہندوستان کے صوبہ مالوہ (مدھیہ پردیش) میں بھوپال سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر "سرونج" نامی ایک قصبہ ہے جو اس وقت ریاست ٹونک کا ایک پرگنہ تھا۔ یہی قصبہ میرا مولد ہے اور مجھلے حافظ جی کے مکان کا کوئی کمرہ میرا مسقط الراس۔

نسب: میرے تایازاد بھائیوں محمد ناصر، محمد طاہر اور محمد طفیل نے جب اپنے ناموں کے ساتھ "انصاری" کی نسبت کا اضافہ کیا تو میں نے والد صاحب مرحوم سے دریافت کیا کہ آپ حضرات اصل میں یوپی کے باشندے ہیں اور یوپی میں "انصاری" جولاہوں کے لئے استعمال ہوتا ہے تو کیا ہم لوگ جولاہے ہیں؟ والد صاحب مرحوم نے فرمایا: ہم صحیح طور پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں اور ہمارا شجرہ نسب موضع ملکانہ، ڈاکخانہ مصطفیٰ آباد، ضلع رائے بریلی میں ہمارے بزرگوں کے پاس محفوظ ہے۔

میرے تایا زاد بھائی محمد طفیل صاحب مرحوم کی روایت کے مطابق ہماری دادی رائے بریلی کے محلہ "تکیہ" کے سادات میں سے تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ ناممکن تھا کہ کسی جولاہے کی شادی سید احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان میں ہوتی۔

داداصاحب مرحوم

مد صاحب مرحوم اور میرے تایازاد بھائی محمد طفیل صاحب مرحوم کی زبانی معلوم ہوا کہ میرے دادا باقر علی صاحب مرحوم ملکانہ کے ذی حیثیت اور صاحب جائیداد لوگوں میں سے تھے۔ کسی مقدمہ کی وجہ سے عزت بچانے کی خاطر ملکانہ کو خیرباد کہہ کر روپوش ہوگئے۔ تایا مرحوم جب سیلپور میں گرداور تھے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد بھوپال میں ہیں۔ وہ بھوپال پہنچے اور سیلپور لے آئے، جو قصبہ سرونج (ریاست ٹونک) سے تقریباً آٹھ میل دور نظامت سرونج کی ایک تحصیل تھی۔

داداصاحب مرحوم کی چار اولادیں تھیں: واحد علی، ثامن علی، حامد علی اور (غالباً) فجر النساء جنہیں میرے تایا اور والد "فجا" کہتے تھے۔ میں نے اپنے چچا حامد علی صاحب مرحوم کو نہیں دیکھا، میری پیدائش سے قبل ان کا انتقال ہو چکا تھا، باقی تینوں بھائی بہن بیضوی چہروں، متناسب ناک نقشوں، سرخ و سفید رنگوں اور معتدل قامتوں کے خاصے وجیہ لوگ تھے۔ میں نے ان کا صرف بڑھاپا دیکھا ہے۔

میں نے بچپن میں، سیلپور میں چند قبروں کے درمیان اپنے دادا مرحوم کی نمایاں پختہ قبر دیکھی ہے جس پر ایک بوسیدہ سی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں جب میں سرونج گیا تو معلوم ہوا کہ میرے بھتیجے محمد علی انصاری نے اس مزار کو خوبصورت بنوا دیا ہے اور اب وہ ایک زیارت گاہ بن گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے معمور فرمائے اور انہیں اپنی رحمت اور مغفرت سے نواز کر جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

تایا صاحب مرحوم

یں نے جب ہوش سنبھالا اس وقت میرے تایا مرحوم سرونج میں گرداور قانون گو تھے۔ اردو فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ صاحب دیوان شاعر تھے، زار تخلص تھا اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ خاندان کے چھوٹوں میں سے تنہا میں ہی تھا جسے وہ منہ لگاتے تھے۔ شاید اس لئے کہ سب سے زیادہ کتابیں میں نے ہی چاٹ رکھی تھیں نیاز فتح پوری کے نگار کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے۔ بیماری کی حالت میں ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: مظہر میاں! تمنا یہ ہے کہ نگار کا اس ماہ کا شمارہ اور پڑھ لوں، پھر چاہے مر جاؤں۔ نیاز فتح پوری ان دنوں ڈگر سے ہٹ چکے تھے۔

تایا مرحوم کا دیوان میرے پاس ہے، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو کسی وقت وہ شائع بھی ہو جائے گا۔

تایا مرحوم غصہ کے بہت تیز تھے اور یہی کیفیت میرے والد صاحب کی تھی۔ ان کی اولاد نے بھی یہ غصہ وراثت میں پایا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی مغفرت سے نوازے۔ آمین۔

والد صاحب مرحوم

میرے والد ۔ رحمتہ اللہ علیہ ۔ کا نام "ثامن علی" تھا ۔ پیدائش کی ترتیب میں ثانی تھے اور نام تھا "ثامن" ۔ نہ معلوم دادا صاحب مرحوم کے ذہن میں کیا مناسبت تھی ۔ بہرحال "الأسماء تنزل من السماء" (نام آسمان سے نازل ہوتے ہیں)

موضع ملکانہ، ڈاکخانہ مصطفےٰ آباد، ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے، میرے تایا "واحد علی" صاحب مرحوم کے بلانے پر بھوپال آئے اور بندوبست میں ملازم ہو گئے ۔ میں جس زمانہ میں پیدا ہوا، ان دونوں وہ سرونج میں عرائض نویس تھے، پھر بعض ان جاگیرداروں کے کامدار ہو گئے جو ٹونک میں مقیم تھے ۔

والد صاحب مرحوم ایک وضعدار انسان تھے ۔ شرعی پاجامہ، کوٹ یا شیروانی اور عمامہ ان کا لباس تھا ۔ چائے صرف ایک وقت پیتے تھے ۔ فجر کی نماز کے بعد اپنے دوست منشی عبدالشکور صاحب پٹواری کے ساتھ مقصود کی دوکان پر جا کر چائے پینا ان کا روز کا معمول تھا ۔ گھر پر چائے اس لئے نہ بنواتے تھے کہ سب لوگ عادی نہ ہو جائیں ۔ اس زمانہ میں سرونج میں چائے نوشی بری نہیں تو اچھی بھی نہ سمجھی جاتی تھی ۔

چونکہ ان کا جوانی تک کا زمانہ پورب میں گذرا تھا ۔ اس لئے ارہر کی دال اور چاول ان کی مرغوب غذا تھی (اور ہم بھائی بہنوں کے لئے اتنی ہی نامرغوب) ۔

آموں کے بڑے شوقین تھے ۔ جب بھی آم کھاتے اپنے وطن کے موروثی باغ اور اس کے قلمی آموں کو یاد کرتے ۔ کیونکہ سرونج میں قلمی آم ہوتے نہ تھے ۔

برسات کی بہاروں میں بکثرت ایسا ہوتا کہ جب بھی جھڑیاں جلترنگ بجاتیں، کوئلیں کانوں میں رس گھولتیں اور پپیہے شور مچاتے تو کھپریل والی کچی کوٹھری کے دروازے پر پلنگ ڈلواتے اور بیرونی منظر میں کھو جاتے ۔ دھیمی آواز میں گنگناتے بھی

جاتے، اس احتیاط سے کہ ہم لوگ نہ سن سکیں (ان کی دانست میں)۔

میرے والد نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں جن سے ۲۹ بچے ہوئے۔ لیکن زندہ صرف ۶ رہے۔ پہلی دو بیویوں سے دو لڑکے تھے: شیر علی بھائی مرحوم اور نواب حسن بھائی مرحوم، تیسری بیوی سے چار بچے تھے: سائرہ خاتون، جن کی شادی احمد علی صاحب مرحوم سے ہوئی، رحمتہ النساء جس کی شادی عبداللطیف صاحب مرحوم سے ہوئی اور حسینہ خاتون جس کی شادی مولوی زبیر احمد سے ہوئی۔ الحمد للہ یہ تینوں بہنیں بقید حیات ہیں۔ سائرہ خاتون مجھ سے اتنی بڑی ہیں کہ انہوں نے مجھے گود میں کھلایا ہے۔

سنا ہے جوانی میں والد صاحب مرحوم کافی طاقتور تھے۔ میں نے اپنے والد کی جوانی نہیں دیکھی لیکن کھنڈرات سے محل کی شان و شوکت کا اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں۔

پورے خاندان کی طرح میرے والد بھی غصے کے بہت تیز تھے۔ رمضان المبارک کی شاموں میں ان کا غصہ عروج پر ہوتا تھا، سب سہمے رہتے تھے۔

میں چونکہ بے انتہا شریر اور پڑھنے کا چور تھا۔ اس لئے سب بھائیوں سے زیادہ اپنے والد کے غصہ کا شکار رہا۔ تاہم وہ غصہ میں جرم و سزا کے تناسب کا لحاظ نہ رکھتے تھے۔ مارنے پر آتے تو بہت مارتے اور بڑی شدت سے مارتے، اس کا لحاظ بھی نہ رکھتے کہ دس گیارہ سال کے بچے کے لئے یہ مار قابل برداشت بھی ہے یا نہیں۔ اور مارتے وقت ہمیشہ یہ فرماتے "پڑھ جا یا مر جا!"۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ بھی پایا اپنے والد مرحوم کے جوتوں کے طفیل ہی پایا۔ ورنہ میں بھی اپنے دو بڑے بھائیوں کی طرح ساری عمر پٹواری رہ کر دنیا سے رخصت ہو جاتا۔

والد صاحب نے فرمایا: انسان کی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔ ایک دور میں

وہ انسان ہوتا ہے۔ دوسرے میں گدھا تیسرے میں کتا اور چوتھے میں الّو۔ شادی سے پہلے تک انسان انسان رہتا ہے۔ شادی کے بعد سے گدھے کا دور شروع ہو جاتا ہے کہ اپنا ہوش نہیں رہتا اور بیوی بچوں کا بار اٹھانا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اولاد جوان اور برسرکار اور خود بوڑھا اور بے روزگار ہو جائے، لیکن ہاتھ پیر چلتے ہوں تو کتے کا دور شروع ہو جاتا ہے کہ بازار سے سودا سلف لا دیا، بچوں کو کھلالیا۔ بیٹا، بہو تفریح کو گئے تو گھر کی حفاظت کر لی۔ اور اس خدمت کے عوض اسے روٹی کا ٹکڑا مل جاتا ہے۔ جب کھٹیا سے لگ جائے اور اپنے سہارے اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہو جائے تو وہ الو کا دور ہوتا ہے کہ اس کا سایہ بھی منحوس شمار کیا جاتا ہے۔ اعزہ دعا کرنے لگتے ہیں: اے اللہ اب تو ان کی مٹی ٹھکانے لگا دے۔

والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ ایک بیٹا چلچلاتی دھوپ میں کھڑا مزدوروں کو کو بیلو دیتا جا رہا تھا جو چھپر سار رہے تھے۔ باپ نے کہا بیٹا ذرا سائے میں آجاؤ۔ بیٹے نے جواب دیا ابھی آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد باپ نے پھر سائے میں آنے کے لئے کہا۔ بیٹا تنگ کر بولا: ابا کہا تو کہ ابھی آتا ہوں۔ تیسری بار باپ نے پھر اپنی بات دہرائی، بیٹے فرمانے لگے کہ ابا آپ کو یہ پڑی ہے اور مجھے فکر ہے کہ مزدور اوپر چڑھے ہیں کام جلد نپٹ جائے۔ باپ خاموشی سے اٹھا اور اپنے شیر خوار پوتے کو لا کر اس کے پیر تپتی زمین پر ٹکائے۔ بچہ تڑپ اٹھا۔ بیٹے نے پلٹ کر دیکھا لیکن خاموش رہا۔ باپ نے دوبارہ وہی عمل دہرایا۔ بیٹے سے برداشت نہ ہوا، بولا: ابا آپ کو ننھی سی جان پر ترس نہیں آتا۔ باپ نے جواب دیا کہ بیٹے! جو درد تمہارے دل میں اپنے بیٹے کے لئے ہو رہا ہے وہی درد میرے دل میں تمہارے لئے ہو رہا ہے۔ بیٹا یہ سن کر خاموشی سے سائے میں آگیا۔

والد صاحب نے مجھے ایک عمل بتایا تھا۔ کہ نماز کے بعد دس مرتبہ "یارزاق" پڑھ لیا کرو۔ فرمایا کہ یہ میرا معمول ہے۔ چنانچہ میں نے بھی ان کے بتانے کے فوراً بعد سے اسے اپنا معمول بنا لیا اور اللہ نے میرے رزق میں اتنی برکت دی ہے جو میرے

تصور میں بھی نہ تھی۔

والد صاحب مرحوم نے حسب ذیل دو نسخے بھی بتائے تھے:

۱۔۔۔ گائے، بیل، بھینس کا گوبر جو جنگل میں کیا گیا ہو اور وہیں سوکھ گیا ہو اسے جلا کر راکھ کر لیا جائے اور اسے گنجے کے سر پر رات کو اس طرح چپکا کر، جیسے توے پر روٹی ہوتی ہے باندھ دیا جائے۔ صبح پھینک دیا جائے۔ تین روز اس طرح کرنے سے گنج بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ (یعنی وہ پھڑیاں جو سر میں ہو جاتی ہیں)۔

۲۔۔۔ چھ ماشہ رومی مصطگی چاول کے لقمے میں رکھ کر زیادہ سے زیادہ اکیس روز کھانے سے بادی بواسیر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔

والد صاحب مرحوم آخر عمر میں انڈیا سے میرے پاس کراچی تشریف لے آئے تھے۔ ان دنوں لالو کھیت میں سرکنڈوں کی دیواروں اور سرکنڈوں ہی کی چھت کی جس جھونپڑی میں ہم رہا کرتے تھے، والد صاحب اسے "ہوا محل" سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں والد صاحب تقریباً بیاسی سال کی عمر میں اسی ہوا محل سے جنت الفردوس سدھارے اور لالو کھیت کے شہر خموشاں میں جا لیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے معمور فرمائے۔ آمین۔

میں نے اپنے والد کو بہت کم خواب میں دیکھا ہے۔ جب میں کراچی یونیورسٹی میں ملازم تھا تو ایک مرتبہ مولوی امتیاز احمد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ اللہ نے آپ کو صاحب حیثیت کیا ہے، بکرے کے بجائے گائے کی قربانی کیا کریں اور اس میں اپنے والدین کے حصے بھی رکھیں۔ بقر عید آئی تو میں نے یہی کیا۔ اسی رات خواب دیکھا کہ بڑا سا باورچی خانہ ہے۔ میری بیوی روٹی پکا رہی ہیں اور والد صاحب ذرا فاصلہ پر شیروانی اور عمامہ کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ اس سال کے بعد سے الحمد للہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنے والدین کی طرف سے قربانی نہ کی ہو اور جب سے سعودیہ میں ملازم ہوا، ان قربانیوں کے علاوہ جو حج میں کرتا ہوں، ہر سال کا یہ معمول ہے کہ تین

بھینسے اور ایک بکرے کی قربانی کے لئے انڈیا (سرونج) پیسے بھیجتا ہوں، بکرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے کیا جاتا ہے اور بھینسے مختلف زندہ اور فوت شدہ اعزہ کی طرف سے، اور کبھی کبھی بعض صحابہ، اساتذہ اور مشائخ کی طرف سے بھی۔

اب جبکہ ۱۹۹۴ء میں مجھے مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے سولہ سال گذر چکے ہیں، میں نے اللہ کے فضل سے بے شمار طواف کئے ہیں، لیکن آج تک کوئی نفل طواف اپنی طرف سے نہیں کیا، ہمیشہ اپنے والدین کی طرف سے کیا ہے۔ اور حج، جس کی توفیق اللہ تعالیٰ ہر سال دیتا ہے، کبھی والد کی طرف سے کرتا ہوں کبھی والدہ کی طرف سے۔

میں نے اللہ تعالیٰ سے مستقلاً یہ دعا بھی کر رکھی ہے کہ میری ہر نفل عبادت کا ثواب میرے والدین کو ملتا جائے، خواہ وہ تلاوت قرآن کریم ہو یا نماز، روزہ، صدقہ وخیرات یا کوئی اور عبادت۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمانے والا ہے۔

چچا صاحب مرحوم

میرے والد صاحب مرحوم نے بتایا کہ حامد علی چچا مرحوم نے جائیداد کی لالچ میں ایک بڑے جاگیردار کی بہن سے شادی کر لی تھی۔اور جب بھائی سے بہن کا حصہ طلب کیا تو مقدمہ بازی کی نوبت آگئی میرے تایا اور والد وطن چھوڑ چکے تھے۔ملکانہ کی پوری موروثی جائیداد پر چچا کا قبضہ تھا، انہوں نے جائیداد بیچ کر سارا پیسہ مقدمہ بازی میں برباد کر دیا۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ حامد علی کے ہاتھوں بیشتر جائیداد کے ٹھکانے لگ جانے کے بہت بعد گھر کے فرش، دیگیں اور لگن ایسے اور اتنے بڑے کہ بارات کا انتظام کیا جاسکے، میں نے اپنے ہاتھوں سے فروخت کئے ہیں۔

پھوپھی مرحومہ کی شادی حکیم یار محمد صاحب مرحوم سے ہوئی تھی، وہ کوروائی میں رہتی تھیں۔جہاں میرے پھوپھا سرکاری طبیب تھے۔

والدہ صاحبہ مرحومہ

میری والدہ نعیمہ خاتون سرونج کی تحصیل سیلپور کی رہنے والی تھیں ۔ کس ماں کو اپنی اولاد سے محبت نہیں ہوتی ، وہ بھی بیٹا جسے کھرا سکہ کہا جاتا ہے اور بیٹا بھی اکلوتا ہو تو اس پر ماں کی جان نثاری کا جو عالم ہوتا ہے ، محتاج بیان نہیں ۔

تین بہنوں کے درمیان میں اپنی والدہ کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ فطری محبت کے ساتھ ساتھ وہ والد صاحب مرحوم کی مار کی تلافی بھی اپنے لاڈ پیار سے کیا کرتی تھیں ۔ اماں کی افراط محبت نے میرا دماغ خراب کر رکھا تھا ۔ جوار کی فصل پر سب لوگ جوار کھاتے اور میرے لئے گیہوں کی روٹی پکتی ۔ چاول پکتے تو سب لوگ دال سے کھاتے اور میرے لئے دودھ اور شکر کا اہتمام کیا جاتا کیونکہ دال سے مجھے نفرت تھی اور اگر دال پک جاتی تو میرے سامنے لانے سے پہلے اماں مرحومہ بڑی خوشامدانہ تمہید باندھتیں ۔ اکثر کہتیں "دال بڑا مال اماں پھر پکانا دال " پھر بگھار کے علاوہ اوپر سے بھی اس میں گھی ڈالا جاتا ۔

جن دنوں میری والدہ کا انتقال ہوا میں حیدر آباد (دکن) میں تھا ۔ ان کے بائیں گال میں آکلہ ہو گیا تھا ۔ اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا ۔ بہنوں نے بتایا کہ مرض الموت میں وہ مجھے بہت یاد کرتی تھیں ۔

غالباً ۱۹۶۲ء تھا جب میں کراچی سے سرونج گیا ۔ دوپہر کے وقت ریاض المدارس کے ایک کمرہ میں سو رہا تھا کہ میں نے والدہ کو خواب میں دیکھا ۔ دیکھا کہ صحن میں کھڑی ہیں ۔ میں اپنی ممانی بہن سے کہتا ہوں : وہ اماں کھڑی ہیں ۔ بہن کہتی ہے : مجھے تو نظر نہیں آرہیں ۔ میں اماں کے پاس پہنچتا ہوں تو وہاں سے غائب ہو کر اس جگہ نظر آتی ہیں جہاں پانی کے برتن رکھے جاتے تھے ۔ میں دبے قدموں جاتا ہوں کہ کہیں پھر نہ غائب ہو جائیں اور والدہ کو دونوں بازوؤں میں تھام لیتا ہوں ۔ فوراً کہتی ہیں : اچھا بیٹے

اب چھوڑو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چھوڑ دیتا ہوں وہ اڑنے کے لئے آسمان کی طرف رخ کرتی ہیں۔ میں جلدی سے دریافت کرتا ہوں۔ اماں جو فاتحہ میں آپ کو پہنچاتا ہوں وہ آپ کو پہنچتی بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میری زبان سے صرف اتنا ہی نکلتا ہے "اماں وہ جو میں" کہ والدہ میری طرف رخ موڑ کر فرماتی ہیں: ہاں بیٹا اور جو کچھ تجھے مل رہا ہے، میں ہی تو دلا رہی ہوں۔ اس پر میری آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت والدہ کی قبر پر گیا اور خوب رویا۔

معدودے چند علماء کا اگرچہ یہ خیال ہے کہ فاتحہ یا قرأت قرآن کا ثواب کسی میت کو نہیں پہنچتا لیکن علمائے امت کی عظیم اکثریت ثواب پہنچنے کی قائل ہے۔ اس سلسلہ میں علمی بحث سے ہٹ کر مجھے سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی کا کچھ اس طرح کا قول یاد آرہا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا صدقہ کیا اور انہیں کشف ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی نور کی روٹیاں ان کے استاد کو پہنچائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اقتدار اس دنیا پر بھی ہے اور اس دنیا پر بھی۔ اگر کوئی شخص کسی میت کو کچھ پہنچانا چاہے تو غریبوں کو دے کر اللہ کے سپرد کردے۔ اللہ تعالیٰ میت کو اس شکل میں پہنچا دے گا جو اس کے لئے مناسب ہے۔ اسے سائیں صاحب نے ایک مثال سے سمجھایا بھی ہے۔ میرے ذہن میں موجودہ زمانے کے مطابق اس سے زیادہ واضح مثال یہ آتی ہے کہ ہم سعودیہ سے پاکستان رقم بھیجتے ہیں تو ایسے بینک کو دیتے ہیں جس کا کاروبار سعودیہ میں بھی ہے اور پاکستان میں بھی۔ بینک ہم سے سعودیہ میں ریالوں کی شکل میں لیتا ہے اور پاکستان میں روپیوں کی شکل میں ادا کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کا اقتدار ہر جگہ ہے اگر اس دنیا سے مادی شکل میں لے اور اس دنیا میں نورانی شکل میں دیدے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

بہرحال والدہ مرحومہ نے خواب میں جو کچھ فرمایا اس کی بنیاد پر اپنی حد تک تو مجھے اطمینان ہے کہ میت کو تو ثواب پہنچتا ہی ہے۔ میت کی دعا کے نتیجہ میں ثواب

پہنچانے والے کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

اماں کا انتقال جیسا کہ یاد ہوتا ہے ۱۹۳۶ء میں سرونج میں ہوا۔ وہ سرونج ہی کے ایک قبرستان میں خانداں کے دیگر اعزہ کے ساتھ مدفون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے معمور فرمائے۔ آمین۔

پھوپھا صاحب مرحوم

لغوی اعتبار سے تو میرے متعدد خاندانی بزرگ تھے۔ لیکن اصطلاحی طور پر میں نے صرف ایک شخصیت کو بزرگ پایا۔ وہ تھے میرے پھوپھا حکیم یار محمد صاحب مرحوم۔

سرونج سے بارہ کوس (۲۴ میل) کے فاصلہ پر کوروائی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جہاں میرے پھوپھا طبیب تھے اور تنخواہ ریاست سے پاتے تھے۔ کوروائی کا چھوٹا سا قصبہ ایک سنگستانی قصبہ تھا جہاں سر پھوڑنے کے لئے پتھر ڈھونڈنے کے بجائے ہر وقت پتھروں سے سر بچانے کی فکر رہتی تھی۔ مکانوں کی دیواریں ٹولوں اور چنکھاریوں کی، فرش اور کواڑ پٹیوں کے اور چھت میں ان گھڑ پٹیوں کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ میرے پھوپھا کے لئے ایک بالاخانہ مخصوص تھا جہاں وہ اوراد و وظائف یا دوا سازی میں مصروف رہتے تھے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں جامع مسجد میں اعتکاف کرنے کا معمول تھا اور افطار اور سحر کا کھانا میری پھوپھی پہنچاتی تھیں۔ پھوپھی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ سحری لے کر مقررہ وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئیں۔ دیکھا کہ چت پڑے ہیں اور تمام اعضا۔ جدا جدا ہیں۔ (تصوف کے اشغال میں ایک مرحلہ یہ بھی آتا ہے۔) پھوپھی خوفزدہ ہو کر لوٹیں اور ابھی مسجد ہی میں تھیں کہ پیچھے سے پھوپھا آئے اور صرف اتنا کہا کہ بغیر بتائے بے وقت مت آیا کرو۔

ایک مرتبہ پھوپھا مرحوم کی نظر میری ڈائری پر پڑ گئی۔ اس میں بچھو کے جھاڑنے کا ایک عمل لکھا تھا۔ شروع ان الفاظ سے ہوتا تھا: کالی مہاکالی، کنکالی------ پھوپھا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فرمایا: بقا کیا کفریات لکھ رکھے ہیں۔ بچھو کا جھاڑنا بھی کوئی عمل ہے۔ تین بار اللہ کہہ کر پھونک مار دو بچھو اتر جائے گا۔

ایک مرتبہ میں مدرسہ سے بھاگ کر کوروائی پہنچا اور بیس روز پھوپھا کے پاس

رہا۔ آخر والد صاحب مرحوم نے مجھے لینے کے لئے سواری بھیجی، میں نے مچل کر پھوپھا سے کہا: میں تو نہیں جاتا مولوی صاحب ماریں گے۔ فرمایا: جاؤ نہیں ماریں گے جب ان کے سامنے جاؤ یہ پڑھتے ہوئے جانا "تری میں جا خشکی کی سیر کر یہ موہنی ہے حضرت مرتضیٰ علی کی۔" عصر کے بعد اسے پڑھتا ہوا مولوی صاحب کے سامنے پہنچا، مولوی صاحب ایک چبوترے پر بیٹھے تھے، تسبیح ہاتھ میں تھی اور منظور علی خان صاحب چکی والے مرحوم ان کے قریب کھڑے تھے، مجھ پر نظر پڑتے ہی منظور علی خان صاحب نے کہا: ارے بقا آگیا اب تو مسئلہ حل ہو گیا اور مولوی صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر صرف اتنا فرمایا: ہاں بقا نے تو ساری امیدیں خاک میں ملادیں۔

اس وقت سے اب تک میرا یہ معمول ہے کہ جب بھی کسی بڑے آدمی کے پاس جاتا ہوں زبان پر بے ساختہ وہی کلمات آجاتے ہیں اور حسب منشا ان کے اثرات دیکھتا ہوں۔

ان دنوں ریاست کے ممبر مال (وزیر مالیات) آنے والے تھے اور میں فرار تھا۔ مولوی صاحب کو یہ فکر تھی کہ اب ان کے سامنے تقریر کون کرے گا، کیونکہ اس طرح کے مواقع پر تقریر کے لئے ہمیشہ میرا ہی انتخاب ہوتا تھا۔ یہی وہ مسئلہ تھا جس کی طرف منظور علی خان صاحب مرحوم نے اشارہ کیا تھا۔

ناصر بھائی مرحوم

محمد ناصر انصاری مرحوم میرے تایا زاد بھائی تھے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، خاندان میں سب سے پہلے انہی نے اپنے نام کے ساتھ انصاری کی نسبت لگائی۔

غیر منقسم ہند میں اجمیر کے پاور ہاؤس میں فورمین تھے۔ مجبوراً پاکستان آئے تو چونکہ پاکستان آپٹ (OPT) نہ کیا تھا اس لئے ایک درجہ تنزل کے ساتھ سکھر میں چارج مین کی حیثیت سے تقرر ہوا اور اب کراچی کے ڈرگ روڈ کے قبرستان کی آغوش میں سو رہے ہیں۔

ناصر بھائی کی زندگی بھی پستی سے بلندی اور بلندی سے پستی، دکھ سے سکھ اور سکھ سے پھر دکھ کی ایک عبرتناک داستان ہے۔ بچپن کی حالت یسر کے مقابلہ میں عسر سے زیادہ قریب تھی۔ تایا مرحوم کی غیر معمولی شدت کی بنا پر ہوش سنبھالتے ہی، والدہ کے اشارہ پر، گھر چھوڑ دیا۔ بھوپال پہنچے اور ریلوے میں انجن میں کوئلہ جھونکنے کی خدمت ملی۔ ساتھ ہی زبیر میاں انجینیئر کے فیض سے ماہر الیکٹریشن بنے اور اجمیر میں فورمین کے عہدہ تک ترقی کرتے گئے۔

میں نے اپنے والد، تایا اور پھوپھی کو دیکھا ہے۔ اچھا ناک نقشہ تھا اور سرخ و سفید رنگ، ہم سب بہن بھائیوں میں ناصر بھائی اس موروثی حسن کے تنہا وارث تھے۔

حسن، جوانی اور دولت یکجا ہو کر جو رنگ لاتی ہے وہی رنگ ناصر بھائی کی زندگی کا تھا۔ پہلی شادی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی۔ جنہوں نے غربت کے دور تک ان کا پورا ساتھ دیا۔ امارت آئی تو انہیں طلاق دے دی، شاید اس لئے کہ وہ نو دولتئے معیار پر پوری نہ اترتی تھیں۔ اس کے بعد ٹونک میں ایک سید گھرانے کی یتیم لڑکی سے شادی کی۔ ان کے والد مولوی عبدالرزاق صاحب کلیمی سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ کے

اخلاف میں سے تھے ۔ شادی بھی اس طرح ہوئی کہ لڑکی کے دو امیدوار تھے: ناصر بھائی اور حکیم فخر احمد صاحب ۔ دونوں براتیں ساتھ ساتھ پہنچیں ۔ ماں ناصر بھائی کے حق میں تھیں اور دوسرے اعزہ فخر احمد صاحب کے حق میں ۔ ناصر بھائی کو معلوم تھا ۔ اجمیر سے پندرہ غنڈے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ جھگڑا ہو تو پرتھوی راج کا کردار ادا کر سکیں ۔ جب لڑکی کی منشا دریافت کرنے کا مرحلہ آیا تو ماں اپنے مرحوم شوہر کی تلوار سونت کر کھڑی ہو گئیں کہ اگر فخر احمد کا انتخاب کیا تو اسی وقت گردن اڑا دوں گی ۔ چنانچہ بازی ناصر بھائی کے ہاتھ رہی ۔

میری یہ بھاوج ۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے ۔ والدین کی اکلوتی لڑکی اور ان کی جائیداد کی تنہا وارث تھیں ۔ نقد اور زیورات کی وافر مقدار کے علاوہ ایک حویلی کی مالک بھی تھیں ۔ لیکن ناصر بھائی نے ان کی ساری دولت رنگ رلیوں میں اڑا دی ۔

جب نقد رقم ختم ہو گئی تو اسی ہزار میں (تقریباً ۱۹۳۰ء کے اسی ہزار) حویلی فروخت کر دی ۔ جب یہ رقم بھی ٹھکانے لگ گئی تو زیورات کی نوبت آئی ۔ ساس نے دردمندی سے کہا کہ انصاری زیور کو کسی آڑے وقت کے لئے رہنے دو ۔ ان کی بات مان لی ۔

ان بھاوج کے انتقال کے بعد ناصر بھائی نے تین شادیاں اور کیں ۔ ان کے پاس بیک وقت دو دو کاریں تھیں ۔ ایک دفتر کے لئے دوسری شکار کے لئے ۔ اپنی کار پر سرونج آتے تو پوں پوں کی آواز سے قصبہ گونج اٹھتا ۔ بچے سڑک پر دوڑ پڑتے کیونکہ اس زمانے میں سرونج میں کار کی آواز سال میں ایک بار صرف اس وقت سنائی دیتی تھی جب نواب سعادت علی خان شیر کے شکار کے لئے تشریف لاتے تھے ۔

ایک مرتبہ اجمیر کے بازار میں ایک تانگہ کے ٹکر مار دی ، گھوڑا مر گیا ۔ ایک مرتبہ شکار میں غلطی سے ایک آدمی کو مار دیا ۔ چونکہ کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے یارانہ تھا ، بال بھی بیکا نہ ہوا ۔ کہتے تھے کہ شکار پر جاتے وقت جب شہر سے دور بھیڑ

بکریوں کے ریوڑ سڑک پر ملتے تو میں تیزی سے انہیں کچلتا ہوا گذر جاتا تھا، مجھے اس میں بڑا مزا آتا تھا۔ ایک راجہ نے (نام یاد نہیں رہا) جائز رانی کے دباؤ سے اپنی داشتہ اور اس کی جوان بیٹی کو ریاست بدر کر کے انگلینڈ بھیج دیا تھا۔ بیٹی نے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کیا اور اجمیر آ کر کلینک اور میٹرنٹی ہوم کھولا۔ ڈلیوری کے لئے گھر پر چلی جاتی تھی لیکن پچاس روپے فیس لیتی۔ اس زمانے کے پچاس روپے جبکہ ٹونک میں ایک سپاہی کی تین روپئے (کلدار) کی تنخواہ پر ایک خاندان پلتا تھا۔

ایک بچہ کی ولادت کا وقت آیا تو ناصر بھائی نے اسی لیڈی ڈاکٹر کو بلایا۔ اور ایک مرتبہ جب وہ آئی تو ناصر بھائی کی ہو کر رہ گئی۔ وہ مسلمان ہو کر ان سے شادی کر لینے کے لئے آمادہ تھی۔ مگر بھاوج کے احسانات اور شرافت کے دباؤ سے اس کے ساتھ یہ رشتہ نہ ہو سکا۔

ناصر بھائی نے سنایا کہ ایک مرتبہ میرے ایک ہندو دوست نے کہا کہ فلاں مقام پر ایک مشہور سنیاسی رہتا ہے اور اصرار کیا کہ چل کر اسے ہاتھ دکھائیں۔ میں اسے اپنی کار میں لے کر اجمیر سے میلوں دور سنسان جنگل میں اس سنیاسی کے پاس پہنچا۔ سنیاسی نے میرا ہاتھ دیکھتے ہی کہا "باپ رے باپ! پرماتما ایسا بڑھاپا کسی کا نہ کرے جیسا تمہارا ہے"۔

آخری عمر میں جب ناصر بھائی افلاس، مرض اور اپنے بعض بہت ہی قریبی اعزہ کے رویہ سے روحانی اذیتوں میں مبتلا تھے، کہتے تھے کہ اگرچہ پامسٹری پر مجھے اب تک اعتماد نہیں لیکن اس سنیاسی نے جو کچھ کہا تھا آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اجمیر سے پہلے ناصر بھائی کا قیام الٰہ آباد میں تھا۔ میں نے وہ مکان دیکھا ہے۔ مکان دو منزلہ تھا جس کا چھپر انگریزی کھپریل کا تھا۔ یہ مکان آبادی کے کنارے پر اس طرح واقع تھا کہ اس کے بعد کوئی آبادی نہ تھی۔ بہت دور تک افتادہ زمین میں

اگے ہوئے سنواڑ کے پودے اور جھاڑیاں معمولی سے جنگل کا سماں پیش کرتے تھے۔ دوسری منزل گول تھی جس میں متعدد فلیٹس تھے اور سب کے آگے صرف ایک دیوار بنی ہوئی تھی۔ ناصر بھائی دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اور پڑوسی کا فلیٹ ایک بے اولاد جوڑے کا تھا، بیوی جوان، شوہر بوڑھا۔

شیخ سعدی نے اپنی بے نظیر کتاب گلستان میں اسی طرح کے ایک بے جوڑ جوڑے کی حکایت میں بیوی کی زبان سے کہلوایا ہے کہ "جوان عورت کے پہلو میں کوئی تیر بیٹھ جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ کوئی بوڑھا اس کے پہلو میں بیٹھے"۔

ناصر بھائی ایک روز اپنے فلیٹ کے باہر کھڑے تھے دیکھا کہ ایک گول سا کاغذ پڑوسن کی حدود میں کھپریل پر سے لڑھکتا چلا آرہا ہے۔ نیچے گرا تو انہوں نے اٹھالیا۔ پڑھا تو بیوی کے نام کسی عاشق کا پیغام تھا کہ فلاں وقت پہنچوں گا۔ وہ خط ناصر بھائی نے جیب میں رکھ لیا تھوڑی دیر بعد نیچے اترے تو ایک شخص ملا۔ اس نے کہا کہ تم اس راز سے واقف ہو گئے ہو اگر وعدہ کرو کہ افشا نہ کرو گے تو تمہیں روزانہ صبح تکیئے کے نیچے سے دو روپئے ملا کریں گے۔ اس کے علاوہ بھی اگر تمہیں کسی وقت میری ضرورت ہو تو ایک پرچہ میں یہ عبارت (جو مجھے یاد نہیں) لکھ کر جنگل کی طرف پھینک دیا کرنا میں آ جایا کروں گا ناصر بھائی کہتے تھے کہ تقریباً دو ماہ تک مجھے ہر صبح دو روپے تکیئے کے نیچے سے ملتے رہے اور ایک مرتبہ محض آزمائش کے طور پر حسب ہدایت پرچہ پھینکنے پر وہ آئے بھی۔

کہتے تھے کہ ایک مرتبہ میں محلہ کی دوکان پر مہینے کے قرض کا حساب کر رہا تھا کہ میری نظر اسی طرح کے کاغذ پر پڑی جو پیغام وصال کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ میرے کریدنے پر دوکاندار نے بتایا کہ گاہے گاہے ایک اجنبی شخص آتا ہے۔ مجھ سے کاغذ مانگتا ہے اور اسی دوات قلم سے یہیں بیٹھ کر پرچہ لکھتا اور چلا جاتا ہے۔ ناصر بھائی نے اس کے سامنے راز افشا کر دیا۔ کہتے تھے کہ اس کے بعد سے دو روپئے ملنا بند ہو گئے اور جنگل کی سمت کئی پرچے پھینکے، ہر بلاواصدا بصحرا ثابت ہوا۔

ناصر بھائی نے بیان کیا کہ اجمیر میں شہر سے باہر ایک ویران مسجد تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ جنات کا مسکن ہے۔ میں جنات کا نہ اس زمانے میں قائل تھا نہ اب ہوں۔ ایک مرتبہ دوستوں کے درمیان یہ شرط قرار پائی کہ اگر میں عشاء کے بعد اس مسجد میں چلا جاؤں تو مجھے اتنی مٹھائی کھلائیں گے۔ دوست دور کھڑے رہے اور میں تنہا مسجد میں داخل ہوا۔ دروازے پر قدم رکھتے ہی میں نے دیکھا کہ مسجد کا پورا صحن سفید کپڑوں اور سفید ڈاڑھیوں والے نمازیوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں انتہائی خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں بھاگا اور کئی روز تک بخار میں پڑا رہا۔

ناصر بھائی نے بیان کیا کہ ایک روز میں نوکر کو ساتھ لے کر شکار کے لئے جا رہا تھا۔ زرد رنگ کا ایک اژدھا دیکھا جو سڑک کی طرف آرہا تھا۔ میں نے کار آہستہ کر لی اور جب وہ پوری طرح سڑک پر آگیا تو تیزی سے کار اس پر سے گذار دی۔ آگے گاڑی روکی تاکہ اس کا حشر دیکھ سکوں۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب دیکھا کار کے نچلے حصہ میں ملازم سے دکھوایا، بونٹ اٹھایا حتیٰ کہ اتنی گھبراہٹ طاری تھی کہ ڈگی کھول کر دیکھی، لیکن کہیں نظر نہ آیا۔ تعجب اور خوف کی کیفیت کے ساتھ آگے روانہ ہوئے۔ کچے راستے سے ہو کر ایک گاؤں پہنچنا تھا۔ جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ دفعتہً کیا دیکھتا ہوں کہ کار ایک باؤلی کے ڈھلان میں اتر چکی ہے۔ بہت زور سے بریک نہ مارا ہوتا تو پانی میں ہوتی۔ ملازم سے کہا کہ پتھر لا کر اگلے پہیوں کے آگے رکھے۔ پھر قوت سے بیک کر کے اوپر آیا۔ گاؤں پہنچنے کے لئے ایک پایاب ندی میں سے گذرنا پڑتا تھا بارہا اس ندی میں سے گذرا تھا، اس مرتبہ جو گذرا تو گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی۔ جب اپنی سی کر کے ہار گئے تو گاؤں والوں کو بلوایا، انہوں نے کار نکالی اور خدا خدا کر کے گاؤں پہنچے۔ گاؤں والوں سے اژدھے کا واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا رام رام وہ تو دیوتا ہیں۔ روزانہ سانجھ بھئے جنگل کی ایک اور سے دوسری اور جاتے ہیں اور دن چھپے لوٹ جاتے ہیں۔ آپ کو اسی کارن یہ تکلیفیں ہوئیں کہ آپ نے انہیں ستایا۔ اور میں نے "ہشت"

کیا اور کہہ دیا کہ یہ سب توہمات ہیں۔ دوسرے روز گاؤں کے ایک جانکار کو لے کر شکار کو نکلے گولی چیتل (شاید یہی کہا تھا) پر چلائی اور لگی ایک آدمی کے اور وہ ایک زور کی چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ واپس بھاگے اور دیہاتی کو اس کا منہ بند کرنے کے لئے روپے دیئے (تعداد یاد نہیں رہی) اور گھر واپس آگئے۔

ایک مرتبہ ٹونک کی ایک مشہور مجذوبہ منی بی کے بھائی میاں عبدالرحیم شاہ صاحب، جو ریاست بدر کر دیئے جانے کے بعد جاورے میں مقیم تھے، عرس کے موقع پر اجمیر گئے۔ ناصر بھائی کہتے تھے کہ مجھے زندگی میں وہی ایک بزرگ ملے جن سے میں کسی تعارف کے بغیر صرف صورت دیکھتے ہی متاثر ہوا۔ چنانچہ قیام گاہ پر پہنچ کر ان سے ملا۔ بہت سے قصے اس طرح کے سن رکھے تھے کہ عرس کے موقع پر خواجہ صاحب (خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ) فلاں سے ملے۔ میں ان قصوں کو لغویات سمجھتا تھا اور انہیں دنوں مجھے یہ خیال آیا تھا کہ میں تو جب مانوں جب خواجہ صاحب مجھے ملیں۔

ایک روز عصر کے بعد درگاہ کے دروازہ کے قریب سے گذر رہا تھا کہ ایک شخص کو جو گوشیہ ٹوپی پہنے پانی پلاتے دیکھا۔ اس نے مجھے بھی پانی دیا اور کٹورا واپس لے کر مڑ گیا۔ بھیڑ میں دو چار قدم ہی گیا ہو گا کہ مجھے مزید پانی کی خواہش ہوئی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا، تلاش بھی بہت کیا۔

وہاں سے میں ان بزرگ کی قیام گاہ پر پہنچا۔ بیٹھتے ہی فرمایا کہ تم خواجہ صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔ جس نے تمہیں پانی پلایا وہ خواجہ صاحب ہی تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ پہلے سے ہمارا باہمی تعارف بھی نہیں۔ ملاقات بھی صرف دوسری ہے اور میں نے انہیں یہ قصہ بھی نہیں سنایا، پھر انہیں کیسے معلوم ہوا۔

کہتے تھے کہ ایک مرتبہ بارش کے زمانے میں ٹھیک خواجہ صاحب کی قبر پر گنبد سے آہستہ آہستہ ایک ایک قطرہ ٹپکنا شروع ہوا۔ درگاہ کی بجلی کے نظام کے ساتھ ساتھ اس طرح کا انتظام بھی میرے چارج میں تھا۔ میں نے پاڑ بندھوائی اور خود چڑھ کر دیکھا

نقص سمجھ میں آگیا۔ جب نیچے اترا تو مرزا عبدالقادر بیگ نے کہا کہ انصاری! گنبد بننے کے بعد تم پہلے شخص ہو کہ آج گنبد پر چڑھ کر خواجہ صاحب کے اوپر ہوئے ہو۔ یہ ایک طرح کا سوئے ادب ہے۔ اندر جاؤ اور خواجہ صاحب سے معافی مانگو۔ میں نے کہا کیا فضول باتیں کرتے ہو۔

اس واقعہ کو چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک رات میرا انگریز افسر گھر پر آیا اور کہا کہ انصاری میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اسی رات اجمیر چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ طے پا چکا ہے کہ جیسے ہی صبح تم پاور ہاؤس پہنچ کر عاملین کی پریڈ کا معائنہ کرو گے فوراً ہی تمہیں بوائلر میں پھینک دیا جائے گا اور نہ پہنچے تو لوگ گھر آکر تمہیں قتل کر دیں گے۔ چونکہ ملک کا بٹوارہ ہو چکا تھا اور ہندو ایک مسلمان کو فورمین کی حیثیت سے گوارا نہ کرتے تھے جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ اس لئے اسی رات بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ کار، بنگلہ، بینک بیلنس سب کچھ وہیں رہ گیا اور بمبئی سے پاکستان چلا آیا۔ لیکن اب بھی میں اسے انقلاب کا تقاضا سمجھتا ہوں خواجہ صاحب کا تصرف نہیں۔

ناصر بھائی کہتے تھے کہ میں برسوں درگاہ کی بجلی کے نظام کا انچارج رہا ہوں۔ لیکن میں نے ایک بار بھی اندر جا کر قبر نہیں دیکھی جہاں مجاور لوگوں کی گردنیں پکڑ پکڑ کر قبر کو سجدے کراتے تھے۔

میں بھی جب دیو بند میں تعلیم پاتا تھا ایک بار اجمیر گیا اور ناصر بھائی مجھے لے کر مزار پر گئے تو مجھے اندر بھیج دیا لیکن خود باہر ہی بیٹھے رہے۔ میرے تایا مرحوم آخری عمر میں اجمیر میں ناصر بھائی کے پاس ہی رہا کرتے تھے۔ مکان کی ڈیوڑھی میں ان کا قیام تھا ایک مرتبہ ناصر بھائی کچھ احباب کو گھر لائے اور گھر کے اندر ڈرائنگ روم میں لے جانے لگے۔ ڈیوڑھی میں سے گذرتے ہوئے کسی نے تایا مرحوم کو دیکھ کر دریافت کیا: یہ کون ہیں؟ ناصر بھائی نے جواب دیا: میرے والد کے ملنے والوں میں سے ہیں۔ تایا نے سن لیا۔ ان جیسا شخص جو انتہائی مغلوب الغضب ہو، یہ بات کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

فوراً بولے: سنو میاں! میں ان کے والد کے ملنے والوں میں سے نہیں بلکہ ان کی والدہ کا ملنے والا ہوں۔ ناصر بھائی تو سب کے ساتھ اندر چلے گئے اور تایا نے مختصر سامان ہاتھ میں لیا اور سرونج آنے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ جب ناصر بھائی باہر نکلے اور انہیں نہ دیکھا تو ملازم سے دریافت کیا! میاں کہاں ہیں؟ جواب ملا: وہ تو اسٹیشن گئے۔ فوراً اسٹیشن پہنچے اور پلیٹ فارم پر سب کے سامنے پیر پکڑ کر التجا کی کہ میاں معاف کر دیجئے۔ اس واقعہ کی تصدیق ناصر بھائی کے لڑکے ہادی میاں سلمہ نے بھی کی۔

خون میں اگر شرافت ہو تو بالآخر وہ رنگ لاتی ہی ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ آخرت میں ناصر بھائی کے ساتھ رحمت و درگذر کا سلوک فرمائے، آمین۔

ہمارے خاندان کی حالت

میرے دادا باقر علی صاحب مرحوم سے جو نسل چلی اس کے مردوں میں آج مجھ سے بڑا کوئی شخص زندہ نہیں۔ مجھ سے بڑی صرف ایک میری بہن سائرہ خاتون بقید حیات ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت وعافیت کے ساتھ قائم رکھے۔آمین۔

اس وقت اس خاندان کی گذشتہ اور موجودہ چار نسلیں میرے سامنے ہیں۔ بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ ہمارا خاندان ہمیشہ سے باہمی حسد، بغض اور عداوت کا شکار رہا۔ "الأقارب کالعقارب" (رشتہ دار بچھوؤں کا طرح ہیں) کی مثل ہمارے خاندان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے میرے اوپر جو بے شمار کرم ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں اپنے بچپن ہی سے کبھی خاندانی جھگڑوں میں مبتلا نہیں ہوا۔ میں ہر رشتہ دار کے گھر جاتا تھا خواہ پذیرائی ہو یا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمارے خاندان پر رحم فرمائے اور باہمی نفرتوں کو محبتوں میں تبدیل فرمادے۔آمین۔

خسر صاحب مرحوم

میرے خسر منشی بشیر الدین صاحب مرحوم کا شمار قصبہ کے ان وضعدار شرفا میں سے ہوتا تھا جو انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ پولیس میں کورٹ انسپکٹر (پیروکار پولیس) تھے اور سرونج میں ۲۲ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ قانون میں بڑی مہارت تھی۔

ذوق بڑا لطیف پایا تھا۔ جوانی کے زمانے میں مزاج میں بڑی رنگینی تھی، رنگین کاغذ کی پھول پتیاں بڑی خوبصورت بناتے تھے، کشیدہ کاری میں بڑی دسترس تھی اور ستار اور طبلہ نوازی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ آئے دن احباب کی مجلسیں جمتیں اور موسیقی کی تانیں ابھرتیں۔

دفعتہً ان کی طبیعت میں انقلاب آیا۔ مذہب کی طرف مائل ہوئے اور اس شدت کے ساتھ کہ تقشف میں علماء کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ موسیقی کے آلات خود اپنے ہاتھ سے توڑ کر پھینکے۔ اپنے دونوں بچوں مولانا نصیر الدین صاحب اور مولانا نذیر الدین صاحب کی تعلیم کے لئے "ریاض المدارس" کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا اور اس سلسلے میں ان کے دوسرے احباب نے بھی تعاون کیا۔ دیوبند سے دو علماء تدریس کے لئے بلائے گئے، مولانا محمود الحسن صاحب اور قاری سید فصیح احمد صاحب اور خود ساری عمر اس کے مہتمم رہے۔

چونکہ یہ مدرسہ "اسس علی التقوی" کا مصداق تھا اس لئے اللہ نے اس سے بڑا فیض پہنچایا۔ ان کے دونوں صاحبزادے دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے، دوسرے متعدد طلبہ بھی ریاض المدارس میں متوسطات تک پڑھ کر دیوبند گئے اور وہاں سے فراغت پائی۔ نالائق راقم الحروف بھی اسی مدرسہ سے فیض پا کر دیوبند گیا۔

مرحوم کا ہمیشہ یہ دستور رہا کہ تعطیلات میں اساتذہ اور منتخب طلبہ کو لے کر قصبہ سے دور کسی پر فضا مقام پر جاتے اور وہاں چند روز سیر و شکار میں گذارتے۔ لیکن خود شکار نہ کھیلتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کی ترقی ہوئی، انسپکٹر بنا دیئے گئے۔ لیکن چند روز بعد ہی دوسرے پرگنہ میں تبادلے کے احکام آگئے انہوں نے درخواست دی کہ مجھے سرونج ہی میں پیروکار رہنے دیا جائے اور یہ ترقی واپس لے لی جائے۔ درخواست منظور ہو گئی۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ ریاض المدارس کی شکل میں جس پودے کو لگا کر پروان چڑھایا ہے، میرے بغیر وہ مرجھا جائے گا۔ اگر ترقی رد نہ کرتے تو یقیناً سپرنٹنڈنٹ پولیس بن کر ریٹائر ہوتے۔

خسر صاحب کے بھائی بہن زندہ نہ رہتے تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے اور بقید حیات رہے تو ان کی والدہ نے بڑے ارمانوں اور بڑی ناز و نعمت سے ان کی پرورش کی۔ اس زمانے کی بڑی بوڑھیوں کی طرح ان کی والدہ بھی کونڈوں پر گیارہویں کی نیاز کیا کرتی تھیں۔ مذہبی انقلاب آجانے کے بعد ایک مرتبہ والدہ نے حسب دستور کونڈے بھرے خسر صاحب نے کہا۔ بی! اس رواج کو ترک کر دیں، یہ شریعت کے خلاف ہے۔ ماں نے ڈانٹ دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔ دوسرے سال پھر اسی معاملہ کا اعادہ ہوا۔ تیسرے سال خسر صاحب نے کہا: بی میں تیسری بار یہ بات کہہ رہا ہوں، اگر اب بھی آپ نہ مانیں تو ساری زندگی اپنی صورت آپ کو نہ دکھاؤں گا۔ بی کہاں ماننے والی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ والدہ اگرچہ ان کے پاس ہی رہتی تھیں لیکن اتفاق کو چھوڑ کر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ والدہ کے سامنے آئے ہوں یا ان سے کوئی بات کی ہو۔ البتہ ان کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھتے تھے۔

والدہ مرض الموت میں مبتلا ہوئیں، بار بار کہتی تھیں، بشیر الدین کو بلاؤ۔ لوگ خوشامدیں کرتے تھک گئے۔ بالآخر مولوی صاحب اور قاری صاحب نے والدہ کے

حقوق یاد دلا کر سمجھایا۔ جواب یہ دیا کہ میں نے تو اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ تین بار سمجھانے کے باوجود جو اس طرح تیری نافرمانی کرے اسے صورت نہ دکھاؤں گا۔ میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی والدہ بیٹے کی صورت کو ترستی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

خود خسر صاحب کی حالت اپنے مرض الموت میں یہ تھی کہ بار بار اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہتے: دیکھو یہ فرشتے مجھے لینے آئے ہیں اور خوشدامن کہتیں: کہاں ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آرہے، تو فرماتے: ارے یہ کیا کھڑے ہیں۔

آخری وقت کی اس کیفیت اور طویل زندگی کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے باوجود وہ کئی روز تک نزع کے عالم میں گرفتار رہے۔ شاید یہ اثر ہو اس سلوک کا جو انہوں نے اپنی والدہ کے ساتھ کیا تھا۔

پیروکار صاحب (سب لوگ انہیں یہی کہتے تھے) کے معمولات یہ تھے:۔

ا.... فجر کی نماز مسجد میں پڑھ کر گھر کے اندر جاتے اور بچیوں کو بہشتی زیور پڑھاتے۔ اشراق کے وقت باہر مردانہ میں آجاتے۔ نو بجے دفتر جانے سے پہلے خوشدامن صاحبہ انہیں وہیں کھانا لا کر دیتیں، اس کھڑکی سے جو زنانخانہ کی طرف سے مردانہ میں کھلتی تھی۔ دفتر سے واپس آکر مردانہ ہی میں رہتے۔ عصر کے بعد سے عشاء تک اس کھٹے پر بیٹھے رہتے جو مردانہ کے برآمدے پر بچھا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر زنانخانہ میں جاتے اور اپنے اسی پلنگ پر سوتے جو ہر موسم میں ایک ہی جگہ برآمدہ میں بچھا رہتا تھا۔ سخت سردیوں یا شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی ان کی خوابگاہ نہ بدلتی تھی۔ دن کے وقت صرف سردی کے زمانے میں ظہر کے وقت گرم پانی سے وضو کرنے کے لئے زنانخانہ میں جاتے اور عام طور پر اسی وضو سے عشاء کی نماز پڑھتے۔ باقی پورے سال دن کے وقت کبھی زنانخانہ میں داخل نہ ہوتے۔ اگر کام ہوتا تو زنانخانہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کھنکارتے، خوشدامن صاحبہ آجاتیں۔ کھڑے کھڑے ان سے بات کرتے اور واپس

جاتے۔فرماتے تھے کہ میرے اندر جانے سے بچیوں کی بے تکلفی اور آزادی میں فرق آتا ہے۔اور واقعہ یہ ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ قطعی طور پر نہ ہونے کے باوجود ان کا رعب اپنی اولاد پر ایسا ہی تھا جیسا شیر کا بکریوں پر۔تاہم لڑکیوں اور خاص طور پر صفیہ خاتون سے بہت محبت کرتے تھے اور اگر دوسری لڑکیوں کو باپ سے کبھی کچھ کہنا ہوتا تو صفیہ خاتون ہی واسطے بنتی تھیں۔میری خوش نصیبی کہ یہی صفیہ خاتون میری بیوی بنیں۔

۲..... کھانا صرف دو وقت کھاتے تھے، صبح دس بجے اور مغرب کے بعد۔جو کچھ کھانا ہوتا کھانے کے ساتھ ہی کھاتے۔کھانے کے وقت کے علاوہ کبھی کوئی چیز زبان پر نہ رکھتے ان کے آم کھانے کا یہ معمول تھا کہ دودھ اوٹا کر سرخ کیا جاتا اس میں میٹھے آموں کا رس نچوڑا جاتا اور چینی ملا کر ان کے سامنے پیش کیا جاتا۔انہوں نے کبھی آم چوس کر نہیں کھایا۔فرماتے تھے۔یہ کیا بد تمیزی ہے کہ منہ میں ڈالو پھر نکالو اور تھوک میں آلو دہ آم پھر منہ میں ڈالو۔کھانا بہت اچھا کھاتے تھے اور پکاتے بھی بہت اچھا تھے۔

۳..... ڈی۔ون لٹھے کا شرعی پاجامہ، سب سے اچھے قسم کی باریک ململ کا کرتہ اور دفتر جاتے وقت مکھن زین کا کوٹ اور باریک ململ کا عمامہ یہ ان کا ہر موسم کا دائمی لباس تھا۔سردیوں میں صبح وشام روئی کی صدری پہنتے تھے۔

۴..... عام طور پر سال میں صرف ایک بار عید کے موقع پر سب کے لئے کپڑا خریدنے مخصوص بزاز کی دوکان پر جاتے۔اردلی ساتھ ہوتا اور پسند کردہ کپڑے وہی اٹھا کر لاتا۔اگر کبھی انہوں نے بازار سے دو پیسے کی چیز بھی خریدی تو وہ اردلی کے ہاتھ میں ہوتی تھی خود اپنے ہاتھ میں نہ لاتے تھے، البتہ ریٹائرمنٹ کے بعد جب اردلی نہ رہا تو معمول میں اتنا فرق آگیا تھا کہ جمعہ کی نماز سے لوٹ کر آتے تو ہرا دھنیہ، ہری مرچ اور پودینہ خرید کر دستی میں باندھ کر خود گھر لے آتے۔

۵..... سال بھر کی ضرورت کا غلہ اور گھی ایک مرتبہ ہی خرید لیا جاتا۔اگر کسی مہینے میں گھی کی وہ مقدار ختم ہو گئی جو ہر ماہ نکالا جاتا تھا تو مہینے کے باقی ماندہ ایام کے لئے گھی

بازار سے آتا تھا. ذخیرہ میں سے نہ نکالا جاتا تھا۔ گھی بھی نہایت نفیس قسم کا دیہات سے خریدا جاتا تھا۔

۶.... ایک مرتبہ میں اپنی بڑی بچی نجمہ کو گود میں لئے کھڑا تھا۔ فرمایا: میں نے کبھی اپنی بچیوں کو گال پر پیار نہیں کیا۔ بہت محبت آئی تو پیشانی چوم لی۔ میرے خیال میں گال کا پیار صرف شوہر کا حق ہے۔

۷.... صبح بیت الخلا، جانے سے پہلے خوشدامن جاکر وہاں راکھ ڈالتی تھیں تاکہ بدبو نہ آئے۔ اس کے بعد وہ بیت الخلا، جاتے تھے۔

۸.... ایک مرتبہ ان کے چھوٹے بھائی حبیب الدین صاحب کے گھر میں چوری ہوئی، کچھ روپے چرائے گئے تھے۔ پولیس میں رپورٹ کردی گئی۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ چوری خود ان کے بھتیجے نے کی تھی۔ پیروکار صاحب کا بھتیجہ ہونے کی وجہ سے افسر تفتیش نے معاملہ کو دبانا چاہا۔ پیروکار صاحب کے علم میں آیا تو انہوں نے افسر تفتیش کو خبردار کیا کہ جب ایک بار پولیس میں رپورٹ درج کرائی جاچکی ہے تو اس کا معاملہ باقاعدہ کورٹ میں پیش ہوگا۔ چنانچہ مقدمہ کورٹ میں پیش ہوا، کورٹ انسپکٹر وہ خود تھے، پولیس کی طرف سے پیروی ان کو کرنی تھی۔ چنانچہ اسی طرح پیروی کی جس طرح دوسرے ملزموں کے خلاف پیروی کرتے تھے۔ مجسٹریٹ خود بھی پیروکار صاحب کو جانتا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ پیروکار صاحب یہ کیا کر رہے ہیں۔ انہیں سمجھانے کے لئے نجی طور پر مجسٹریٹ نے ان کے پاس آدمی بھی بھیجا۔ لیکن پیروکار صاحب نے وہی کیا جو قانوناً انہیں کرنا چاہیئے تھا۔ نتیجتہً ان کے بھتیجے کو سزا ہوئی، لیکن مسجٹریٹ نے اس سزا کو اتنا نرم کر دیا کہ صرف تین دن کی جیل کی اور چونکہ سب لوگ ان کی دیانت اور قانون کے معاملہ میں ان کی شدت کے قائل تھے۔ اس لئے اس واقعہ کے بعد بھی دونوں بھائیوں کے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ سزا یافتہ بھتیجے نے ساری زندگی ان کے احترام میں فرق آنے دیا۔

• ... عید، بقر عید کے موقع پر عام طور پر ماتحت اپنے افسروں کے گھر عید ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ پیروکار صاحب ایسے موقع پر کسی کے گھر نہ جاتے تھے۔ خود بعض افسران حتیٰ کہ بعض اوقات ناظم صاحب (کلکٹر) تک ان سے عید ملنے ان کے گھر آتے تھے۔

خسر صاحب مرحوم بہت ذہین آدمی تھے۔ سراغ رسانی میں ان کی صلاحیت کے پولیس افسران بھی قائل تھے۔ انہوں نے سراغ رسانی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور اس کی کتابت بھی کرالی تھی۔ ان کی تمنا تھی کہ یہ کتاب شائع ہو لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔

ان کی ذہانت اور ایک ہی نظر میں معاملہ کی تہ تک پہنچ جانے کی صلاحیت کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوسکے گا۔

پیروکار بننے سے پہلے ایک دیہاتی تھانہ پر تھانیدار کی حیثیت سے متعین تھے۔ گرمیوں کی شام میں تھانہ کی چھت پر بیٹھے تھے کہ دور سے ایک شخص نظر آیا، جو گٹھری سر پر رکھے کہیں جارہا تھا۔ پیروکار صاحب نے سپاہی سے پوچھا۔ وہ کون ہے؟ سپاہی نے جواب دیا فلاں شخص ہے جو دیہاتوں میں پھر کر کپڑے بیچتا ہے۔ فرمایا اسے یہاں لاؤ۔ وہ لایا گیا تو اس کی گٹھری کھلوائی۔ اس نے پس و پیش کے بعد گٹھری کھولی تو اس میں متعدد کفن تھے۔ چنانچہ اسے گرفتار کرلیا۔ سپاہی نے دریافت کیا کہ آپ نے اتنی دور سے کیسے تاڑ لیا۔ فرمایا کہ کپڑے بیچنے والا تھانوں کو باقاعدہ تہ کرکے گٹھری بناتا ہے اور اس کی گٹھری کی خاص وضع ہوتی ہے۔ اس شخص کو جب تم نے کپڑا بیچنے والا بتایا تھا جب میں نے دیکھا کہ وہ دھوبی کی طرح کپڑوں کی پوٹ بنائے ہوئے ہے تو مجھے شبہ ہوا۔

ایک مرتبہ فرمایا۔ چمار کی پہلی نظر جب پڑتی ہے جوتے پر پڑتی ہے کہ قابل مرمت تو نہیں اور نائی کی پہلی نظر ہمیشہ سر اور چہرے پر پڑتی ہے کہ قابل اصلاح تو نہیں!

پیروکار صاحب کو صرف پچاس روپئے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور اس میں وہ اس

حسن انتظام سے بسر کرتے تھے کہ وضعداری کا پورا بھرم قائم رہتا تھا۔ خود کے پاس تو کچھ نہ بچتا تھا لیکن دوسروں کی امانتیں ان کے پاس بکثرت رہتی تھیں حتیٰ کہ ایک صاحب کی تو تجوری بھی انہی کے گھر میں رکھی رہتی تھی۔

ان پر کبھی زکوۃ واجب نہیں ہوئی۔ صدقہ کا پائیدار ثواب حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیشہ سرمہ، منجن اور مال کنگنی کا تیل لوگوں کو مفت دیتے تھے۔ منجن بھی بہت مفید تھا، سرمہ ایسا تھا کہ اس کے چند ماہ استعمال سے آنکھوں کا جالا تک کٹ جاتا تھا اور مال کنگنی کا تیل ہر قسم کے درد کے لئے مفید ہے۔

پیروکار صاحب کو فن تعمیر میں بھی اچھا دخل تھا چنانچہ جامع مسجد کی دوسری منزل کی تعمیر انہی کے زیر نگرانی ہوئی اور ولی اللہ خان صاحب نے بھی جو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے اپنا وسیع وعریض مکان انہیں سے بنوایا۔ ایک صاحب اس مکان کے ایک کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہوئے تو ان کا سر اوپر چوکھٹ سے چھوا۔ انہوں نے کہا کہ پیروکار صاحب! آپ نے دروازہ اتنا نیچا رکھا ہے کہ سر ٹکرائیں۔ پیروکار صاحب نے جواب دیا: دروازے سے نکلتے وقت ایک پیر دہلیز کے ایک طرف ہوتا ہے اور دوسرا پیر دوسری طرف رکھا جاتا ہے اور اس طرح قد کم از کم آدھا فٹ کم ہو جاتا ہے۔ دہلیز پر پیر رکھ کر کوئی دروازہ سے نہیں نکلتا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت اور مغفرت سے نوازے۔ آمین۔

صفیہ خاتون (میری بیوی)

میں جس زمانے میں ریاض المدارس، سرونج میں زیر تعلیم تھا، اس زمانے میں میری بیوی اور ان کی چھوٹی بہن رقیہ خاتون عمر کے اس مرحلے میں تھیں جب بچیاں پردے کے قید و بند سے آزاد ہوتی ہیں۔ دونوں بہنیں مدرسے میں آتی رہتی تھیں اور مولانا محمود الحسن صاحب کے چھوٹے بھائی حافظ مقصود احمد صاحب سے بہت مانوس تھیں جو خود صاحب اولاد تھے لیکن اسی مدرسے میں زیر تعلیم تھے۔ دونوں بچیاں ان کے پاس کھیلا کرتی تھیں۔

سال میں ایک بار جب مدرسے کے مہتمم منشی بشیر الدین صاحب مرحوم، حسب معمول مدرسے کے اساتذہ اور منتخب طلبہ کو لے کر چند روز کے لئے سرونج کے مضافات میں کسی پر فضا مقام پر جاتے تو یہ دونوں بہنیں بھی ساتھ ہوتیں اور منتخب طلبہ میں سے میں بھی۔

اس طرح صفیہ خاتون میرے لئے نئی نہ تھیں بلکہ بچپن سے دیکھی ہوئی تھیں

حافظ مقصود احمد صاحب ریاض المدارس میں متوسطات پڑھ کر دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور میں بعد میں پہنچا۔

میری تعلیم کی تکمیل میں ایک سال باقی تھا اور حافظ مقصود صاحب تکمیل کے بعد اسی سال واپس جانے والے تھے۔ ایک روز موصوف نے مجھ سے کہا کہ تم آئندہ سال تعلیم سے فارغ ہو کر جب وطن پہنچو گے تو تمہاری شادی کا مسئلہ زیر غور آئے گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ شرافتِ نفس کے ساتھ ساتھ جتنی دین داری اور اولاد کی صحیح تربیت ظہیر الدین صاحب کے گھر میں ہے پورے سرونج میں اس کی نظیر نہیں۔ اور ان کی

چاروں لڑکیوں میں صفیہ سے بہتر کوئی لڑکی نہیں ۔ اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ شادی کے لئے تم صفیہ کا انتخاب کرنا۔

حافظ صاحب نے یہ بات ایسے وقت میں کہی جب ذہن میں شادی کا تصور بھی نہ تھا۔ ناپختہ اور خالی ذہن میں حافظ صاحب نے جو خیال ڈالا وہ پتھر کی لکیر بن گیا۔

فارغ ہو کر جب وطن پہنچا تو واقعتہً سب سے پہلے شادی ہی کا سوال اٹھا۔ میرے استاد محترم قاری سید فصیح احمد صاحب مرحوم کو واسطہ بنایا گیا کہ میرا رجحان معلوم کریں۔ قاری صاحب مرحوم نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے خیال میں میری شادی کے لئے سب سے موزوں گھر بشیر الدین صاحب مرحوم کا گھر ہے اور جب میں نے اپنی آمادگی کے ساتھ ساتھ صفیہ خاتون کا نام لیا تو استاد مرحوم کا منہ تعجب سے کھلا رہ گیا۔ فرمایا: نہ پہلی نہ دوسری، تمہاری نظر انتخاب تیسری پر پڑی (صفیہ خاتون کی دو بڑی بہنیں فاطمہ خاتون اور عائشہ خاتون اس وقت تک غیر شادی شدہ تھیں) مرحوم خاموش ہو کر تشریف لے گئے۔ اور جب یہ بات جانبین کے بزرگوں کو معلوم ہوئی تو والد صاحب مرحوم نے فوراً صفیہ خاتون کے لئے میرا پیغام دے دیا اور خسر صاحب مرحوم پس و پیش میں مبتلا ہو گئے۔

چند روز بعد جب کہ والد صاحب، خسر صاحب، میرے برادر نسبتی مولانا نذیر الدین صاحب اور میں یکجا تھے، والد صاحب مرحوم نے خسر صاحب مرحوم کو مخاطب کر کے فرمایا: ہمیں تو شادی کی جلدی ہے، آپ فرمائیں کہ آپ کا کیا جواب ہے۔ خسر صاحب نے جواب دیا کہ دو بڑی لڑکیوں کے ہوتے ہوئے تیسری کی شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ والد صاحب مرحوم نے جب دوبارہ یہ فرمایا کہ ہمیں تو جلدی ہے تو مولانا نذیر الدین صاحب نے، جو مزاج کے تیز ہیں، جواب دیا کہ اگر آپ کو جلدی ہے تو جہاں چاہیں رشتہ کر لیجئے۔ بات ختم ہو گئی اور لوگ منتشر ہو گئے۔

تصورات کا محل زمیں بوس ہوتے دیکھنا مجھے گوارا نہ تھا اس لئے اسی روز

مغرب کے بعد میں اپنے دوست مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کو ساتھ لے کر خسر صاحب مرحوم کے مکان پر پہنچا۔ مرحوم بہت ذہین آدمی تھے، ہمارے پہنچتے ہی آمد کا مقصد سمجھ گئے۔ فرمایا: بیٹھو، اور بیٹھتے ہی فرمایا کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بغیر جھجک کے بے تکلف کہو۔

میں نے عرض کیا: آپ کی مشکل کا مجھے احساس ہے۔ میں صرف اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اگر صفیہ خاتون کے لئے میرا رشتہ آپ کو منظور ہو تو میں اس وقت تک انتظار کرنے کے لئے تیار ہوں جب تک دونوں بڑی بہنوں کے رشتے نہ ہو جائیں۔

مرحوم جتنے ذہین تھے اتنے ہی صاف گو بھی تھے۔ فرمایا: تمہارے بارے میں کبھی یہ تصور بھی نہیں آیا کہ تمہیں لڑکی نہیں دینی، لیکن اس وقت جو مشکل مجھے درپیش ہے اس کا تمہیں بھی اعتراف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ پھر میں سالوں انتظار کے لئے تیار ہوں۔

ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ بڑی بہن کا رشتہ طے ہوا (اور اس کے طے ہونے میں بھی زیادہ تر میرا ہی دخل تھا) اور اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے والد صاحب مرحوم نے، اور سچی بات یہ ہے کہ درپردہ خود میں نے بھی یہ کوشش کی کہ بڑی کے ساتھ ساتھ تیسری کا رشتہ بھی ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ پہلی اور تیسری کی شادیاں ہو گئیں اور دوسری بیٹھی رہی۔

شادی سے قبل جب میرے پیغام کا ذکر میرے خسر صاحب نے خوش دامن صاحبہ مرحومہ سے کیا تو مرحومہ نے فرمایا کہ: آپ ایسے خاندان میں شادی کرنا چاہتے ہیں جس کے مردوں کا لٹھ کاندھے سے اترتا ہی نہیں۔ خسر صاحب مرحوم نے جواب دیا: مولویت نے کچھ تو انسانیت سکھائی ہو گی۔

بہرحال رشتے تو آسمانوں میں طے ہوتے ہیں، شادی ہونی تھی ہو گئی۔ چونکہ حنفی ہوں اس لئے رفع یدین کی نوبت تو کبھی نہیں آئی لیکن ناخلف بھی نہیں اس لئے

ناک پر غصہ ہمیشہ رہا، اور یہ صرف بیوی کی حکمت عملی تھی کہ بات کبھی اس سے آگے نہ بڑھی ۔ بیوی کو میرا غصہ بھی گوارا نہیں اسی لئے غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد عام طور سے ان کی زبان پر یہ فقرہ آجاتا ہے: "پھڑک اٹھی ناخاندانی رگ ....!"

مصیبت یہ ہے کہ مرد کو غصہ آئے تب تو وہ برا ہے ہی، غصہ نہ آئے تب بھی چین نہیں ۔ عورتیں ہی کہتی ہیں کہ وہ مرد ہی کیا جسے کبھی غصہ نہ آئے ۔

مرد اگر بلی بن جائے تو عورت شیر ہو جاتی ہے اور اگر ہمیشہ شیر بنا رہے تو ازدواجی زندگی کی حلاوت ختم ہو جاتی ہے ۔ اس رشتے کی بنیاد ارشاد الہیٰ کی رو سے مودت ورحمت پر ہے اس لئے اعتدال کی راہ یہ ہے کہ:

درشتی و نرمی بہم در بہ است

چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی دونوں ساتھ ساتھ بہتر ہیں

جیسے جراح، کہ رگ بھی کاٹتا ہے اور مرہم بھی لگاتا ہے)

محبت ورحمت کا پہلو غالب رہنا چاہئے، لیکن یہ نہ ہو کہ کبھی تیوری پر بل بھی نہ آئے ۔

کہتے ہیں ایک اژدھا شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا مرید ہوا ۔ حضرت نے نصیحت فرمائی کہ کسی کو نہ ستانا ۔ مرید فرمانبردار تھا (اور مرید تو عموماً فرمانبردار ہوتے ہی ہیں، اتنے کہ پیر کی بدعت کو بھی رسول کی شریعت پر ترجیح دینے لگتے ہیں) ۔ کہاں تو طنطنہ کا یہ عالم تھا کہ کڑیل جوان بھی دیکھ کر لرز اٹھتے تھے، کہاں یہ عالم ہو گیا کہ بچے تک قریب کھڑے پتھر مارتے ۔ ایک روز پیر صاحب سے عرض کیا کہ آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کے بعد زخموں سے میرا یہ حال ہو گیا ہے ۔ فرمایا: میں نے ستانے سے منع کیا تھا، شوں شاں کرنے سے تو نہ روکا تھا ۔

ازدواجی زندگی کی خوشگواری کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں جو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ "عورت بائیں پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اس سے اس طرح کام لو کہ ٹیڑھی بھی رہے اور کام بھی دے۔ اگر تم نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو ٹوٹ جائے گی، سیدھی نہ ہو گی۔"

خسر صاحب مرحوم نے اپنی بیٹی سے بھی اس کی منشا معلوم کی تھی۔ ایک پرچے پر یہ لکھ کر کہ کیا تمہیں فلاں کے ساتھ رشتہ ازدواج منظور ہے، اپنے صاحبزادے مولانا نذیر الدین صاحب کو دیا تھا کہ اپنی بہن کو دیں اور اس کی منظوری حاصل کریں۔ مولانا نے یہ پرچہ اپنی ہمشیرہ کو دیا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ اس کا جواب لکھ دو۔ بیوی کا بیان ہے کہ پرچہ پڑھ کر میں اسے وہیں پھینک کر چلی آئی تھی۔

شرعاً چونکہ باکرہ کا سکوت بھی رضا کے قائم مقام ہوتا ہے اس لئے منشا معلوم ہو گئی۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں نکاح ہوا اور مارچ ۱۹۴۳ء میں رخصتی۔ ہمارا نکاح سرونج کی مسجد کنگران میں ہوا۔ میرے استاد قاری سید فصیح احمد صاحب نے نکاح پڑھایا۔ جب نائب قاضی نے میرے سسر سے مہر دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: "سوا سو روپئے"۔ میرے والد نے تعجب سے دریافت کیا: کیا فرمایا؟ جواب دیا کہ مہر فاطمی اتنا ہی ہوتا ہے میرے والد نے کہا: قاضی صاحب سوا سو روپے میری طرف سے مزید لکھ لیجئے۔ والد صاحب مرحوم کے تعجب کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے خاندان میں موروثی طور پر سترہ ہزار اور سترہ دینار سرخ مہر ہوا کرتا تھا۔

اس شادی کے وقت صفیہ خاتون کی عمر سولہ سال اور میری عمر بائیس سال تھی۔

رخصتی اس طرح ہوئی کہ بارات کو کھانا کھلا کر رخصت کر دیا گیا، اور بازار سے تانگہ منگوا کر (جو کرائے پر چلا کرتے تھے) اس میں بٹھا دیا گیا، اوپر سے گھر کی چادر ڈال دی گئی اور سسر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی حبیب الدین صاحب مرحوم کے ساتھ شہر کے باہر کے راستے سے دلہن کو سسرال پہنچا دیا۔

خسر صاحب کی صاف گوئی کا تجربہ ہو چکا تھا، اس نے مجھے یہ جرأت دلائی کہ دسمبر میں نکاح کے بعد جب میں جائے ملازمت پر واپس ٹونک جانے لگا تو اپنے خسر صاحب سے کہا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں خط لکھا کروں! فرمایا: نکاح کے بعد وہ شرعاً تمہاری بیوی ہو چکی ہے اس لئے تم اگر اسے خط لکھو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ وہ تمہیں جواب دے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کی تربیت اتنے کٹر ماحول میں ہوئی ہو اس سے جواب کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

مارچ میں رخصتی کے بعد جب سابقہ پڑا تو ان کی خشک فطرت سامنے آئی۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں نے آپ کے والد صاحب سے خط لکھنے کی اجازت طلب کی تھی تو بولیں: اگر اس زمانے میں خط آتا تو بغیر پڑھے چولھے کی نذر کر دیتی۔

ٹونک واپس پہنچ کر بیوی کو خط لکھا۔ لکھنا تو نہ جب آتا تھا، نہ اب، تاہم جیسا کچھ بھی آتا تھا اپنی دانست میں ذہن کی ساری رنگینیاں کاغذ پر منتقل کر دیں۔ جواب کے لئے اپنا پتہ بھی لکھ دیا: "مفتی عدالت شرع شریف ٹونک"۔ شاید یہ وفور جذبات کی مدہوشی تھی کہ پتے میں سب کچھ لکھا "سرونج" لکھنا بھول گیا، جہاں اس لفافے کو پہنچنا تھا۔ چند روز بعد لفافہ واپس آیا، اس طرح کہ چاک کر کے دوبارہ بند کیا گیا تھا اور اوپر لکھنو کے D.L.O. کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس تصور سے بڑی حیا آئی کہ اگر یہ خط پڑھا گیا ہو تو "مفتی عدالت شرع شریف" کے الفاظ سے ان کے ذہن میں کیا تصویر آئی ہو گی اور خط کے مضمون نے اس تصویر کے کیسے پرخچے اڑائے ہوں گے۔

میرا تو اب تک یہ حال ہے کہ:

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از عہد طفلی نہ گشت

(تیری عمر عزیز کے چالیس سال گذر گئے
(لیکن) تیرا مزاج اب تک بچپن سے نہیں پھرا!)

لیکن اس کے برخلاف میری بیوی انتہائی سنجیدہ اور باوقار ہیں اور ابتداً، نہایت کم گو تھیں۔ابتداً، اس لئے کہ شادی کے بعد تقریباً چھ ماہ تک میں نے ان کے منہ سے "ہوں!ہاں!یا نہیں!" کے سوا مشکل ہی سے کوئی بات سنی ہے، اور اب یہ حالت ہے کہ ان کی زبان رک تو جاتی ہے لیکن اس وقت جب انہیں احساس ہو جائے کہ میرے تیور بگڑ رہے ہیں اور بعض مرتبہ تو اس وقت تک نہیں رکتی جب تک غصے میں میری زبان بھی نہ کھل جائے۔جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو چونکہ سمجھ دار عورت ہیں اس لئے خاموش ہو جاتی ہیں کہ بات بڑھ یا بگڑ نہ جائے۔یہ ان کی سنجیدگی، وقار اور کم گوئی ہی کا اثر تھا کہ ابتداً، میرے گھر والے، اعزا، اور ہمسائے انہیں مغرور لڑکی سمجھتے تھے، حالانکہ غرور کا ان کی زندگی میں اب تک بھی کوئی شائبہ نہیں۔

عورتیں یوں بھی مردوں کی نسبت مذہب سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اور جب تربیت کٹر مذہبی ماحول میں ہوئی ہو تو "نیم چڑھا" ہو جانا قدرتی بات ہے۔ایسی صورت میں شرعی اعذار کے سوا نماز، روزہ، حتیٰ کہ خاص خاص مواقع کے نفلی روزے تک چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پردے کی سختی سے پابند رہیں۔شادی سے قبل جس کا چچا زاد بھائیوں تک سے پردہ ہو وہ پردے کے معاملے میں سخت کیوں نہ ہو گی، البتہ جب سے نگاہیں کمزور ہوئیں آنکھوں کا حصہ کھلا رہتا ہے۔لیکن قاہرہ، استنبول اور خاص طور پر امریکہ کے سفر میں یہ پردہ بہت ڈھیلا ہو گیا اور پورا چہرہ کھلنے لگا، اور امریکہ میں برقع کی جگہ کبھی کبھی صرف لمبے کوٹ پر اکتفا کیا۔

ان کے مزاج میں بڑا اعتدال ہے....مال کے بارے میں نہیں، صرف اخلاق کی حد تک۔دوسروں سے اس طرح پیش آتی ہیں کہ مشکل ہی سے کسی کو ان سے شکایت ہو پاتی ہے۔ساس، بہو اور نند بھاوج کی روایتی چشمک کسی سے مخفی نہیں، لیکن شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ساس صدقے قربان ہونے لگیں اور نندوں نے سر آنکھوں

پر بٹھانا شروع کر دیا۔ ہر ایک کی خدمت اور کام میں پیش قدمی کی وجہ سے عملاً گویا سب کی محکوم تھیں اور اسی بنا پر گویا سب کے دلوں کی حاکم۔ ساس کے انتقال کو تو مدت گذری لیکن نندیں اب تک بھابی جان کا کلمہ پڑھتی ہیں۔ ان کے اور میرے اعزہ میں سے بعض مرد بھی، جو رشتے میں مجھ سے چھوٹے ہیں اور مجھ سے بات کرتے جھجکتے ہیں، گھنٹوں ان کے سامنے اپنے دکھ درد بیان کرتے رہتے ہیں اور وہ سب کی سنتی اور مناسب مشورے دیتی رہتی ہیں۔ اور چھوٹوں پر ان کا اتنا اثر ہے کہ اگر ان سے وہ کوئی بات کہہ دیں تو مشکل ہی سے ٹلتی ہے۔ البتہ اولاد کبھی کبھی ان کی بات ٹال جاتی ہے

ان کے وقار کی حالت بھی عجیب ہے کہ اس میں موقع اور محل کا لحاظ ہوتا ہے۔ جب ہم ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں حج کو گئے تو منیٰ میں قیام کے دوران خیال ہوا کہ ظہر کی نماز مسجد خیف میں پڑھی جائے۔ مسجد میں پہنچے تو اہلیہ نے کہا کہ مجھے تو بیت الخلا جانے کی حاجت ہے (کچھ پیچش کی شکایت تھی)۔ فراغت کے بعد چونکہ ازدحام بڑھ چکا تھا اور دروازے سے داخل ہونا مشکل تھا اس لئے میں نے کہا کہ اب تو مسجد میں داخل ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ آپ جالیاں پکڑتی ہوئی بند دروازے پر چڑھ جائیں اور جالیوں ہی کے سہارے دوسری سمت اتر جائیں۔ دوروازہ تقریباً دو قد آدم بلند تھا۔ وہ بے تکلف جالیاں پکڑتی ہوئی چڑھیں اور دوسری طرف اتر گئیں اور اسے وقار کے خلاف نہ سمجھا۔ اس کے برخلاف جس زمانے میں میرے پاس پچھلیس موٹر سائیکل تھی، میں نے بارہا چاہا کہ وہ سردیوں کی رات کے سناٹے میں ہی، جبکہ یونیورسٹی (کراچی یونیورسٹی کیمپس، جہاں میری رہائش تھی) کی سڑکیں رات گئے بالکل سونی ہو جاتی ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، صرف ایک بار پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ جائیں، لیکن میری یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کچھ اس طرح کی بنائی ہے کہ اس کی تمنائیں عام

طور پر اس کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہیں۔ جسے سائیکل بھی نصیب نہ ہو وہ عموماً موٹر کی تمنا نہیں کرتا۔ میں جب ہندوستان سے کراچی آ کر ابتداً ۱۲۵ ر روپے ماہوار کا ملازم ہوا تو بچت کی خاطر سائیکل پر گھومتا تھا۔ جب تجربے نے بتایا کہ کراچی جیسے شہر میں سائیکل چلانا کافی خطرناک ہے تو بسوں میں بے بسی اختیار کر لی۔ حیثیت بڑھی تو بسوں کی سواری شان کے خلاف محسوس ہونے لگی اور موٹر سائیکل خرید لی اور جب کراچی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو جانے کے بعد موٹر سائیکل میں بھی کسر شان محسوس ہونے لگی تو موٹر کی تمنا دل میں کروٹیں لینے لگی۔ بیوی سے بارہا اس تمنا کا ذکر کیا اور انہوں نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا گھبرایئے نہیں، ابھی تو پیروں میں چلنے پھرنے کی سکت ہے، جب یہ نہیں رہے گی تو اللہ موٹر بھی دے دے گا، اور واقعتہً یہی ہوا۔ میرے ساتھ نہیں بلکہ ان کے ساتھ کہ گھٹنے میں چوٹ آجانے کی وجہ سے جب ان کے پیروں کی توانائی کمزور پڑ گئی تو اللہ نے موٹر بھی دے دی، وہ بھی اس طرح کہ تین بیٹوں کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں ہیں اور میرے پاس دو گاڑیاں؛ ایک مکہ مکرمہ میں اور دوسری کراچی میں۔

میں نے پوری زندگی میں ایک بار بھی ہنسی میں اپنی بیوی کی آواز بلند ہوتے نہیں سنی۔ بارہا گھر میں قہقہے بلند ہوئے لیکن ایسے مواقع پر ہمیشہ دیکھا کہ بیوی نے دوپٹہ منہ میں لے لیا، پورا بدن ہل رہا ہے، پیٹ میں بل پڑ رہے ہیں لیکن مجال ہے کہ آواز بلند ہو جائے۔

میں نے کبھی انہیں نہ اپنے بچوں کو پیار کرتے دیکھا اور نہ انہیں "بیٹا، بیٹی" کہہ کر مخاطب کرتے سنا۔ اولاد سے کس ماں کو محبت نہیں ہوتی لیکن بیوی کا سلوک بچوں کے ساتھ یہ رہا کہ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے ان کے رویے میں سختی آتی گئی اور اتنی کہ اجنبی دیکھ کر سوتیلی اولاد کا شبہ کرے۔ بچوں کے ساتھ سختی کا عمل کب سے شروع ہو جاتا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے ہوگا۔

میری بڑی بچی نجمہ خاتون اپنے دادا سے بہت مانوس تھی۔ تقریباً ایک سال کی تھی کہ مجھے ملازمت کے سلسلے میں دوجانہ جانا پڑا۔ بیوی بھی ہمراہ تھیں۔ والد صاحب مرحوم گنج باسودہ اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ جب ٹرین کی روانگی کا وقت آیا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے نجمہ کو اپنی بہو کی گود میں دیا کہ جا بیٹی تجھے قصائی کے حوالے کر رہا ہوں۔

دوجانہ کا سفر پہلا ریل کا سفر تھا جو بیوی نے میرے ساتھ کیا۔ جب میں ایک اسٹیشن پر اتر کر زنانہ ڈبے تک گیا کہ شاید کوئی ضرورت ہو تو واپس آجانے پر ایک عورت نے بیوی سے پوچھا تمہارے ابا ہیں؟ جواب دیا نہیں۔ سسر ہیں؟ نہیں۔ شوہر ہیں؟ ہاں۔ دوسری شادی ہوگی اور اس پر بھی جب بیوی مسکرادیں تب وہ سمجھیں کہ میں پہلا شوہر ہوں۔

دوجانہ کے سفر کے بعد بارہا ریل کا سفر پیش آیا اور ہمیشہ یہی ہوا کہ میری بیوی اور دوسری عورتوں کے درمیان اسی سے ملتے جلتے سوالات اور جوابات کا تبادلہ ہوا۔

دوسروں کی عمریوں بھی زیادہ نظر آتی ہے اور جب چہرے پر لمبی ڈاڑھی ہو، خواہ سیاہ ہی ہو، تو عمر کا دس پانچ سال زیادہ سمجھ لیا جانا معمولی بات ہے۔ اور ادھر یہ حال ہے کہ بالوں کی سیاہی اور درازی، دانتوں کی مضبوطی بیوی کو اپنی ماں سے وراثت میں ملی ہیں۔

اور جوانی کی انتہا سے پہلے سفیدی کی ابتدا اور چالیس سال کے اختتام سے قبل دانتوں کا سقوط شروع ہو جانا میری خاندانی میراث ہے۔

پھر اگر عورتیں ہر مرحلے پر غلط فہمی کا شکار ہوئیں تو ان کا کیا دوش۔

دانتوں کے سقوط پر ایک شعر یاد آیا:

دندان من شکست اجل خندہ کرد و گفت
خوش رخنہ فتاد بہ دیوار زندگی

(میرا دانت ٹوٹا تو موت نے ہنس کر کہا
زندگی کی دیوار میں اچھا رخنہ پڑا!)

دانت کا گرنا پہلی گجر ہے جس کے ذریعے موت یہ اعلان کرتی ہے کہ "اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں" لیکن دلوں پر جب غفلت کے پردے پڑے ہوں تو انسان اس اشارے سے کیا چونکے، نقاروں کی چوٹ بھی اسے نہیں جگا پاتی۔

ایک بزرگ کسی کچی کوٹھری میں رہتے تھے۔ دیوار میں جب شکستگی کے آثار نمودار ہوئے تو انہوں نے کوٹھری کو مخاطب کرکے کہا کہ: جان بچانا چونکہ فرض ہے اس لئے میں تجھ سے درخواست کر رہا ہوں کہ جب تو گرنے لگے تو مجھے خبردار کر دینا۔ دیوار کی مٹی وقتاً فوقتاً جھڑتی رہی اور ہر بار وہ اس میں گوندے لگاتے رہے۔ آخر ایک روز کوٹھری دھم سے گری اور بزرگ زخمی ہو گئے۔ کوٹھری کو مخاطب کرکے بولے: خدا کی بندی، میں نے تو پہلے سے خبردار کرنے کی درخواست کی تھی۔ کوٹھری نے جواب دیا میں نے تو کئی بار تمہیں خبردار کرنے کے لئے منہ کھولا لیکن ہر بار تم نے میرا منہ مٹی سے بند کر دیا۔

بات کہاں پہنچ گئی، ذکر تو بیوی کا تھا۔ سوچتا ہوں کہ اب اگر ریل کا سفر پیش آئے تو شاید پوچھنے والیاں یہ پوچھیں کہ کیا تمہارے دادا ہیں؟ کیونکہ ادھر بگلا بھگت ادھر کالی کوئل (بالوں کی حد تک) یہاں سیاہی برائے نام، وہاں سفیدی برائے نام، اس پر بھی خضاب کا نقاب۔ یہاں منہ میں بتیسی پڑی ہوئی، وہاں ہر دانت مضبوط۔ ہوسکتا ہے کہ اب کسی کے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا تمہارے شوہر ہیں، اظہار حقیقت سے بھی شرما جائیں، حالانکہ عمر میں مجھ سے صرف چھ سال چھوٹی ہیں۔

سندھ یونیورسٹی سے کراچی یونیورسٹی میں تقرر ہوا اور جب یونیورسٹی کیمپس میں مکان بھی مل گیا تو بچوں کو بھی حیدر آباد سے لے آیا۔ ایک پڑوسن رقیہ بیگم، جو اب بھی شعبہ، نباتیات (Botany) میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، ملنے کے لئے آئیں

اور چند گھنٹے بعد دوبارہ آئیں اور ڈاکٹر عابد علی خان صاحب کی بیگم صاحبہ کو بھی ساتھ لائیں۔ بیوی اس وقت نچلی منزل میں موجود تھیں۔ بیگم عابد صاحبہ نے بیوی کو دیکھ کر رقیہ بیگم سے کہا کہ ان کی امی کو تو بلاؤ۔ رقیہ بیگم جو بڑی خندہ رو اور خوش مزاج خاتون ہیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں، بیوی مسکرا کر رہ گئیں اور بیگم عابد صاحبہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ ساجدہ کے ساتھ ملک عبدالعزیز ہسپتال گئیں۔ مصری نرس نے پہلے کارڈ پر کیا۔ ساجدہ چونکہ عربی جانتی ہے اس لئے وہ جواب دے رہی تھی۔ عمر دریافت کی تو ساجدہ نے کہا ۵۵ سال۔ جب انجکشن کی باری آئی تو نرس نے دریافت کیا: کہاں ہیں وہ خاتون؟ ساجدہ نے اپنی والدہ کی طرف اشارہ کیا۔ نرس نے تعجب سے کہا: ان کی عمر ۵۵ سال ہے؟

میری بڑی بچی نجمہ جب جوان ہو گئی اور اس نے قامت و جسامت میں ماں کو پیچھے چھوڑ دیا تو اجنبی دیکھنے والیاں دونوں کو بہنیں سمجھتی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ نجمہ کو بڑی اور بیوی کو چھوٹی۔ ایک صاحب کی غلط فہمی جب بیوی نے یہ کہہ کر دور کی کہ بیٹی ہے، تو کہنے لگیں: بڑی کی ہو گی، اس کو بھی اپنی ہی کہتے ہیں۔

بغیر بتائے پاکستان بھاگ آنے کے تقریباً چھ ماہ بعد میں نے بیوی کو ایک صاحب کے خاندان کے ہمراہ پاکستان بلوایا۔ استقبال کے لئے کھوکھراپار گیا۔ جس دن توقع تھی نہ پہنچیں، چنانچہ اگلی ٹرین کے انتظار میں ایک ہفتہ وہیں قیام کرنا پڑا۔ کراچی سے کھوکھراپار تک کا سفر، کھوکھراپار کے ریگستان میں جہاں ریت کے جھکڑ چلتے تھے، بے آرامی کے ساتھ ایک ہفتے کا قیام اور پھر پیدل سرحد تک جانا، چہرے پر ہوائیاں، کپڑوں پر میل کی تہہ، تیل کے بغیر بکھرے ہوئے گرد آلود بال کہ ایسی حالت میں سفیدی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ بیوی نے بچپن سے اپنے والد کو مہندی اور وسمہ کا خضاب کرتے دیکھا تھا، میری سفیدی دیکھی تو بولیں: اتنی جلدی سفیدی

کیے آگئی؟آپ خضاب کیوں نہیں لگاتے؟اور ان کی یہ بات میرے دل میں چبھ گئی کہ میری سفیدی بیوی کو کھٹکنے لگی۔ کراچی پہنچتے ہی خضاب خرید ااور موسیاہی شروع کر دی جو کبھی کبھی حدود سے تجاوز کر کے روسیاہی کی نوبت بھی لے آتی تھی۔

اواخر ۱۹۷۰ء میں جب ہم دونوں حج پر آئے تو میں نے بالوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ بیوی کو احساس ہوا تو بولیں: کیا خضاب چھوڑ دیا؟ہاں! میں نے جواب دیا۔ کہنے لگیں: کیا خضاب لگانا گناہ ہے؟میں نے کہا کہ بیوی جوان ہو تو گناہ نہیں (سیاہ خضاب) لیکن اب آپ جوانی کا کھنڈر تو ہیں، جوان نہیں، اور میں بھی اب خدا کے دربار میں پہنچ کر اس منزل میں داخل ہونا چاہتا ہوں جب خدا بھی بندے کی سفیدی دیکھ کر شرماتا ہے۔ اس کے بعد سے آج تک خضاب نہیں لگایا۔

۱۹۷۰ء میں حج پر آئے تو صرف میں نے حج کی درخواست دی تھی اور جب قرعہ میں نام نہ آیا تو دوڑ دھوپ شروع کر دی اور یہ تگ ودو کامیاب رہی۔ اپنی کامیابی کے بعد خیال آیا کہ کیوں نہ بیوی کو بھی ساتھ لیا جائے۔ میں نے کہا آپ بھی ساتھ چلئے نا۔ بولیں: ضرور ضرور! میں نے جب دوبارہ سنجیدگی سے کہا تو جواب دیا: کیسی باتیں کر رہے ہیں! پیسے ہیں؟میں نے کہا پیسے ہوں یا نہ ہوں آپ تیار ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے اپنے برادر نسبتی سعید الدین فاروقی مرحوم کے برادر نسبتی اجمل صاحب کو انگلینڈ خط لکھا کہ اس ضرورت کے لئے دو ہزار روپے قرض چاہئیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، فوراً چیک بھیج دیا (اس زمانے میں بحری جہاز کا آمدورفت کا ٹکٹ ۔/ ۱۵۴۰ روپے تھا۔) اس عرصے میں بیوی کے لئے کوشش کرتا رہا۔ ایک روز بڑی مشکل سے ابراہیم صاحب انجنیئر کے کمرے میں پہنچا اور عرض مدعا کیا۔ فرمایا: اب جہاز میں کوئی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا: میں یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں اور ہمارے پاس حرام کی کمائی کی کوئی گنجائش نہیں کہ جب بھی ارادہ ہو حج کر سکیں۔ اس مرتبہ میں تو جا ہی رہا ہوں، بیوی بھی ساتھ جائیں تو مصارف زیادہ نہ ہوں گے، ورنہ ان کو ساتھ لے کر حج

کرنا دوبارہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا دل نرم کر دیا اور انہوں نے منظوری دے دی۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے یا بصورت دیگر مغفرت فرمائے۔

میں خوش خوش گھر آیا تو دیکھا کہ بیوی غسل خانے میں کپڑے دھو رہی ہیں۔ میں نے بلند آواز سے کہا کہ مبارک ہو، آپ کے لئے بھی منظوری ہو گئی۔ توقع کے خلاف صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ انہیں غیر معمولی مسرت کیوں نہ ہوئی۔ پوچھا تو جواب دیا: میں نے رات ہی کو خواب میں دیکھ لیا تھا کہ میں ساتھ جا رہی ہوں اور اسی لئے کپڑے دھونے بیٹھی ہوں۔

پہلے حج پر آکر ایسی دعا مانگی کہ اللہ میاں نے کچھ عرصے بعد ہی ملازمت کے لئے مجھے یہاں بھیج دیا۔

مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ انہیں خانہ کعبہ کے اندر داخلے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اللہ کا شکر ہے بعد میں یہ سعادت مجھے بھی نصیب ہو گئی۔

میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی کہ جو کمایا لا کر بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بیوی کا یہ معمول رہا کہ جب بھی انہیں تنخواہ دی، عام طور پر انہوں نے یہی کہا کہ اپنے پاس ہی رکھئے اور ایک مرتبہ تو انہوں نے رو کر کہا کہ خدا کے لئے پیسے اپنے پاس ہی رکھا کیجئے۔ کیونکہ تنخواہ انہیں دے کر میں تو کسی حد تک اپنی فکر ایک ہی وقت میں ان کی طرف منتقل کر دیا کرتا تھا لیکن ان کے دماغ پر ایک مہینے تک بوجھ سوار رہتا تھا۔ اور مہینے تو میں نے یوں ہی کہہ دیا ورنہ سچ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پہلے ہفتہ ہی میں تنخواہ ٹھکانے لگ جاتی تھی اور پھر قرض کا سلسلہ چل پڑتا تھا۔ کسی نے کہا ہے: پہلا ہفتہ خوشی خوشی، دوسرا ہفتہ راضی خوشی، تیسرا ہفتہ کشا کشی، چوتھا ہفتہ فاقہ کشی۔ ہماری زندگی تقریباً اسی کا مصداق تھی۔ تقریباً اس لئے کہ فاقہ کشی کی نوبت کبھی نہ آئی، اور پہلے تین ہفتوں کی جگہ اگر تین دن فرض کر لیں تو حقیقت سے زیادہ قریب ہو جائے۔

میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی کہ حسب حیثیت مستحق اعزا۔ کی مدد کرتا رہا۔

سعودیہ کی ملازمت کے بعد جب اللہ نے تصور سے زیادہ دیا تو میں نے پاکستان اور ہندوستان کے مستحق اعزا، کے ماہانہ وظائف مقرر کر دیئے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس طرح کے بیش تر اعزا، کا تعلق میرے خاندان سے تھا، لیکن بیوی کی زبان سے کبھی ایک بار بھی یہ نہ نکلا کہ آپ اپنے عزیزوں کو بھرتے جاتے ہیں، بلکہ اس صلہ۔ رحم پر ہمیشہ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

میری بیوی نے ہمیشہ میرا اتنا خیال رکھا ہے کہ ادھر میرے منہ سے کوئی بات نکلی ادھر اس کی تعمیل ہوئی۔ ایک صاحب جو میرے دوست کم اور بزرگ زیادہ تھے اور جو اپنی بیوی کے سوا سب کے سامنے شیر تھے، ان کا معمول تھا کہ کراچی یونیورسٹی کیمپس میں روزانہ مغرب کے بعد غریب خانے پر تشریف لے آتے تھے۔ ایک دن حسب معمول تشریف لائے اور جب چائے آنے کا وقت ہوا تو میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب اس وقت تو پکوڑے ہوتے تو بڑا مزہ دیتے۔ ایک بچہ قریب کھڑا تھا، اس نے جاکر ماں سے کہہ دیا اور تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ دیکھا چائے بھی آرہی ہے اور گرما گرم پکوڑے بھی۔ فرمانے لگے: میاں تم نے اپنی بیگم کو کتنا دبا کر رکھا ہے کہ ادھر منہ سے بات نکلی اور اُدھر اس کی تعمیل ہوئی میں نے جواب دیا: ڈاکٹر صاحب، جو فطری طور پر نوکرانیوں کا مزاج لے کر پیدا ہوئی ہو اسے دبا کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے، چلتے بیل کو آر کون لگاتا ہے۔

میرا ہمیشہ یہ حال رہا کہ "نو کھائیں تیرہ کی بھوک" ایسے شخص سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ذاتی مکان بناسکے۔ لیکن سعودیہ آنے کے چند سال بعد بیوی نے تقاضا شروع کر دیا کہ سر چھپانے کے لئے اپنا جھونپڑا ہونا چاہیئے۔ مسلسل ضد کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر چھپانے کے لئے جھونپڑا تیار ہو گیا، لیکن کراچی کے گلشن اقبال میں چار سو گز پر یہ جھونپڑا (بی۔۴۲، بلاک۔۱۳) تقریباً ساڑھے آٹھ لاکھ میں تیار ہوا۔

میں نے کہا، اب یہ جھونپڑا آپ اپنے مہر میں قبول کر لیں، بولیں کہ آپ کا جو کچھ

ہے وہ تو میرا ہی ہے، مہر معاف کر کے میں مزید ثواب کیوں نہ لوں ۔ بہرحال یہ مکان میں نے بچوں کو گواہ بنا کر انہیں ہبہ کر دیا۔

غالباً ۱۹۹۰ء میں سرونج کی ایک رنڈی "گوہر" جو تقریباً میری ہی ہم عمر یا مجھ سے کچھ چھوٹی ہوگی، حج کے لئے آئی ۔ ایک متوسط درجہ کے قصبہ کی رنڈی کو کون نہیں جانتا، بیوی بھی اس کے نام سے واقف تھیں ۔ جس گروپ میں وہ آئی تھی اس میں میری بیوی کا حقیقی بھانجا فرید احمد اور اس کے کچھ سسرالی رشتہ دار بھی تھے اور مکہ مکرمہ میں سب کا قیام ایک ہی مکان میں تھا۔

فرید اور اس کے رشتہ داروں کو تو مجھے گھر پر مدعو کرنا ہی تھا لیکن میں اس پس وپیش میں مبتلا رہا کہ گوہر کو بھی مدعو کروں یا نہیں ۔ اپنی اس الجھن کا ذکر میں نے بیوی سے کیا کہ گوہر کو اپنے گھر پر بلانے کی ہمت نہیں ہو رہی ۔ بیوی نے جواب دیا کہ آپ کا گھر اللہ کے گھر سے بھی زیادہ مقدس ہو گیا کہ اللہ نے تو اسے اپنے گھر بلا لیا لیکن آپ کو اسے اپنے گھر بلانے میں شرم آ رہی ہے ۔ بیوی کے اس جواب پر مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ اتنی کٹر مذہبی عورت کے قلب کی یہ وسعت کہ انہیں ...... کے بعد حج پر آنے والی ملی کو اپنے گھر پر مدعو کرنے میں کوئی باک نہیں ۔ لیکن میری تنگ ظرفی کہ اس کے باوجود میں اسے گھر پر بلانے کی جرأت نہ کر سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة" (نیک عورت دنیا کی سب سے بہتر متاع ہے) ۔ مجھ ناکارہ پر اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار احسانات ہیں ان میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے دنیا کی سب سے بڑی نعمت یعنی اچھی اور نیک بیوی عطا فرمائی ہے۔

میں اپنی بیوی کی نیکی اور دینداری سے کتنا متاثر ہوں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں حج کے موقع پر طواف کرتے ہوئے میں نے رو کر اپنی بیوی سے کہا کہ آپ جنت میں جائیں تو خدا کے لئے مجھے نہ بھول جائیں۔

میں نے اپنے خاندان میں اور متوسط درجے کے جن شریف گھرانوں سے میرا سابقہ رہا اُن میں بھی یہی دیکھا کہ عام طور پر شوہر بیویوں کو "تم" کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں اور بیویاں شوہروں کو "آپ" کے لفظ سے۔ میں اپنی بیوی کو "آپ" کے لفظ سے مخاطب کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں اتا کہ اگر بیوی کو بھی اپنے برابر عزت دے دی جائے تو اس میں مضائقہ کیا ہے!

بلاشبہ قرآنِ کریم کی رُو سے مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فوقیت حاصل ہے۔ لیکن تخاطب میں مساوات سے اس فوقیت میں کیا فرق آجاتا ہے۔ عربی زبان میں فرد کے تخاطب کے لئے صرف ایک لفظ ہے "انت"۔ مذکر اور مونث میں تفریق کے لئے "ت" کی حرکت میں فرق کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواجِ مطہرات کے مابین بھی اسی ایک لفظ سے تخاطب ہوتا تھا۔ اور انگریزی میں تو لفظ "You" نے حرکت کا فرق بھی مٹا دیا ہے۔ ذات پات کی بے جا تقسیم اور اس کے نتیجے میں عزت اور ذلت کے خود ساختہ غلط معیار کا یہ بدبختی اثر ہے کہ اُردو میں بھی تخاطب کے لئے تین تین الفاظ موجود ہیں: تو، تم اور آپ۔

بیوی کی اطاعت شعاری اور دین داری کی وجہ سے اُن کی جو قدر و منزلت میرے دل میں ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ میں نے انہیں اعتدال کے ساتھ بیوی ہی کے درجے میں رکھا ہے، کبھی انہیں اتنا سر نہیں چڑھایا کہ مجھ پر "زن مرید" کا محاورہ صادق آسکے۔

جی چاہتا ہے کہ آخر میں بیوی کے کچھ عیوب کا ذکر بھی کر دوں۔

اُن کا سب سے بڑا غیر اختیاری عیب یہ ہے کہ وہ عورت ہیں اور عورت کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کی جانب منسوب یہ قول موجود ہے کہ: "المرأة شر كلها، و شر ما فيها أنه لا بد منها" (عورت تمام تر برائی ہے اور اس کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔)

اُن کا دوسرا اختیاری عیب یہ ہے (جس سے حضرت حوا کی شاید ہی کوئی بیٹی مبرا ہو) کہ وہ اپنا عیب اور میرا ہنر مشکل سے تسلیم کرتی ہیں اور اگر تسلیم کرنے پر اصرار کیا جائے تو

اپنے عیب پر چراغ پا ہو جاتی ہیں اور میرے ہنر کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔

اس وقت بھی جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، تنک کر بولیں: ہاں جی، جو آپ کہیں وہی صحیح ہے، مگر اپنے عیب بھی تو لکھیے۔ میں نے کہا، تسلی رکھیں وہ بھی لکھوں گا، کہنے لگیں: وہ سب باتیں لکھیں جو میں بتاتی جاؤں۔ میں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ قلم میرے ہاتھ میں ہے۔

سوچتا ہوں کہ اگر قلم اُن کے ہاتھ میں ہوتا تو اپنی کیا دُرگت بنتی۔ وہی کہ ایک شیر اور ایک آدمی ساتھ جا رہے تھے۔ دیوار پر ایک تصویر دیکھی جس میں آدمی شیر کا جبڑا چیر رہا تھا ویسی ہی جیسی جاپان کی مشہور دوا اوساکا کے بورڈ میں بنی ہوتی تھی۔ آدمی نے شیر سے کہا دیکھی انسان کی قوت! شیر نے جواب دیا: یہ تصویر کسی شیر نے بنائی ہوتی تو معاملہ برعکس ہوتا۔

عورتیں شوہروں کی خوبیاں مشکل ہی سے تسلیم کرتی ہیں۔ شاید یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ ازواج مطہرات بیک زبان آپ کی ثنا خواں ہیں۔

بہت مشہور قصہ ہے کہ ایک عورت نے کسی بزرگ کو ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھا۔ شوہر آئے تو اُن سے ذکر کیا۔ شوہر نے کہا: اچھا کل پھر اسی وقت انہیں دیکھنا اور پہچاننے کی کوشش کرنا۔ دوسرے روز بیوی نے پھر دیکھا لیکن پہچان نہ سکی۔ شوہر سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا: خدا کی بندی وہ میں ہی تو تھا۔ بولی: اچھا، جب ہی تم ٹیڑھے اُڑ رہے تھے۔

بیوی کا ذکر طویل ہو گیا، لیکن ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'' (قصہ لذیذ تھا اس لئے میں نے بہت دراز کر کے بیان کیا۔)

اب بیوی کی تمنا یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں رہیں اور جنت المعلاۃ ہی میں دفن ہوں۔ تمنا میری بھی یہی ہے، دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے۔

باب دوم

تعلیم، دیگر مشاغل اور شوق

طلبِ علم

مکتب

میری بسم اللہ کس نے کرائی اس کے بارے میں نہ تو مجھے کچھ یاد ہے اور نہ میں نے والد صاحب مرحوم سے اس سلسلہ میں کچھ سنا۔ مکہ مکرمہ کی جامعہ ام القریٰ کی ملازمت کے دوران جب ۱۹۷۹ء میں میرا سرونج جانا ہوا تو حضرت مفتی عبدالمجید صاحب مرحوم کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت مفتی صاحب کی بینائی رخصت ہو چکی تھی اور حافظہ بھی جواب دے چکا تھا، ایک ایک بات کو بار بار دہراتے تھے۔ فرمایا: بیٹا بقا! اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے، جب تو چھوٹا سا تھا اس وقت منشی جی (میرے والد صاحب مرحوم) تجھے میرے پاس لائے تھے کہ اس کی بسم اللہ کرادو۔ بیٹا بقا، اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے۔ اس بات کو ایک ہی مجلس میں بار بار دہرایا۔

میری ابتدائی تعلیم منشی محمد اسماعیل خاں مرحوم کے مکتب میں ہوئی۔ سرونج میں دو استاد بڑے صاحبِ فیض تھے۔ ایک مرزا سکندر بیگ صاحب، دوسرے منشی اسماعیل خاں صاحب۔ دونوں خوش نویس تھے۔ اور انہی دونوں بزرگوں کا فیض تھا کہ سرونج والوں کا خط اچھا ہوتا تھا۔ یہ بات ٹونک میں بھی مشہور تھی۔

منشی اسماعیل خاں صاحب مرحوم اس پرانے دور کے استاد تھے جب زدو کوب کو تعلیم کا لازمی جز شمار کیا جاتا تھا اور ذہنوں میں یہ خیال راسخ تھا کہ مار کے بغیر نہ علم آتا ہے نہ ادب۔ نتیجہ یہ تھا کہ بچے کمسنی ہی سے دوہری مصیبت میں مبتلا رہتے تھے۔ گھر پر باپ کی مار اور مکتب میں استاد کی۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مار کے بغیر علم تو آجاتا ہے لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ بچے کو مشرقی اور اسلامی آداب بھی آجائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ حکم دیا ہے کہ دس سال کا ہو جانے پر بھی اگر بچہ نماز نہ پڑھے تو اسے مار کر نماز کا عادی بنایا جائے۔ البتہ اگر بچے کو یورپ یا امریکہ کے ماحول کے مطابق اخلاق کے اس سانچے میں ڈھالنا ہو کہ ہوش سنبھالتے ہی بچے اپنی روزی آپ کمائیں، اپنے شوہر اور بیویاں بھی خود تلاش کریں اور اپنی دنیا الگ بسا لینے کے بعد صرف یوم پدر اور یوم مادر یا کرسمس کے مواقع پر ماں باپ کے پاس آکر انہیں کوئی حقیر سا تحفہ پیش کر دیں یا صرف کارڈ بھیجنے پر اکتفا کر لیں، اس کے علاوہ ماں، باپ سے کوئی تعلق نہ ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بچے کو بچپن میں ہاتھ بھی نہ لگایا جائے۔

بہر حال میں نے اپنے والد صاحب مرحوم سے سنا کہ انہوں نے مجھے یہ کہہ کر منشی اسماعیل خاں صاحب کے حوالے کیا تھا کہ "ہڈی ہڈی ہماری، چمڑا اور گوشت آپ کا۔"

میں نے مرحوم سے قرآن شریف پڑھا اور اردو کی ابتدائی کتابیں بھی۔

منشی صاحب مرحوم مجھ پر نسبتہً زیادہ شفیق تھے اسی لئے جب قرآن خوانی کے لئے مکتب کے طلبہ کو کہیں بھیجا جاتا تو منشی صاحب مجھے نہیں بھیجتے تھے اور جب طلبہ چنے اور بتاشے لیکر لوٹتے تو سب سے مجھے حصہ دلاتے۔

منشی صاحب مرحوم قسم کھا کر فرماتے تھے کہ اس کا (میرا) خط کبھی اچھا نہ ہو گا اس کی حالت تو یہ ہے کہ ادھر الف پر قلم رکھا، ادھری پر پہنچ گیا۔ ان کی اس قسم کی وجہ سے جوانی میں مجھے اپنا خط درست کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑی اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے خط کو کوئی شخص برا نہیں کہہ سکتا۔

میرے ایک استاد حکیم علی حسین صاحب مرحوم بھی تھے جو مجھے گھر پر پڑھانے آتے تھے۔

اسکول:

چونکہ منشی اسماعیل خان صاحب مرحوم اپنے مکتب کے ساتھ ساتھ اسکول میں بھی پڑھاتے تھے، اس لئے جب مکتب کی تعلیم ختم ہوئی تو شاید انہی کی وجہ سے مجھے سرونج کے اسکول میں داخل کر دیا گیا، جس میں صرف چھٹی جماعت تک تعلیم تھی۔ وہاں مجھے دو ہندو اساتذہ کی شاگردی نصیب ہوئی۔ پنڈت شیونرائن جو ہیڈ ماسٹر تھے اور دڈا جو سیکنڈ ماسٹر تھے اور ذات کے کائستھ تھے۔ دڈا کا نام مجھے نہیں معلوم، بڑے چھوٹے سب انہیں دڈا ہی کہا کرتے تھے۔

یہ بات تو نہ تھی کہ ذہن یا حافظہ خراب ہو لیکن مزاج میں شرارت اور کھیل کود کی طرف رغبت شروع سے تھی۔ گھر پر کتاب اٹھا کر دیکھنا حرام تھا، سبق کیسے یاد ہوتا اور سبق یاد نہ ہوتا تو استاد رحم کیوں کرتا۔ یہ روز روز پٹنے کا اثر تھا کہ میں اسکول سے فرار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ یہ عادت پختہ ہو گئی۔

اسکول میں چھٹی جماعت تک تعلیم کا یہ ڈگر رہا کہ اسکول یا گھر کی پٹائی میری بھاگنے کی عادت میں فرق نہ ڈال سکی۔ ہر سال میں فیل ہوتا اور ہر سال والد صاحب کی سفارش پر ترقی مل جاتی۔

خدا خدا کر کے اسکول کا مرحلہ ختم ہوا۔ اگر اس میں ساتویں جماعت ہوتی تو اس میں بھی ترقی مل جاتی۔

مجھ جیسے لڑکے کو جو باپ کی نگرانی اور غیر معمولی سختی کے باوجود پڑھ کر نہ دیتا ہو، تعلیم کے لئے کوروائی یا بھوپال (جہاں ہائی اسکول تھے) بھیجنے کا سوال ہی نہ تھا کہ اور بھی شتر بے مہار ہو جاتا اور عمر اس لائق بھی نہ تھی کہ سپاہی یا ناکیدار یا پٹواری بنا دیا جاتا جیسا کہ میرے بڑے دو بھائیوں کے ساتھ ہوا، اس لئے والد صاحب مرحوم نے مجھے مجبوراً عربی پڑھنے کے لئے سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس میں داخل کر دیا۔

اب جب کہ عمر کے آخری مرحلہ میں ہوں اور علم میں انہماک کا یہ حال ہے کہ برسوں سے تصنیف و تالیف کا مشغلہ ہے، سوچتا ہوں کہ میری تعلیم کی ابتدا اس درجہ بدشوقی سے کیوں ہوئی ۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسکول میں داخل کر کے مجھے غلط رخ پر ڈال دیا گیا تھا، میری تعلیم کا صحیح رخ دینی تعلیم تھا ۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسکول کی تعلیم کی طرف سے مجھ میں انتہا درجہ کی بدشوقی پیدا فرمادی ۔

ریاض المدارس:

دینی تعلیم کا یہ مدرسہ منشی بشیر الدین صاحب مرحوم پیروکار (کورٹ انسپکٹر) پولیس نے قائم کیا تھا اور وفات کے وقت تک وہی اس کے مہتمم بھی رہے ۔ انہی بشیر الدین مرحوم کی صاحبزادی سے، بعد میں، میری شادی ہوئی ۔

ریاض المدارس میں تدریس کے لئے مرحوم نے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے دو اساتذہ طلب فرمائے تھے اس کے نتیجے میں مولانا محمود الحسن صاحب گیاوی اور قاری سید فصیح احمد صاحب مونگیری کا تقرر عمل میں آیا تھا ۔ ناظرہ کے لئے منو میاں مقرر کئے گئے تھے ۔ اب (۱۹۹۴ء) ان سب حضرات کا انتقال ہو چکا ہے ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ۔

ابتدائی ایام میں تدریس مختلف مکانوں میں ہوئی بالآخر مدرسہ کے لئے گنوشاہ کا تکیہ خرید لیا گیا اور یہ مدرسہ اب تک اسی تکیہ میں ہے ۔

ریاض المدارس میں بھی میری بدشوقی اور مدرسہ سے بھاگنے کا وہی عالم رہا ۔ بگڑی ہوئی عادت رفتہ رفتہ ہی سدھرتی ہے ۔ ایک مرتبہ میں عصر کے بعد مدرسہ میں پکڑا ہوا لایا گیا ۔ مولوی صاحب اور قاری صاحب کے علاوہ مولوی نیاز احمد صاحب مجسٹریٹ بھی تشریف فرما تھے ۔ مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا جاؤ قرآن پاک اٹھا کر لاؤ اور اسے سر پر رکھ کر قسم کھاؤ کہ اب نہیں بھاگوں گا ۔ میں نے قسم کھالی ۔

نہیں کہہ سکتا کہ یہ قرآن پاک کا اعجاز تھا یا مجسٹریٹ صاحب کا (جو نہایت بزرگ آدمی تھے) تصرف، یا دونوں، کہ اس کے بعد سے میں کبھی پڑھنے سے نہیں بھاگا۔ میری بدشوقی شوق میں تبدیل ہو گئی اور اس وقت سے اب تک جبکہ عمر کے آخری مرحلہ میں ہوں علم کی طرف رجحان بڑھتا ہی گیا۔

ریاض المدارس میں جب بھی کوئی معزز مہمان آتا تھا اس کے سامنے تقریر کے لئے میرا انتخاب کیا جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ تقریر مولوی صاحب لکھ کر دیا کرتے تھے، اور میں رٹ کر طوطے کی طرح دہرا دیتا تھا، لیکن ذرا سلیقے سے، اور یہ سلیقہ مجھے مدرسے کے مہتمم اور میرے سسر مرحوم نے سکھایا تھا جو خود مقرر نہ تھے اور اس وقت ان کا سسر بننا نہ میرے تصور میں تھا اور نہ شاید ان کے تصور میں۔

مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار نواب سعادت علی خاں صاحب کی تشریف آوری پر مجھے تقریر کے لئے منتخب کیا گیا اور میں نے مولوی صاحب کی تحریر کردہ تقریر رٹ لی تو میرے سسر صاحب نے مسجد کے پیچھے لے جا کر جہاں کوئی دیکھنے والا نہ تھا مجھے تقریر کے گُر سکھائے کہ کب اور کس طرح ہاتھوں کو حرکت دی جاتی ہے اور کن مواقع پر آواز پست یا بلند کی جاتی ہے وغیرہ۔ اور جب میری ریہرسل سے مطمئن ہو گئے تو آخر میں فرمایا: میں تمہیں ایک گُر بتاتا ہوں اسے پیش نظر رکھو گے تو ہمیشہ تقریر میں کامیاب رہو گے۔ "جب تقریر کے لئے کھڑے ہو تو یہ سمجھ لو کہ میرے سامنے گدھے بیٹھے ہیں، ایک بھی انسان نہیں۔"

میں نے مع نواب صاحب کے سب کو گدھا سمجھ کر تقریر کی اور خوب واہ واہ ہوئی۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے اس طرح کے مواقع پر تقریر کے لئے میرا ہی انتخاب کر لیا گیا

ایک مرتبہ ممبر (وزیر) مال مدرسہ میں آئے اور ان کے سامنے بھی تقریر کے لئے میرا انتخاب کیا گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کی تحریر کردہ تقریر رٹ لی اور ممبر صاحب کے

سامنے رٹی ہوئی تقریر کرنے کھڑا ہوا تو کالذی یتخبطہ الشیطان من المس (اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چھو کر خبطی کر دیا ہو) کا مصداق بن گیا۔ آواز کانپنے لگی، جملے بھولنے لگا، پیر مسلسل کانپتے رہے اور خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے تقریر ختم کی۔ بعد میں مولوی صاحب نے پوچھا کہ تجھے ہو کیا گیا تھا۔ میں نے کہا کچھ نہیں، صرف لوگوں کو گدھا سمجھنا بھول گیا تھا۔

سسر صاحب مرحوم کے بتائے ہوئے گر نے زندگی بھر کام دیا۔ تقریباً ۲۵ سال تک ریڈیو پاکستان سے جو تقریریں کیں ان کی تو کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے کہ وہ تقریریں کی نہیں جاتیں پڑھی جاتیں ہیں وہ بھی اسٹوڈیو میں تنہا بیٹھ کر۔ لیکن پبلک جلسوں میں بکثرت تقریریں بھی کیں اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو لڑکوں کے کلاس میں لکچرز بھی دیئے۔ جب بھی سامعین کو گدھا سمجھا میں انسان رہا اور جب ان کو انسان سمجھ لیا خود گدھا بن گیا۔

ریاض المدارس میں جب میں متوسطات تک پہنچا تو مجھے اور میرے ساتھی محمد صدیق صاحب کو مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیو بند بھیج دیا گیا۔

دارالعلوم دیو بند

میں ۲۔ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ کو دارالعلوم دیو بند پہنچا اور ۲۰۔ شعبان ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۲ء) کو وہاں سے فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیو بند سے میں نے تین سندیں حاصل کیں: ایک فراغت کی، دوسری قرأت کی اور تیسری حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی خصوصی سند، سند فراغت کا نمبر ۲۸۲۳ ہے اور سند قرأت کا نمبر ۲۸۲۲۔

دارالعلوم دیو بند میں درس کا عام طریقہ یہ تھا کہ پہلے طالب علم کتاب کی عبارت پڑھتا تھا۔ اس کے بعد استاد ایک سیر حاصل تقریر کرتا تھا جو عبارت کے مطلب اس پر وارد شدہ اعتراضات، ان کے جوابات اور اس کے خفایا و مضمرات پر محیط ہوتی

تھی ۔ پھر عبارت کا ترجمہ کرا دیتا تھا۔ تقریر کے دوران اگر کسی طالب علم نے کوئی سوال کیا تو اس کا جواب بھی دیتا تھا۔ بعض کامل اساتذہ کی تقریر کی جامعیت اور اطراف کی جانب ان کے لطیف اشارات کی لذت کا تاثر اب تک ذہن پر باقی ہے۔

اس طرح کے طرز تدریس میں استاد کی صلاحیت تو کھل کر سامنے آجاتی ہے، لیکن طالب علم میں تحقیق کا مادہ پیدا نہیں ہوتا اور اس زمانہ میں حافظوں میں ضعف کی وجہ سے استاد کی بہت سی باتیں محفوظ نہیں رہتیں، الا ماشاء اللہ۔

اس کے برخلاف دیو بندی کے بعض اساتذہ مثلاً حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری مرحوم یا ندوۃ العلماء کے مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی مرحوم کا طریقہ تدریس یہ ہوتا تھا کہ اس سبق کے لئے اور اپنی بات ثابت کرنے کے لئے انہیں جن کتابوں کے حوالے مطلوب ہوتے تھے، وہ کتابیں اپنے ساتھ لاتے تھے اور جہاں حوالہ دینا ہوتا صرف اس پر اکتفاء نہ کرتے تھے کہ فلاں نے یہ کہا ہے بلکہ وہ کتاب کھول کر دکھاتے تھے۔

اس طریقہ تدریس سے طالب علم میں تحقیق کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

بہرحال اپنا اپنا طرز ہے اور دونوں طرح کے اساتذہ کی آغوش سے گوہر نایاب بھی پیدا ہوئے اور ہم جیسے خزف ریزے بھی۔ طالب علم میں استعداد کا پیدا ہونا استاد کی مہارت کے مقابلہ میں زیادہ تر طالب علم کی صلاحیت پر موقوف ہے۔ آئینہ نور کی ہلکی سی کرن پا کر چمک اٹھتا ہے لیکن سیاہ توا آفتاب عالمتاب کے بھرپور نور کے مقابل آکر بھی سیاہ ہی رہتا ہے۔

فائدہ کیا کرے صحبت جو نہ ہو استعداد
باغ میں جا کے کبھی زاغ خوش الحاں نہ ہوا

یہ بات کہ "آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند" علم باطن میں تو چلتی ہے علم ظاہر میں نہیں، پر تو نبوت سے صحابیت کا وہ بلند مقام تو ہر اس شخص نے حاصل کر لیا جو

آپؐ کے دستِ مبارک پر، صلی اللہ علیہ وسلم، ایمان لے آیا۔ لیکن ابن عمرؓ، ابن عباسؓ ابن مسعودؓ، ابو ہریرہؓ اور عائشہؓ کا مقام ہر صحابی کو نصیب نہ ہوا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس
(بارش جس کی طبعی لطافت میں کوئی اختلاف نہیں،
اس سے باغ میں لالہ اگتا ہے اور شور زمین میں گھاس)

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں استاد کی تقریر کی بہت سی باتیں حافظہ سے نکل جاتی ہیں۔ اس کا علاج طلبہ اسی ترکیب سے کرتے تھے جو ترکیب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ کی شکایت کرنے والے ایک صحابی کو بتائی تھی کہ اپنے دائیں ہاتھ سے کام لیا کرو۔ بعض طلبہ بھی اثنائے درس ہی میں اپنے دائیں ہاتھ سے کام لیتے تھے اور جو جتنا زود نویس ہوتا تھا اتنی ہی زیادہ باتیں قلمبند کر لیا کرتا تھا۔ شارٹ ہینڈ آتا نہ تھا کہ ساری باتیں ہی محفوظ ہو جاتیں اور نہ ہی اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈر استعمال ہوا تھا کہ عربی مدارس کے غریب طلبہ کی جیبیں ان کی متحمل ہو سکتیں۔

میں نے بھی دیوان حماسہ، سبع معلقات، ترمذی اور بخاری کے نوٹس اسی طرح تیار کئے لیکن دیوان متنبی کے نوٹس تیار کرنے میں مختلف طریقہ اختیار کیا۔

مجھ سے ایک سال پہلے جس جماعت نے شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دیوان متنبی پڑھی تھی۔ اس میں مولانا فخر الدین گیاوی اور مولانا وجدی بھوپالی جیسے ذہین طلبہ بھی شامل تھے۔ ذہین طلبہ اگر سامنے ہوں تو استاد کی طبیعت میں زیادہ بسط پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مشہور تھا کہ حضرت شیخ الادب نے کئی سالوں سے اتنی اچھی طرح متنبی نہ پڑھائی تھی جیسی اس سال پڑھائی۔ مولانا فخر الدین صاحب گیاوی نے جو زود نویس بھی تھے یہ اہتمام کیا تھا کہ اشعار کے ترجمہ کے سلسلے

میں جو الفاظ استاد کی زبان سے نکلے تھے بعینہٖ قلمبند کر لئے تھے۔ کیونکہ حضرت شیخ الادب کے ترجمہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے پوری ترکیب نحوی سمجھ میں آجاتی تھی ترجمہ کے بعد ان کی کاپی میں الفاظ کی تحقیق تھی۔ مطلب بالکل نہ تھا۔ یہ کاپی میں نے ان سے مستعار لے لی۔

سبق کے بعد میں روزانہ کچھ طلبہ کو متنبی کی تکرار کراتا تھا۔ اس سے باتیں ذہن میں تازہ ہو جاتی تھیں۔ پھر عشاء کے بعد کاپی لکھنے بیٹھتا تھا۔ ترجمہ مولانا فخر الدین گیاوی کی کاپی سے نقل کرتا اور لغوی تحقیق جو اس میں موجود ہوتی تھی وہ اس سے لکھتا تھا اور باقی اپنے حافظہ سے، اور اشعار کا مطلب اور ہر شعر کی مختلف توجیہات جو حضرت شیخ الادب بتاتے تھے وہ بھی حافظہ کی مدد سے لکھ لیا کرتا تھا، اور اس وقت تک نہ سوتا تھا جب تک اس روز کے سبق کے متعلقات قلمبند نہ کر لوں۔ میرے بعض ساتھی کہتے تھے کہ تم تو تمام رطب و یابس لکھ لیا کرتے ہو۔ لیکن میں اس معاملہ میں کسی کی نہ سنتا تھا۔ دیوان متنبی کا جو حصہ داخل نصاب تھا اس کی کاپی فل اسکیپ کے تقریباً ایک ہزار صفحات میں تیار ہوئی، اور یہ کاپی متنبی پڑھنے والی پوری جماعت میں مشہور ہو گئی۔

اس طرح محنت اور تفصیل سے کاپی لکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معانی و مطالب تو کجا متنبی کے اشعار تک تقریباً حفظ ہو گئے۔ اور عام شہرت یہ ہو گئی کہ متنبی میں پوری جماعت میں میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ چنانچہ سالانہ امتحان کے قریب جب میں نودرے میں تکرار کرانے بیٹھتا تھا تو معدودے چند طلبہ کے سوا پوری جماعت تکرار میں شریک ہوتی تھی اور نودرے کا وسیع حصہ طلبہ سے بھر جاتا تھا ایک مرتبہ یہ بھی ہوا کہ میں تکرار کرا رہا تھا، حضرت شیخ الادب کا ادھر سے گذر ہوا۔ پوری کلاس کی سی کیفیت دیکھ کر دریافت کیا کہ کون تکرار کرا رہا ہے۔ عرض کیا گیا کہ فلاں۔ اتنی بات حضرت شیخ الادب کے لئے کسی طالب علم کی طرف سے حسن ظن قائم کرنے کے لئے کافی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے دیوان متنبی کے سوا درس نظامی کی کوئی کتاب اس طرح نہیں پڑھی جس طرح پڑھنی چاہیے۔

سالانہ امتحان میں دیوان متنبی کے پرچے میں ۵۵ میں سے میرے ۵۳ نمبر آئے۔ اور ایک دوسرے پشاوری طالب علم مولوی عبدالغفور نے بھی ۵۳ نمبر حاصل کئے۔ مجھے یہ دیکھ کر کہ کسی اور طالب علم کے نمبر بھی میرے برابر ہیں، اتنا شدید غم ہوا گویا میں فیل ہو گیا ہوں۔ مولوی عبدالغفور صاحب ہونہار طالب علم تھے اور انہیں میری تکرار میں شریک ہونے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ انہوں نے یہ سوچا کہ جوابات اگر اردو میں لکھوں تو میں اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کی مادری زبان ہی اردو ہے۔ لہٰذا انہوں نے جوابات عربی میں لکھے تاکہ اس کے طفیل انہیں نمبر زیادہ مل سکیں اور ان کی یہ ترکیب کارگر ہو گئی۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ انہیں خوش رکھے ورنہ مغفرت سے نوازے۔

بہرحال میری کاپی کی چونکہ شہرت ہو چکی تھی اس لئے فراغت کے بعد جب وطن واپس آگیا تو بہار سے مولانا ہمایوں اختر کا خط آیا کہ فلاں مدرسہ میں مجھے یہ کہہ کر متنبی پڑھانے کے لئے دی گئی ہے کہ تم مولانا اعزاز علی صاحب کے شاگرد ہو۔ تم اپنی کاپی بھیج دو تاکہ لاج رہ جائے۔ میں نے بذریعہ ڈاک کاپی روانہ کر دی اور فراغت کے بعد وہ کاپی انہوں نے مجھے واپس بھیج دی۔

دوسرے سال پھر بہار سے مولانا معظم حسین صاحب کا اسی طرح کا خط آیا۔ میں نے کاپی پھر بھیج دی۔ اور جب وہ اس سے فارغ ہو گئے تو میں نے اپنے استاد قاری سید فصیح احمد صاحب مرحوم کو جو سرونج تشریف لا رہے تھے لکھا کہ کاپی اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ راستہ میں مرحوم کا بکس چوری ہو گیا اور کاپی بھی ضائع ہو گئی۔ نہ معلوم اہل ہاتھوں میں پہنچی یا اس میں سودے کی پڑیاں باندھی گئیں۔

سوچتا ہوں کہ اگر وہ کاپی موجود ہوتی اور نظرثانی کے بعد میں اسے طبع کرا دیتا

تو طلبہ کے لئے بڑی اچھی شرح ہوتی۔

جس زمانہ میں متنبی پڑھ رہا تھا کسی صاحب نے میرے استاد مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کو میری شکایت لکھ کر بھیج دی۔ نہ معلوم کیا لکھا تھا۔ سرونج سے مولوی صاحب کا گرامی نامہ موصول ہوا کہ تم مولانا اعزاز علی صاحب سے اپنی علمی اور اخلاقی حالت کی تصدیق بھیجو۔ یہ خط میں نے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا، حضرت شیخ الادب نے فرمایا: مولوی صاحب جب تک میں امتحان نہ لوں علمی حالت کی تصدیق کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ فلاں وقت زیر درس کتابیں لے کر تشریف لے آئیں۔ وقت مقررہ پر میرا امتحان لیا۔ حضرت شیخ الادب رحمۃ اللہ کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ طالب علم سے کتاب کا کوئی مشکل مقام نکال کر اس کا امتحان نہ لیتے تھے بلکہ کتاب کھولی اور جو صفحہ بھی سامنے آ گیا انگلی رکھ دی کہ یہاں سے پڑھیئے۔ طالب علم عبارت پڑھ کر ترجمہ کر دیتا تھا اور بسا اوقات تو اسی پر امتحان ختم ہو جاتا تھا اور اگر مرحوم ترجمہ سے یہ اندازہ قائم نہ کر پاتے کہ طالب علم سمجھا بھی ہے یا نہیں تو مطلب دریافت کر لیا کرتے تھے۔

پہلے کسی اور کتاب کا امتحان لیا پھر متنبی کھولی اتفاق سے کتاب کے پہلے صفحہ پر جو شعر تھا وہ قصیدے کا دوسرا شعر تھا جس کا مطلب پہلے شعر پر موقوف تھا۔ شعر کے ترجمہ کے بعد جب مطلب دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ اس کا مطلب پہلے شعر پر موقوف ہے اور زبانی وہ شعر سنا کر مطلب بیان کر دیا۔ حضرت نے کتاب بند کر دی اور فرمایا کہ فلاں وقت آ کر میری تصدیق لے جائیں۔

ذیل میں اس سرٹیفیکیٹ کا فوٹو پیش کر رہا ہوں۔

عزیزم مولوی شبیر احمد صاحب مسرور و مبارک رہو فی علومکم، پس از سلام
مسنون، آپ لکھتے ہیں کہ آپ کی تعلیم اور معاشرت کے متعلق جو کچھ خیالات
ہوں وہ بھی لکھ دوں، اسکا عرض ہے کہ آپ مجھ سے بہت دور رہتے ہیں
اسلئے میں آپ کے متعلق تو کچھ عرض نہیں کرسکتا ہوں لیکن جہانتک آپ کی
تعلیم کا تعلق ہے میں آپ کی تعلیم سے مطمئن ہوں، آپ اسباق میں
باضابطہ حاضر رہتے ہیں، سبق کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں، اور جب
کبھی میں نے امتحاناً آپ سے کچھ پوچھا ہے، آپ نے سوال کا جواب
اسی طرح دیا ہے جس طرح ایک محنتی اور شائق طالبعلم کو دینا چاہئے
اس وقت تک کسی قسم کی کوئی شکایت بھی آپ کے متعلق میں نے
نہیں سنی ہے

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جس طرح آپ اس وقت تک محنت
اور شوق کے ساتھ اپنے اسباق میں مشغول رہے ہیں اس سے زیادہ توجہ
کے ساتھ علم کی تحصیل کیجئے، آپ کے اعادۂ اسباق میں فقط وہ
طالبعلم بیٹھنا چاہیں جو خود بھی تحصیل علم کے شائق ہوں،
میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کمالات علمیہ کو حاصل کرکے صحیح معنی
میں اپنے والدین کے لئے قرۃ العین ثابت ہوں

دعاگو

محمد اعزاز علی غفرلہ از دیوبند
۱۰ محرم ۱۳۶۵ھ

راقم کے نام حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کا ایک مکتوب گرامی

(عزیز مولوی بقاء اللہ صاحب سرونجی بارک اللہ فی علومکم، پس از سلام مسنون،
آپ فرماتے ہیں آپ کی تعلیم اور معاشرت کے متعلق جو میرے خیالات ہوں وہ میں لکھدوں، اس لئے عرض ہے کہ آپ مجھ سے بہت دور رہتے ہیں۔ اس لئے میں اس کے متعلق تو کچھ عرض نہیں کر سکتا ہوں لیکن جہاں تک آپ کی تعلیم کا تعلق ہے میں آپ کی تعلیم سے مطمئن ہوں، آپ اسباق میں برابر حاضر ہوتے ہیں، سبق کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں، اور جب بھی میں نے امتحاناً آپ سے کچھ پوچھا ہے، آپ نے سوال کا جواب اس طرح دیا ہے جس طرح ایک محنتی اور شائق طالب علم کو دینا چاہیئے۔ اس وقت تک کسی قسم کی کوئی شکایت بھی آپ کے متعلق میں نے نہیں سنی ہے۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جس طرح آپ اس وقت تک محنت اور شوق کے ساتھ اپنے اسباق میں مشغول ہیں اس سے زیادہ توجہ کے ساتھ علم کی تحصیل کیجئے۔ آپ کے اعادہ اسباق میں فقط وہ طالب علم ہونے چاہئیں جو خود بھی تحصیل علم کے شائق ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کمالات علمیہ کو حاصل کر کے صحیح معنی میں اپنے والدین کے لئے قرۃ العین ثابت ہوں۔)

دعا گو

محمد اعزاز علی غفرلہ از دیوبند

۸۔ محرم ۱۳۵۸ھ یوم سہ شنبہ

اس دیانت کو ملاحظہ فرمایئے کہ امتحان کے بغیر علمی حالت کی تصدیق نہ کی اور اخلاقی حالت کے بارے میں سکوت فرمایا اور آج کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی عام حالت یہ ہے کہ کسی نے کیرکٹر سرٹیفکیٹ طلب کیا تو بلا تامل لکھ دیا۔

To the best of my knowledge he bears

good moral character

حماسہ میں میں نے وہ محنت نہ کی جو متنبی میں کی تھی ۔ لیکن حضرت شیخ الادب کی نظروں میں متنبی کی وجہ سے بھرم قائم تھا ۔ حماسہ کے ساتھ ساتھ ہدایہ آخرین حضرت شیخ الادب ہی پڑھاتے تھے ۔ ہدایہ آخرین کے لئے پہلے دو گھنٹے تھے ۔ (۴۰ منٹ کا گھنٹہ) تیسرا گھنٹہ حماسہ کا تھا ۔ چونکہ دو گھنٹے یومیہ میں ہدایہ آخرین ختم کرانا دشوار ہوتا تھا، اس لئے حضرت شیخ الادب پہلے گھنٹہ سے بھی تقریباً پون گھنٹہ قبل درس شرع کر دیتے تھے، یعنی تقریباً فجر کی نماز کے فوراً بعد ۔ لیکن حاضری پہلا گھنٹہ شروع ہونے پر لیا کرتے تھے ۔ جن طلبہ نے ہدایہ آخرین کے ساتھ ساتھ حماسہ بھی لے رکھا تھا وہ ایک ہی درسگاہ میں روزانہ پونے چار گھنٹے بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتے تھے ۔ بعض بدشوق طلبہ یہ کرتے تھے کہ پہلے گھنٹہ میں حاضری کے وقت ہونے سے دو چار منٹ قبل آکر ان دروازوں پر بیٹھ گئے جو حضرت شیخ الادب کے پشت کی جانب واقع تھے ۔ اور جونہی ان کی حاضری ہو گئی، اٹھ کر چل دیئے ۔ حماسہ کے گھنٹہ میں پھر آکر بیٹھ گئے ۔ ڈیڑھ دو سو طلبہ میں اس حرکت کا حضرت شیخ الادب کو پتہ بھی نہ چلتا تھا ۔

ایک مرتبہ سرونج سے مولوی عبدالکریم صاحب چمڑے والے اور ان کے صاحبزادے فضل الرحمن دیوبند تشریف لائے ۔ میں فضل الرحمن صاحب کے ساتھ وقت گذارنا چاہتا تھا ۔ لہذا میں نے بھی یہی حرکت کی، دروازے میں بیٹھا اور حاضری ہوتے ہی چلا آیا ۔ اتفاق یہ ہوا کہ اسی روز کچھ وقفہ کے بعد حضرت شیخ الادب نے دوبارہ حاضری لے لی کیونکہ کسی نے انہیں طلبہ کی اس حرکت سے آگاہ کر دیا تھا ۔ پکارا گیا "بقاء اللہ سرونجی!" جواب کون دیتا!

حماسہ کے گھنٹہ میں آکر پہلی صف میں بیٹھا تو حاضری کے بعد حضرت شیخ الادب نے عادت کے بالکل خلاف مجھے مخاطب کر کے فرمایا: کل کا سبق سنایئے ۔ لکھ چکا ہوں کہ حماسہ میں یوں بھی محنت نہ کرتا تھا، پھر مہمانوں کی وجہ سے جو شخص موجودہ سبق چھوڑ کر بھاگ جائے اسے گذشتہ سبق کے دہرانے کا موقع کہاں ملتا ۔ دل میں

اختلاج کی کیفیت شروع ہو گئی۔ گذشتہ سبق کا پہلا شعر پڑھا۔ فرمایا: ترجمہ کیجئے۔ ترجمہ کیا۔ مطلب بیان کیجئے، مطلب بیان کیا۔ ترکیب نحوی کیجئے۔ اب تو دل بلیوں اچھلنے لگا خیر ترکیب نحوی کی تو اتفاق سے درست ہو گئی۔ دوسرا شعر پڑھئے اب مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ حضرت کسی بات پر مجھ سے ناراض ہیں۔ دوسرا شعر پڑھا۔ ترجمہ کیجئے، ترکیب نحوی کیجئے۔ حواس کب تک ساتھ دیتے۔ اس مرتبہ ترکیب نحوی غلط ہو گئی۔ فرمایا: بس بس رہنے دیجئے، پڑھنا لکھنا اور بات ہے اور آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ جانا دوسری بات ہے۔ بس اب تو آپ ویسے ہی طالب علم ہو گئے جیسے دارالعلوم کے دوسرے طلبہ ہیں۔ بھری کلاس میں یہ توہین، میں کٹ کر رہ گیا۔ لیکن اس توہین کے پردے میں جو محبت، عنایت اور تعریف تھی آج بھی یاد کرتا ہوں تو موقعہ۔ واردات پر جتنی شرمساری تھی آج ذہن میں اتنی ہی سرشاری محسوس کرتا ہوں۔ یہ محبت و عنایت نہ تھی تو اور کیا تھا کہ صرف مجھ ہی کو مخاطب کیا گیا۔ میں کوئی تنہا مجرم تو نہ تھا پھر یہ کہ اب تو آپ الخ۔ بالفاظ دیگر اس کا اعتراف نہیں تو اور کیا ہے کہ کبھی میں دوسرے طلبہ سے ممتاز بھی تھا۔

اس کے بعد میں نے تحریری معافی طلب کی اور حضرت نے اس کا جواب مرحمت فرمایا۔

حضرت کے جواب کا فوٹو اور متن ذیل میں درج ہے۔

(برادر عزیز! یقیناً ایک وقت ایسا رہا ہے کہ میں آپ کی علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر خوش ہوتا رہا ہوں۔ یہی سال ایسا گذر رہا ہے کہ میں آپ کی توجہ علم کی تحصیل کی جانب اپنے طرز کے موافق کم دیکھ رہا ہوں۔ آپ یقین کریں کہ اس یاس کے سوا اور کوئی چیز میرے لئے سبب میرے رنج کا نہیں ہے۔ رہا معافی کا قصہ: سو جس طرح رنج ہے آپ نے توجہ کم فرمائی، اسی طرح آپ بنام خدا سابق انہماک فی تحصیل العلم کے

برادر عزیز! یقیناً ایک وقت ایسا رہا ہے کہ میں آپ کی علمی سرگرمیوں کو دیگر خوش

نصیبوں ... میں سال ایسے گزر رہا ہے کہ میں آپ کی توجہ علم کی تحقیق کی جانب

اپنے عقیدے کے موافق ہی دیکھ رہا ہوں۔

آپ یقین کریں کہ اس یاس کے سوا اور کوئی چیز تحریر کا سبب تحریر کا نہیں ہے

رہا سوال کا دفعیہ: سو صحیح رنج ہے کہ آپ نے توجہ کم فرمائی، اسی طرح آپ بنام خدا

سلامتی انجام کار کی تحقیق علم کے ساتھ کا یکجا نہیں دیکھا ہے دعا گو رہوں گا

جیسا کہ پہلے تھا، زیادہ والسلام در زمانی عفو دونوں صحیح نا قابل اعتبار ہیں

محمد اعزاز علی عفی عنہ

مدرس دارالعلوم دیوبند

راقم کے نام حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کا دوسرا مکتوب گرامی

ساتھ کام کیجئے۔ میں ویسا ہی دعا گو رہوں گا جیسا کہ پہلے تھا، زبانی استعفا اور زبانی عفو دونوں ناقابل اعتبار ہیں۔)

دعا گو

محمد اعزاز علی غفرلہ از دیوبند

۱۴۔ جمادی الاولی ۱۳۵۹ھ

حماسہ پڑھنے کے زمانہ میں شوق ہوا کہ عروض المفتاح کے درس میں بھی شرکت کر لی جائے۔ حضرت شیخ الادب فارغ اوقات میں عروض المفتاح پڑھایا کرتے تھے۔ پھر خیال ہوا کہ جب کتاب پڑھی ہے تو کیوں نہ امتحان بھی دے لیا جائے، تاکہ سند میں مزید ایک کتاب کا اندراج ہو سکے۔ لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ ناقص تیاری کے ساتھ لاپرواہی سے امتحان میں شریک ہوا صرف ۲۹ نمبر آئے جبکہ پاس ہونے کے لئے ۵۵ میں سے ۴۰ نمبر لانا ضروری تھا۔

دورے کے سال میں پھر دورہ پڑا کہ ایک کتاب پڑھی بھی، امتحان بھی دیا، لیکن اس میں فیل ہو گیا۔ دوبارہ اس کتاب کا امتحان دینا چاہیئے۔ سوچا کہ ایک رات میں تیاری کر لوں گا۔ اس کے امتحان کا دن آیا، جو سب سے آخر میں تھا، چونکہ گذشتہ پرچوں کی وجہ سے چور ہو چکا تھا۔ اس لئے سوچا کہ تھوڑی دیر سو لوں پھر اٹھ کر تیاری کروں گا۔ چنانچہ میں نے مولوی عبدالمتین صاحب سے کہا کہ دو گھنٹے کے بعد مجھے جگا دینا۔ موصوف نے یہ ظلم کیا کہ فجر کی اذان کے وقت جگایا۔ وہ کوئی موقوف علیہ کتاب تو تھی نہیں جس کا امتحان دینا ضروری ہوتا اس لئے میں چاہتا تو امتحان میں نہ بیٹھتا۔ لیکن نادانی کی، تیاری کے بغیر ہی امتحان میں شریک ہو گیا اور اس مرتبہ صرف دو نمبر آئے۔ جبکہ حدیث کی باقی تمام کتابوں میں میرے نمبر ۵۵ میں سے ۴۷ اور ۵۳ کے درمیان تھے۔ اور دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے جب اس سال کی روئیداد شائع

کی تو اس میں میرے نام کے سامنے عروض المفتاح کے نمبر ہندسوں کے بجائے "دو" حروف میں لکھے تاکہ یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ ایک ہندسہ طباعت میں نہ آسکا۔

میری سند میں جو الفاظ لکھ گئے وہ حسب ذیل ہیں۔ "سلیم الطبع جید الفہم ولہ مناسبۃ بالعلوم تامۃ یقدر بہا علی الإفادۃ والتدریس بعون اللہ تعالیٰ"۔ اگر یہ کلنک کا ٹیکہ نہ لگا ہوتا تو بعض اچھے کلمات کا اور اضافہ ہو جاتا۔

چندہ کی روٹیاں کھاتے اور ہر دوپہر اور شام کو مطبخ سے اس طرح کھانا لاتے کہ ایک ہاتھ میں سالن کا پیالہ ہے دوسرے میں دو روٹیاں۔ طبیعت اتنی اکتا چکی تھی کہ آخری سال میں یہ جی چاہتا تھا کہ میں دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چلا جاؤں لیکن یہاں سے بھاگ نکلوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جیسے تیسے آخری سال بھی پورا کرا ہی دیا۔

دیو بند کے آخری سال میں جب فراغت کے دن قریب آئے تو یہ تمنا بکثرت دل میں چٹکیاں لیتی تھی کہ کاش کوئی بڑا شہر ہو، ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ ہو اور ایک موٹر سائیکل۔ اللہ نے کراچی جیسے بڑے شہر میں رکھا اور اب مکہ کے مقدس ترین مقام میں ہوں اور تنخواہ اور سواری کے معاملہ میں اللہ نے جو کرم فرمایا اس کی بنا پر اپنی سابق تمنا پر یہ شعر یاد آتا ہے:

تو ہی نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

دیو بند میں ہر جماعت میں طلبہ کی کثرت تھی اور دستور یہ تھا کہ جس نے بھی پہلے بسم اللہ کہہ دی عبارت پڑھنا اسی کا حق ہوتا تھا۔ اس دستور پر ہم نے بھی عمل کیا۔ ریاض المدارس کے اساتذہ کی چھڑیوں نے بڑی حد تک صحیح عبارت پڑھنا سکھا دی تھی۔ اس لئے خاص طور پر مولانا ظہور احمد صاحب مرحوم کی، جن سے ہم ملا حسن پڑھتے تھے، یہ عادت ہو گئی تھی کہ اگر ہم سے پہلے کسی نے بسم اللہ کہہ دی تو جہاں اس نے غلطی کی فوری طور پر اسے روک کر ہم دونوں (میں اور میرے سرونج کے ساتھی محمد صدیق

صاحب) میں سے کسی ایک کا نام لیا کرتے تھے اور ہم عبارت پڑھنا شروع کر دیتے تھے

ایک مرتبہ میں ششماہی امتحان میں کسی کتاب میں فیل ہو گیا۔ شاید تین روز کے لئے کھانا بند کر دیا گیا۔ پیسے پاس نہ تھے کہ بازار سے کھاتا، سوچا کہ انسان ایک جانور ہی تو ہے اور جب جانوروں کی غذا گھاس ہے تو کیوں نہ اس کا تجربہ کیا جائے۔ چنانچہ مہتمم صاحب کے باغ میں گیا۔ مکئی کی فصل کھڑی تھی، اس کی نرم کونپلیں توڑیں اور جب چبائیں تو منہ کڑوا ہو گیا، فوراً تھوک دیا۔

ماکولات چار ہی اقسام پر مشتمل ہیں۔ گوشت، سبزی، غلہ اور پھل۔ درندے گوشت پر گذارا کرتے ہیں، چرندے عام طور پر سبزہ اور پتوں پر اور پرندے عموماً دانہ اور پھل پر، انسان نے ان چاروں اقسام کی نفیس چیزوں کو اپنی غذا میں شامل کر رکھا ہے۔ اگر سلاد کی طرح انسان نے مکئی وغیرہ کے پتوں کی عادت بھی ڈال لی ہوتی تو اس موقع پر میری مشکل آسان ہو جاتی۔

دیو بند کے طلبہ علم کے زمانے میں ہم بکثرت بلا ٹکٹ سفر کرتے تھے۔ خاص طور سے دلی اور سہارنپور تو گویا گھر آنگن تھے۔ ہم نے مختلف مقامات کے پرانے ٹکٹ جمع کر رکھے تھے۔ ہمارے زمانے میں این۔ ڈبلیو۔ آر کے ٹکٹوں پر ایک طرف مقامات اور کرایہ چھپا ہوتا تھا اور دوسری طرف دونوں جانب صرف تاریخ ہوتی تھی، مشین سے کئی ہوئی۔ تاریخ کی جگہ پر ہم پانی ڈال دیتے تھے اور جب وہ جگہ پھول جاتی تھی تو اسے دبا کر رگڑ دیا کرتے تھے۔ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کس تاریخ کا ٹکٹ ہے۔

ایک مرتبہ میں اور مولانا سراج احمد صاحب مرحوم بنارس سے سہارنپور واپس آرہے تھے۔ وہی مسخ شدہ تاریخوں کے ٹکٹ دونوں کے پاس تھے۔ ڈبے میں آکر چیکر نے ٹکٹ دیکھے اور ہمیں بریلی جنکشن پر اتار کر اس کمرے میں لے گیا جہاں سب ٹکٹ چیکر جمع تھے اور ٹکٹ ان کی طرف بڑھا کر کہا: دیکھو تو کس تاریخ کے ٹکٹ ہیں۔

ایک نے خورد بین لگا کر بھی دیکھا لیکن تاریخ ہوتی تو پتہ چلتا۔ گاڑی کی روانگی کا وقت قریب آیا تو ہم نے پوچھا: کیا ہم جائیں؟ جواب دیا: آپ اس ٹرین سے نہیں جاسکتے۔ ٹرین کی روانگی کے بعد بنارس سے رابطہ قائم کرکے دریافت کریں گے کہ ان نمبروں کے ٹکٹ کس تاریخ میں جاری ہوئے۔ ہمارے تو طوطے اڑ گئے، لیکن ہم نے کہا کہ ہمارا سفر کھوٹا کرنے کے بجائے آپ ہمیں سہارنپور جانے دیجئے اور بنارس سے جو معلومات یہاں کرنی ہیں وہاں کرلیجئے۔

ٹکٹ چیکر نے کہا: مولوی صاحب اچھا جائیں لیکن آئندہ سے تاریخ نہ مٹایا کیجئے

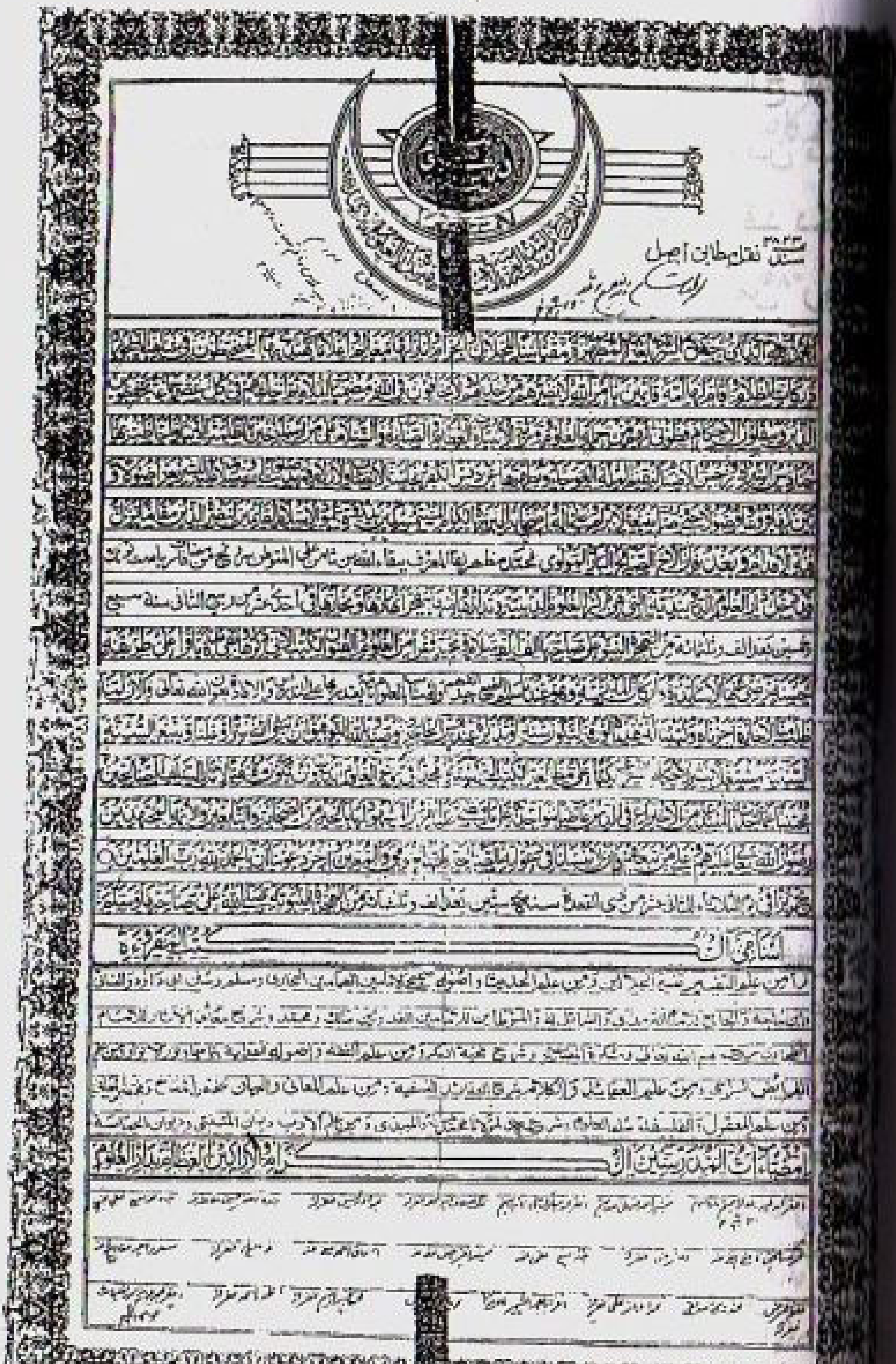
ہمارے اور ٹکٹ چیکر کے درمیان جو گفتگو ہوئی اتفاق سے ایک قلی بھی سن رہا تھا۔ ہم رہائی پا کر جس چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھے اس میں وہ قلی بھی آگیا۔ کہیں جارہا تھا ہم تین کے سوا اس ڈبے میں اور کوئی نہ تھا۔ ٹرین چلی تو قلی۔ نے کہا۔ مولوی صاحب اگر ٹکٹ کے بغیر ہی سفر کرنا ہے تو میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ سفر کرنے لگو تو آنے کے دودھ کی پکی ہوئی لیئی، ایک بلیڈ، باریک ریگ مال کا ایک ٹکڑا اور ایک موٹی سی کتاب اپنے ساتھ لو۔ دو آنے میں اگلے اسٹیشن کا ٹکٹ خریدو اور ڈبے میں داخل ہوتے ہی غسل خانہ میں چلے جاؤ۔ وہاں پرانے اور نئے ٹکٹوں کے دو دو پرت کرو اگر پرت برابر نہ اتریں تو بلیڈ اور ریگ مال سے کام لو، پھر نئے ٹکٹ کی تاریخ کا حصہ پرانے ٹکٹ میں چپکا دو اور ریگ مال سے کنارے صاف کرکے کتاب میں بند کردو اور باہر آجاؤ۔ اب ٹکٹ پر ایک طرف تو دیو بند سے بمبئی ہوگا اور دوسری طرف تازہ تاریخ لیکن خیال رکھنا گوند استعمال نہ کرنا کیونکہ گوند خشک ہو کر اکھڑ جاتی ہے۔

ہمیں اس نسخہ کیمیا پر بڑی خوشی ہوئی اور پھر ہم نے بے شمار سفر کئے اور کہیں پکڑے نہ گئے۔

چوری خواہ مال کی ہو یا ٹکٹ کی بہرحال چوری ہے اور چوری صریح حدیث کے

مطابق گناہ، کبیرہ ہے ۔ پھر ہم نے یہ گناہ، کبیرہ کیوں کیا وہ بھی ایک بار نہیں بار بار ۔ اصرار سے تو صغیرہ گناہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے پھر کبیرہ تو کبیرہ ہی ہے ۔

اصل وجہ یہ تھی کہ انگریز کا دور تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی اور حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی وجہ سے ۹۹ فیصد طلبہ کی ذہنیت کانگریسی تھی ۔ اس ذہنیت کے مطابق انگریز حکومت کو نقصان پہنچانا کار ثواب تھا ۔ اس لئے ہم نے اس طرح کی جو بھی حرکتیں کیں وہ نیک کام سمجھ کر کیں انہیں گناہ سمجھا ہی نہیں اور اسی لئے ہم جب اس طرح کا کوئی کام کرتے تھے خوش ہوتے تھے کہ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" (میں اپنی زندگی سے خوش ہوں کہ کوئی کارنامہ تو انجام دیا)۔



دارالعلوم دیوبند کی سند کا عکس

الحمد لله .... وبعد فان الأخ الصالح البار المولوی **محمد مظهر بقا،** المعروف ببقاء الله بن ثامن علي ، المتوطن سرونج من مضافات تونك قد دخل دار العلوم الديوبندية .... في إحدى عشر من ربيع الثاني سنة سبع وخمسين بعد ألف وثلاثمائة من الهجرة النبوية على صاحبها ألف ألف سلام وتحية ، فقرأ من العلوم والفنون والكتب الآتی ذكرها وبقي مدة ماقرأ علیٰ طريقة حسنة رضي عنها الأساتذة وأركان المدرسة ، وهو عندنا سليم الطبع جيد الفهم وله مناسبة بالعلوم تامة يقدر بها على التدريس والإفادة بعون الله تعالیٰ –

دستخط

احقر محمد طيب غفرلہٗ مهتمم دار العلوم ، ۳۰-۱۱-۶۰ ھ ، شبير احمد عثماني ، صدر مهتمم ، احقر مبارك علي ، نائب مهتمم ، ننگِ اسلاف حسين احمد غفرلہٗ ، محمد ادريس غفرلہٗ ، بنده اصغر حسين عفا الله عنه ، بنده محمد شفيع عفي عنه ، محمد عبدالحق نافع عفي عنه ، اصغر علي غفرلہٗ ، عبد السميع عفي عنه ، سيد اصغر حسين عفي عنه ، اسحاق احمد عفي عنه ، محمد جليل غفرلہ ، مسعود احمد عفا الله عنه ، حفظ الرحمٰن غفرلہ ، محمد يحيٰي صديقی ، محمد اعزاز علي غفرلہٗ ، اعزاز احمد الشهير باحمد ميان ، رياض الدين ، محمد ابراهيم غفرلہٗ ، ظهور احمد غفرلہٗ ، احقر محمد عزيز محرر تعليمات –

دیو بند کا صد سالہ جلسہ، تقسیم اسناد

۱۹۸۰ء میں صد سالہ جلسہ، تقسیم اسناد ہوا۔ میں ان دنوں مکہ مکرمہ کی جامعہ، ام القریٰ میں تھا۔ جامعہ سے پانچ روز کی رخصت لے کر، میں نے جامعہ کے لائبریرین ...لانا عبدالصبور قاسمی کے ہمراہ اپنے مصارف پر اس جلسہ میں شرکت کی۔ دارالعلوم کی ...ارت سے کافی فاصلہ پر جلسہ گاہ تھی۔ کچے راستہ میں لوگوں کی بکثرت آمدورفت کی ...ے اور خود جلسہ گاہ میں اس قدر غبار ہوتا تھا کہ سانس بھی بآسانی نہ لی جاتی تھی۔ ...میں اتنی بدنظمی تھی کہ دارالعلوم کی طرف انتساب کی وجہ سے ہماری نظریں بھی ...وم سے جھکی جاتی تھیں۔ دستاریں تقسیم ہوئیں تو معلوم ہوتا تھا کہ لوٹ مچی ہے۔ ...یں بڑی دشواری سے ڈائس پر چڑھ کر بمشکل اپنی دستار حاصل کر سکا۔ کیونکہ دوسرے ...ز مجھے واپس آنا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا بھی ہوا کہ "منزل انہیں ملی جو شریک ...سفر نہ تھے" ایسے لوگ بھی دستاریں لے اڑے جو صرف پہلی بار جلسہ میں شرکت کے ...لئے آئے تھے اور اس سے پہلے دارالعلوم کے طالب علم تو کیا ہوتے، انہوں نے دیوبند کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے برخلاف وہ لوگ دستاروں سے محروم رہے جو ...الحمد دارالعلوم کے فارغ التحصیل تھے۔

مولوی فاضل

دارالعلوم دیوبند کے طلبِ علم کے زمانہ ہی میں میں نے بریلی سینٹر سے الہ آباد ...بورڈ کے "مولوی عالم" اور "مولوی فاضل" کے امتحانات پاس کئے۔

مولوی فاضل کے امتحان میں مڈل تک کے معیار کا ایک پرچہ انگریزی کا بھی ...ہوتا تھا۔ تھوڑی بہت تیاری کی تھی لیکن دل پر ہراس طاری تھا کہ دیکھیں اس پرچہ میں

کیا ہوتا ہے۔

بریلی سینٹر میں جب سائیکلو اسٹائل کیا ہوا پرچہ ہاتھ میں آیا تو بعض جگہ سے واضح نہ تھا میں کھڑا ہو گیا۔ انو جیلیٹر نے پوچھا کیا ہے؟ وجہ بتانے پر ڈانٹ کر کہا: میں کچھ نہیں جانتا بیٹھ جاؤ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پنڈت جی تھے، ظاہر ہے کہ عربی کیا جانتے۔

اتفاق سے ساتوں پرچوں میں میرے کمرے میں انہی کی ڈیوٹی رہی۔ چھ پرچوں تک انہوں نے میرا ڈھنگ یہ دیکھا کہ پرچہ دیکھنے کے پانچ منٹ بعد میں جواب لکھنا شروع کر دیتا تھا اور کسی طرف نظر اٹھائے بغیر مسلسل لکھتا جاتا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گذر جانے پر پانچ منٹ کے لئے قلم رکھتا تھا اور اس وقفہ میں پان کھانے کا مشغلہ رہتا تھا۔ ڈبیا بٹوہ پہلے ہی سے میز پر رکھ دیتا تھا تاکہ انو جیلیٹر کو شبہ ہو تو کھول کر دیکھ لے۔ پانچ منٹ گذرنے پر دوبارہ قلم اٹھاتا تھا اور وقت ختم ہونے سے پندرہ منٹ پہلے تمام سوالات کو دوبارہ دیکھتا تھا اور ضرورت اور وقت میں گنجائش ہو تو اضافہ کرتا تھا۔ وقت ختم ہوتے ہی کاپی انو جیلیٹر کے حوالے کر دیتا تھا۔ ہر امتحان میں میرا یہی طریقہ رہا

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں پرچہ پر صرف طائرانہ نظر ڈالتا تھا اور جس سوال کے بارے میں اندازہ ہوتا کہ اس کا جواب میں اچھا لکھ سکتا ہوں اس کا جواب لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ جتنے سوالات حل کرنے ہوں اس کے مطابق ہر سوال کے لئے وقت مقرر کر لیتا تھا۔ دوسرے سوالات کے مقابلے میں پہلے سوال کے لئے پندرہ منٹ زیادہ رکھتا تھا تاکہ ممتحن پہلے جواب ہی سے مرعوب ہو جائے۔ اگر کسی سوال کے لئے مقرر کردہ وقت ختم ہو جائے اور جواب باقی ہو تو اس طرح کنارے لگا دیتا تھا کہ اگر وہیں پر ختم ہو جائے تو بات ادھوری بھی نہ معلوم ہو اور بعد میں وقت ملے تو اس میں اضافہ بھی کیا جا سکے۔

بہرحال چھ پرچوں تک جب پنڈت جی نے میرا یہ طرز دیکھا، جبکہ دوسرے طلبہ کی کارگذاریاں وہ دیکھ رہے تھے اور روزانہ ڈانٹتے تھے، تو میں نے ان کے رویہ سے اندازہ کیا کہ میری طرف سے ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے چنانچہ چھٹا پرچہ ختم کرکے کاپی دیتے وقت میں نے کہا: پنڈت جی آپ کو اندازہ ہو گا کہ میرے اب تک کے پرچے کیسے ہو رہے ہیں۔ کل انگریزی کا پرچہ ہے اور انگریزی مجھے آتی نہیں اس لئے آپ کی مدد کی ضرورت ہو گی۔ سن کر خاموش ہو گئے۔

دوسرے روز انہوں نے دیکھا کہ یہ لڑکا عادت کے خلاف کافی دیر تک بیٹھا سوچ رہا ہے۔ چنانچہ پورے وقت میں چار مرتبہ میرے پاس آئے اور کہا: کچھ پوچھنا ہے؟ اور ہر مرتبہ انہوں نے بتایا۔ جو کچھ پوچھا تھا ان میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ پنڈت جی! کوئل کی انگریزی کیا ہے؟

مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں:

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد رمضان میں گھر جانے کے بجائے چند دوستوں کے ساتھ لاہور کا رخ کیا کہ مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچ کر ان سے تفسیر کا درس لیا جائے، جس کی طلبہ کے درمیان بڑی شہرت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو ربط آیات میں بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ چونکہ ہم لوگ فارغ التحصیل تھے اس لئے اشاراتی انداز میں تقریباً ڈیڑھ ماہ میں قرآن کریم ختم کرایا۔ لاہور کی تفریح بھی خوب کی۔ ایک فقیر (داتا گنج بخش) کا بھرا دربار بھی دیکھا اور ایک بادشاہ (جہانگیر) کا اجڑا دیار بھی۔ ایاز کی قبر بھی دیکھی جس پر پھول چڑھے تھے اور زیب النساء کا مقبرہ بھی جو واقعۃً اسی کے اس شعر کا مصداق تھا۔

بر مزار ما غریباں نے چراغ و نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

(ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ ہے، نہ کوئی پھول،
نہ کسی پروانے کا پر جلتا ہے اور نہ کسی بلبل کی صدا آتی ہے)

میٹرک اور بعض دوسرے امتحانات

دیو بند سے فراغت اور مولانا احمد صاحب کے پاس سے واپس آکر میں ملازمت سے قبل تھوڑا عرصہ سرونج میں مقیم رہا اور اس عرصہ میں اجمیر بورڈ سے صرف انگریزی میں میٹرک پاس کیا۔

ٹونک کا مدرسہ خلیلیہ آگرہ بورڈ کے امتحانات کا مرکز تھا۔ میں جس سال ٹونک کے محکمہ شرعیہ میں ملازم ہوا، اس سال "ادیب ماہر" کے امتحان کے لئے کوئی امیدوار نہ تھا۔ حکیم ظہیر میاں نے کہا کہ آپ اس امتحان میں بیٹھ جائیں تاکہ سینٹر ختم ہونے سے محفوظ رہے۔ اس طرح مجھے آگرہ بورڈ کا "ادیب ماہر" پاس کرنا پڑا۔

حیدر آباد آرمی میں ملازمت کے دوران رومن اردو سیکنڈ کلاس اور رومن اردو فرسٹ کلاس کے امتحانات بھی پاس کئے، امتحانات دینے کا کچھ خبط سا تھا۔

منشی فاضل

میں جس زمانہ میں ٹونک میں مفتی تھا والد صاحب مرحوم کا گرامی نامہ پہنچا۔ لکھا تھا: ہمارے بھائی صاحب کو (میرے تایا) اپنی فارسی دانی پر بہت ناز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم منشی فاضل کا امتحان دے دو تاکہ انہیں معلوم ہو کہ خاندان میں کوئی اور بھی فارسی جانتا ہے۔

حالانکہ خود کماتا تھا لیکن میں نے شوخی سے جواب دیا کہ مصارف آپ برداشت کریں، چنانچہ والد صاحب ہی نے کتابوں، فیس اور دلی کی آمد و رفت کے مصارف برداشت کئے۔ اس طرح میں نے یہ امتحان پاس کیا۔

انٹر سے ایم۔اے تک

ایس۔ایم کالج میں ملازمت کو شاید ایک سال ہی گذرا تھا کہ چند اساتذہ کو ترقیاں ملیں۔مولانا یحییٰ ندوی صاحب اسسٹنٹ پروفیسر بنائے گئے اور اطہر حسین صاحب پروفیسر۔میں نے پرنسپل کے پی۔اے فرید صاحب سے دریافت کیا کہ دونوں کی مدت ملازمت تقریباً برابر ہے پھر ان کی ترقی میں یہ تفاوت کیوں؟ فرید صاحب نے، جو بڑے کھرے آدمی تھے، جواب دیا: مولانا یحییٰ مولوی ہیں اور مولوی کو ایسی ملازمت قسمت ہی سے ملتی ہے۔اس لئے وہ اسے دانتوں سے پکڑتے ہیں اور اطہر حسین صاحب ریاضیات میں ایم۔اے ہیں، وہ بھی فرسٹ کلاس۔کالج کو ایسے آدمی مشکل سے ملتے ہیں اس لئے کالج انہیں دانتوں سے پکڑتا ہے۔

ان کا یہ جواب تیر بن کر میرے دل میں ترازو ہو گیا۔سوچا کہ کل میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو گا۔چنانچہ ٹھان لی کہ ایم۔اے کرنا چاہئے وہ بھی فرسٹ کلاس۔

میری اسناد تو کراچی آتے وقت ہی بکس کے ساتھ گم ہو چکی تھیں سوچا کہ از سر نو میٹرک کیا جائے اور جب از سر نو ہی کرنا ہے تو وایا بھٹنڈا کے بجائے تمام مضامین میں میٹرک کیا جائے۔چنانچہ تین چار روز میں ساری کتابیں خرید لایا اور تیاری شروع کر دی۔تیاری شروع کئے غالباً ایک ہی ہفتہ گذرا تھا کہ اجمیر بورڈ سے میٹرک کے سرٹیفیکٹ کا مثنیٰ (Duplicate) آگیا جس کے لئے وزارت خارجہ کی معرفت مدت سے مراسلت جاری تھی۔

اس موقع پر میٹرک کے سرٹیفیکٹ آنے پر میں نے سوچا کہ اللہ کو آسانی مطلوب ہے تو میں اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈالوں۔چنانچہ میٹرک کی کتابیں واپس کیں اور انٹر کی کتابیں خرید لایا۔چونکہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کر چکا تھا اس لئے اس کی بنیاد پر صرف انگریزی میں بی۔اے (بی او ایل) کر سکتا تھا۔امتحان

میں صرف ایک ماہ دس روز باقی تھے۔ ڈبل فیس روانہ کی اور اس طرح انٹر کی تیاری شروع کر دی کہ عشاء کی نماز کے بعد پڑھنے بیٹھتا تھا اور فجر کی نماز کے بعد سوتا تھا۔ کامرس کلاسز شام کو ہوتی تھیں اس لئے دن میں آرام کا کافی وقت مل جاتا تھا۔

اول تو انگریزی اس زمانہ میں بھی نہ آتی تھی جب میٹرک کیا تھا (اور اب تک بھی نہیں آتی) پھر میٹرک کئے ہوئے بھی عرصہ گذر چکا تھا اور جو کچھ شد بد تھی وہ بھی جاتی رہی تھی اس لئے میں نے کم وقت میں انگریزی کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ایک زائد کام یہ کیا کہ روزانہ کسی بھی کتاب کا ایک خوبصورت پیراگراف رٹ کر اسے چار مرتبہ لکھ لیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ چند روز میں پیراگراف تو بھول جاتا تھا لیکن اس کے کچھ الفاظ اور جملوں کی ساخت ذہن میں رہ جاتی تھی ۔ چنانچہ اتنے حسین نہ ہی لیکن اسی ساخت کے صحیح جملے بنانے مجھے بھی جلد آ گئے۔

انٹر کے بعد بی۔اے کیا اور اس کے بعد چونکہ دن کا وقت فارغ تھا اس لئے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے ایم۔اے میں داخلہ لے لیا اور ایم۔اے بھی پاس کیا تو اس طرح کہ نہ صرف فرسٹ کلاس فرسٹ آیا بلکہ اتنے نمبر حاصل کئے کہ اس سال آرٹس، سائنس اور کامرس میں کسی کے اتنے نمبر نہ تھے۔ فللہ الحمد۔

بعض اساتذہ کا اور اپنا طرز عمل

ایم۔اے فائنل میں ایک استاد ہمیں نابغہ کا دیوان پڑھا رہے تھے۔ ایک شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا اور میرے دو تین بار پوچھنے پر بھی بات صاف نہ ہو سکی۔ کلاس کے بعد میں ان استاد کے ساتھ ہی باہر نکلا، اتفاق سے ڈاکٹر یوسف صاحب کے کمرے میں مولانا عبدالعزیز میمن بیٹھے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ میمن صاحب بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لوں! ان استاد نے جواب دیا۔ اوہ، رہنے بھی دیجئے۔

میمن صاحب کے صاحبزادے میرے ساتھی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنے والد سے اس کا مطلب دریافت کرنا۔ انہوں نے دریافت کر کے دوسرے روز مطلب بتایا، صرف تل اوٹ پہاڑ تھا۔

اس کے برخلاف ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم معری کا دیوان پڑھا رہے تھے ایک مصرعہ تھا "ومن لعیر بصلیانه" ڈاکٹر صاحب نے کچھ مطلب بتایا۔ میں نے عرض کیا: ایسے مواقع پر ہمیشہ اگر "من" کے بعد "یضمن" کو محذوف مان لیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں دیوان متنبی پڑھنے کے دوران جب یہ مصرعہ آیا تھا "ومن لی ببیوم مثل یوم القینه" تو اس موقع پر حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے یہی بات فرمائی تھی اور یہ بات میرے حافظہ میں محفوظ تھی۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ دوسرے روز کلاس میں ہی فرمایا کہ میں رات کو میمن صاحب کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے وہی بتایا جو آپ نے کہا تھا۔ واقعتہ استاد کی یہی شان ہونی چاہئے۔ میں نے بھی اپنی تدریسی زندگی میں اسی اصول کو ملحوظ رکھا کہ جو بات معلوم نہ ہوئی۔ طلبہ کو گمراہ کرنے کے بجائے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا اور کہہ دیا کہ دیکھ کر بتاؤں گا اور اگر کسی وقت کوئی غلط بات بتا گیا تو دوسرے روز پوری کلاس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طرح استاد کی عزت طلبہ کی نظر میں گھٹتی نہیں، مزید بڑھتی ہے۔

ایک عالم اسد بن فرات مغرب سے سفر کر کے امام مالک کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچے اور ان سے چالیس مسئلے دریافت کئے۔ ان میں سے ۳۹ کے جواب میں امام مالک نے "لاأدری" (مجھے نہیں معلوم) کہہ دیا۔ ان صاحب نے کہا کہ میں واپس جا کر اپنی قوم سے کیا کہوں گا؟ فرمایا۔ کہہ دینا کہ مالک نے ان مسائل میں اپنی جہالت کا اعتراف کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ ایک بار کسی

صحابی نے دریافت کیا کہ سب سے اچھے اور سب سے برے مقامات کون سے ہیں ۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم، جبریلؑ سے دریافت کر کے بتاؤں گا۔ حضرت جبریلؑ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم، اللہ رب العزت سے پوچھ کر بتاؤں گا اور پھر حضرت جبریلؑ نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے بتایا کہ مسجدیں سب سے اچھے مقامات ہیں اور بازار سب سے برے۔

ایم۔اے کی فیرویل پارٹی

ایم۔اے سے فراغت پر فیرویل پارٹی ہوئی ۔ کھانے سے فارغ ہو کر ڈاکٹر یوسف صاحب نے فرمایا۔ علی گڑھ میں ایسے مواقع پر طلبہ اپنے خیالات کے اظہار میں بالکل آزاد ہوا کرتے تھے حتیٰ کہ مناقب کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے مثالب بیان کرنے یا مذاق بنانے میں بھی ان پر کوئی قدغن نہ تھی ۔آپ لوگ بھی چاہیں تو اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

کلاس میں سب سے ممتاز چونکہ میں تھا اس لئے سب کی نگاہیں میری طرف اٹھیں ۔ بالآخر میں نے زبان کھولی، کہا: اساتذہ کا مذاق اڑانا تو میں نے سیکھا نہیں البتہ آپ حضرات کے بارے میں میری جو دیانت دارانہ رائے ہے، اس کا اظہار کئے دیتا ہوں ۔ پھر ہر استاد کی واقعی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان کے نقائص بیان کئے:

ڈاکٹر یوسف صاحب اگرچہ اصول کے بڑے سخت ہیں ۔ لیکن ان کے اصول اندھے کی لاٹھی کی طرح ہیں جو یہ نہیں دیکھتی کہ کون اس کی زد میں آرہا ہے اور اس سلسلہ میں ایک لڑکی کا حوالہ دیا جسے ڈاکٹر صاحب نے امتحان میں شرکت سے محروم کر دیا تھا۔

مولانا منتخب الحق صاحب کتاب کے بجائے فن پڑھاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ ان کے علم میں ہے وہ سب طلبہ کے سینوں میں انڈیل دیں ۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ کورس ختم نہیں ہوتا اور طلبہ اس خیال سے پریشان رہتے ہیں کہ سوالات اگر ناخواندہ حصہ میں سے آگئے تو!

حافظ عبدالرشید ارشد صاحب کو خانگی افکار شاید اس طرح گھیرے رہتے ہیں کہ انہیں مطالعہ کی فرصت نہیں ملتی۔

پارٹی کے دوسرے روز یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر صاحب نے بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور ٹھنڈے انداز میں فرمایا۔ جس لڑکی کا تم نے حوالہ دیا تھا، وہ کلاس سے غائب رہتی تھی، پڑھنے میں بہت کمزور تھی۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ کلاس کے علاوہ دوسرے اوقات میں پڑھنے کے لئے میرے پاس آجایا کرو اور متنبہ بھی کیا کہ اگر تمہارا یہی حال رہا تو میں تمہیں امتحان میں شرکت نہ کرنے دوں گا۔ لیکن اس کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اب بتاؤ جو کچھ میں نے کیا وہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟ میں نے عرض کیا، پھر تو آپ نے ٹھیک کیا۔

مولانا منتخب الحق صاحب کے کمرے میں پہنچا تو چہرہ غمازی کر رہا تھا کہ آثار اچھے نہیں۔ چندے سکوت کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا۔ ہم تو اپنے دوستوں کے صدمے سہنے کے عادی ہو گئے ہیں، لیکن ارشد صاحب پر بہت اثر ہے۔ ان کے پاس جاؤ اور معذرت کرو۔ میں نے کہا مولانا! آخر بات کیا ہے؟ فرمایا۔ جو باتیں تمہارے منہ سے نکلیں اگر محض اتفاق ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن میرے اور ارشد صاحب کے جو نقائص تم نے بیان کئے یہی نقائص بعینہٖ اس خفیہ سالانہ رپورٹ میں موجود ہیں جو ڈاکٹر یوسف صاحب کی طرف سے شیخ الجامعہ کو بھیجی گئی اور اسی بنا پر ہم دونوں سالانہ اضافہ سے محروم ہوئے ہیں۔ ارشد صاحب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو پہلے ہی سے تم نے یہ باتیں سجھائی ہوں گی۔ یہ سن کر میرے آنسو نکل آئے۔ صرف اتنا زبان سے نکلا: مولانا! آپ نے میرے بارے میں اس کمینگی کا تصور بھی کیسے کیا؟

پھر ارشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، بھرے بیٹھے تھے، میرے زبان

کھولتے ہیں برس پڑے، بالکل اسی شعر کا مصداق۔

پرسوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

کسی معذرت اور صفائی کو سننے کے لئے تیار نہ تھے۔خاموش رہا، استاد تھے، کیا کہتا۔

ارشد صاحب مرحوم کی یہ ناراضگی اس واقعہ کے بعد ختم ہوئی جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب "کچھ یادیں" میں مولانا منتخب الحق صاحب کے مستقل تذکرہ میں کیا ہے

پی ایچ۔ڈی

ایم۔اے کر چکنے کے بعد میں اولاً سندھ یونیورسٹی میں ملازم ہوا۔اور وہاں سے ایک سال بعد میرا تقرر کراچی یونیورسٹی میں ہو گیا۔یہاں میں نے دیکھا کہ مجھ سے کم عمر کے بعض اساتذہ بھی پی ایچ۔ڈی تھے اور ان کی جو قدر تھی ظاہر ہے کہ ان اساتذہ کی نہ تھی جو صرف ایم۔اے تھے۔میں نے سوچا کہ اگر یونیورسٹی میں عزت کے ساتھ ملازمت کرنی ہے تو پی ایچ۔ڈی کرنا چاہیے۔چنانچہ پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لے لیا۔

جس طرح ایس۔ایم کالج میں فرید صاحب کی ایک بات کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایم۔اے تک پہنچایا، اسی طرح یونیورسٹی میں باعزت ملازمت کرنے کے خیال سے میں نے اللہ کے فضل سے تین سال میں پی ایچ۔ڈی کا مرحلہ بھی طے کر لیا۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب مرحوم میرے ڈائرکٹر تھے۔جون ۱۹۶۹ء کے جلسہ تقسیم اسناد میں کراچی یونیورسٹی نے مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی اور نومبر ۱۹۷۳ء میں "ادارہ تحقیقات اسلامی" اسلام آباد نے میرے مقالہ کو "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ" کے عنوان سے شائع کیا۔

University of Karachi

FACULTY OF ISLAMIC LEARNING

Doctor of Philosophy

Whereas Muhammad Mazhar Baqa has successfully pursued and completed a course of research studies in the Department of Islamic Studies in the Faculty of Islamic Learning and has been examined and found qualified for the Degree of Doctor of Philosophy, he has this day been admitted to the Degree aforementioned at the Convocation of 1969.

Registrar

I. H. Qureshi
Vice-Chancellor

Dated, Karachi, the 21st June 1969

پی ایچ-ڈی کی ڈگری کا عکس

حفظ قرآن

نوجوانی میں جب میں نے ایک صاحب کو تراویح میں اس طرح قرآن پڑھتے سنا کہ یعلمون تعلمون کے سوا اور کچھ مشکل ہی سے سمجھ میں آتا تھا تو یہ جذبہ پیدا ہوا کہ خود حفظ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی رمضان میں حفظ شروع کر دیا اور صرف سورۃ بقرۃ حفظ کی تھی کہ جوش سرد پڑ گیا اور حفظ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

جب چاند کے حساب سے عمر کے تقریباً ۵۴ سال مکمل کر لیے تو شوال ۱۳۹۴ھ میں حفظ قرآن کے شوق نے دوبارہ کروٹ لی۔ تقریباً ۱۵ پارے حفظ کئے تھے کہ ماہ رمضان آگیا۔ مزید حفظ کا سلسلہ منقطع کر دیا اور سورۃ بقرۃ، آل عمران، یوسف اور پارہ عم شبینہ میں سنائے۔

شوال ۱۳۹۵ھ سے پھر پہلے پارہ ہی سے حفظ کا سلسلہ شروع کیا اور ۲۶ویں پارہ تک پہنچا تھا کہ دوبارہ رمضان شروع ہو گیا۔ حفظ کا سلسلہ پھر منقطع کر دیا۔ لیکن شبینہ میں صرف سورۃ آل عمران سنا سکا۔

تیسرے سال شوال ۱۳۹۶ھ میں پھر پہلے پارہ سے حفظ شروع کیا لیکن چھبیویں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا کہ پھر ماہ رمضان آگیا۔ حفظ کا سلسلہ پھر منقطع کیا اور شبینہ میں سورۃ آل عمران اور پارہ عم سنایا۔

شوال ۱۳۹۷ھ میں ستائیواں اور اٹھائیواں پارہ حفظ کیا، آخر کے دو پارے پہلے سے یاد تھے۔ اس طرح اللہ کی توفیق سے ۱۳، ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ م ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو حفظ قرآن مکمل ہو گیا۔ یہ حفظ تین سال اور تقریباً ڈیڑھ ماہ میں مکمل ہوا۔ اس عرصہ میں دو واقعات ایسے بھی پیش آئے کہ ذہنی پریشانی کی وجہ سے تقریباً چھ ماہ تک حفظ کا سلسلہ منقطع رہا۔ ایک شعبہ میں اختر سعید صاحب کا واقعہ، دوسرے ۱۹۷۷ء کے شروع میں انتخابات کے بعد ملک میں اندرونی خلفشار۔

۵۴ سال کی عمر حفظ قرآن کی عمر نہیں ہوتی اور اس عمر کا حفظ کیا ہوا قرآن یاد بھی نہیں رہتا الایہ کہ انسان کی باقیماندہ عمر فکر معاش سے خالی ہو اور وہ تلاوت کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکال سکتا ہو۔

میں نے حفظ شروع کیا تو پانچ پارے ہی حفظ کئے تھے کہ اپنے پھوپھا سسر حافظ ... صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ذکر کیا تو فرمایا اس عمر میں قرآن حفظ نہیں ہوتا میں نے کہا: میں تو پانچ پارے حفظ کر چکا ہوں۔ فرمایا: مزید پانچ اور یاد کر لو گے لیکن اس کے آگے نہ بڑھ سکو گے۔ میں نے دریافت کیا: آخر کیوں؟ فرمایا قرآن اس وقت یاد ہوتا ہے جب دماغ قوی بھی ہو اور افکار و مشاغل سے آزاد بھی اور اس عمر میں ان میں سے کوئی بات میسر نہیں ہوتی۔ اس لئے انسان کچھ پارے یاد تو کر لیتا ہے لیکن ضعف دماغ کی وجہ سے وہ حفظ قوی نہیں ہوتا اور مشاغل و افکار اتنا وقت نہیں دیتے کہ آگے یاد بھی کیا جائے اور پچھلا دہرایا بھی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اگلا یاد کرتا جاتا ہے، پچھلا بھولتا جاتا ہے۔

حافظ صاحب نے جو بات فرمائی تھی میرے تجربہ نے بھی اسے سو فیصد صحیح پایا تقریباً دس پاروں کے بعد میں اتنا وقت نہ نکال سکا کہ مزید حفظ کر سکوں اور حفظ کردہ کو قائم بھی رکھ سکوں۔ کیونکہ حفظ قرآن کے لئے میرے پاس کوئی مستقل وقت نہ تھا۔ گھر سے شعبہ تک جانے آنے کے تقریباً بیس منٹ، بسوں میں سفر کا وقت اور عصر کے بعد کی تفریح کا وقت۔ یہی اوقات تھے جنہیں میں حفظ قرآن میں صرف کرتا تھا۔ یہ اوقات اگلا یاد کرنے اور پچھلا دہرانے کے لئے کافی نہ تھے۔ فکر معاش اور خانگی مشاغل کی وجہ سے مزید وقت میں صرف نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے دلی کی سی کیفیت شروع ہو گئی۔ میں نے اس کیفیت کو اس طرح دور کیا کہ پچھلا محفوظ رکھنے کی فکر دماغ سے نکال دی اور توجہ کو صرف اگلا حفظ کرنے پر مرکوز کر دیا۔ کرتا یہ تھا کہ ایک رکوع کو ۲۵ بار پڑھتا تھا اور اگلے روز کی تمام نمازوں میں اسی حفظ کردہ حصہ کو دہراتا تھا۔ بظاہر خوب

پختہ ہو جاتا تھا۔اس کے بعد اس کی پروا نہیں کرتا تھا کہ وہ یاد بھی رہا یا نہیں۔اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً بددل ہو کر حفظ کا سلسلہ منقطع کر دیتا۔مجھے اس کا تجربہ بھی ہو گیا تھا کہ مثلاً پہلی بار میں اگر ایک رکوع دس مرتبہ میں اچھی طرح یاد ہوتا تھا، تو بھولا ہوا رکوع صرف تین بار دہرانے میں تازہ ہو جاتا تھا۔میں نے سوچا کہ ایک بار پورا قرآن حفظ کر لوں، دوبارہ حفظ کروں گا تو صرف ۳/۱ وقت صرف ہو گا۔سہ بارہ اس سے بھی کم ، اس طرح تسلسل رہا تو پورا قرآن پختہ ہو جائے گا۔لیکن اس طرح قرآن کریم کا برائے نام حفظ تو مکمل ہو گیا۔مگر عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ افکار بھی شدید ہوتے گئے اور مشاغل بھی گھٹنے کے بجائے بڑھتے ہی گئے۔لڑکوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں جیسے مسائل نے افکار میں شدت پیدا کی اور تصنیف و تالیف کی لگن میں اضافہ کی وجہ سے مشغولیت مزید بڑھ گئی۔اور ۷۳ (قمری حساب سے) سال مکمل ہو جانے کے باوجود اللہ کا شکر ہے کہ ملازمت (سعودیہ میں) اب تک (۱۹۹۴ء) قائم ہے۔اس لئے میں کبھی بھی قرآن میں اتنا وقت صرف نہ کر سکا کہ اسے پختہ کر سکتا۔عمر کے تقاضے کے مطابق ہمت مزید پست ہوئی اور یہ سوچنے لگا کہ مجھے کون سی محرابیں سنانی ہیں ، اگر مجھے صرف آیات احکام یاد رہیں تو بھی کافی ہے۔چنانچہ اب جو کوشش بھی ہوتی ہے یہی ہوتی ہے کہ تلاوت کے دوران صرف آیات احکام کو حتی الوسع پختہ کرتا جاتا ہوں۔اللہ کا شکر ہے کہ اب تمام لڑکوں کی فکر سے بھی آزاد ہو چکا ہوں اور تینوں بچیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی اگر زندہ رہا تو ممکن ہے زیادہ وقت قرآن کی تلاوت میں صرف کر سکوں۔

"ومن یعش عن ذکر الرحمن" الآیہ .... سے استدلال کرتے ہوئے علما لکھتے ہیں کہ قرآن کو یاد کر کے بھول جانے والا قیامت میں اندھا اٹھایا جائے گا۔ممکن ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے اس وعید کا مستحق نہ بنائے کیونکہ کسی وقت بھی مجھے پورا قرآن یاد ہی کب ہوا، اور ایسا بھی نہیں کہ پورا قرآن ہی بھول گیا ہوں۔یہ بھی

ممکن ہے کہ آخر عمر میں اللہ تعالیٰ پھر سے پختہ کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔

تجوید

اللہ تعالیٰ نے مجھے بچپن ہی سے تجوید کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ریاض المدارس کی تعلیم کے زمانہ میں استاد محترم قاری سید فصیح احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشق کی دارالعلوم دیوبند پہنچا تو قاری عتیق صاحب اور قاری حفظ الرحمن صاحب کی شاگردی نصیب ہوئی۔قاری حفظ الرحمن صاحب سے فوائد مکیہ بھی پڑھی اور قرأت کی سند بھی لی۔ٹونک کے محکمہ شرعیہ میں مفتی کی حیثیت سے ملازمت کے دوران قاری عبدالمالک صاحب کے شاگرد قاری صبغتہ اللہ صاحب کی صحبت میسر آئی، مہینوں ان سے قرأت مشق کی۔کراچی یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران مصر کے عالم حافظ اور قاری شیخ محمد محمود شعبان کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ان سے میں نے پندرہ پاروں کی تلاوت اس طرح کی کہ وہ پڑھتے اور میں دہراتا جاتا تھا۔تجوید کی باریکیوں پر شعبان صاحب ہی نے مطلع کیا۔اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ تجوید ہی کا طفیل ہے کہ سعودیہ میں رہتے ہوئے عرب لوگ، میرے عربی لہجہ پر تعجب کرتے ہیں کیونکہ میرا عربی تلفظ کسی عرب سے قطعاً مختلف نہیں۔

شعبان صاحب نے تجوید کی جن باریکیوں پر مطلع کیا ان میں سے ایک اخفاء کی ادائیگی بھی ہے۔ہندوپاک کے تقریباً ستر فیصد قرا، صحیح طور پر اخفاء کی ادائیگی نہیں کر پاتے، حالانکہ اردو زبان میں اخفاء موجود ہے۔اخفاء میں نون کے مخرج کے بجائے اس کے بعد والے حرف کے مخرج پر اعتماد ہوتا ہے۔ہماری زبان میں لنکا اور ڈنکا میں اخفاء ہے اور "دنیا" میں اظہار۔

کھیل اور ورزش

میرے بچپن میں سرونج میں مختلف کھیل رائج تھے۔ گھریلو کھیلوں میں تاش اور شطرنج اور بیرونی کھیلوں میں گلی ڈنڈا، گیند بلا، اندھا بھینسا، کبڈی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے انہی کھیلوں میں حصہ لیا۔ دوسرے کھیل تو کم عمری ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن شطرنج کا شوق جوانی کی پختگی کے بعد ہوا، اور تقریباً بڑھاپے تک رہا۔

ہمارے بچپن اور جوانی میں شطرنج کا کھیل شرفا میں معیوب شمار نہیں ہوتا تھا۔ باپ اور بیٹے بھی ساتھ ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹونک میں باپ بیٹے شطرنج کھیل رہے تھے۔ بیٹے کے منہ سے جوش میں نکلا: "وہ مارا سالے کو" باپ نے اسی وقت بساط الٹ دی اور کہا۔ باپ بیٹے کو اپنے ساتھ شطرنج اس لئے کھلاتا ہے کہ کھیل کا ادب سکھائے، نہ کہ بدتمیزی اور اس کے بعد سے ساری زندگی بیٹے کو اپنے ساتھ شطرنج پر نہیں بٹھایا۔

شوافع کے نزدیک شطرنج کھیلنا جائز ہے۔ علامہ سبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے کہ امام مالک کے استاد حضرت سعید ابن المسیب شطرنج کھیلتے تھے بلکہ بعض صحابہ سے بھی یہ کھیل منقول ہے۔

اسکول ٹیچر ہو جانے کے بعد والی بال اور فٹ بال بھی کھیلی، چھریرا بدن تھا، کافی تیز دوڑ لیتا تھا، فٹ بال میں مجھے رائٹ آؤٹ کی پوزیشن دی جاتی تھی۔

جوانی میں ورزش کا شوق بھی رہا، دو دو سو تک ڈنڈ پیلے اور بیٹھکیں لگائیں، اپنے دوستوں کے ساتھ اکھاڑے میں کشتیاں بھی لڑیں۔ پہلوان تو نہ بن سکا تاہم اس کا اثر اتنا ضرور ہے کہ اب تک میری صحت بری نہیں۔

جوانی میں برسوں میرا یہ معمول رہا اور شادی کے بعد بھی کئی سال تک یہ

معمول برقرار رہا کہ جب بھی موسلادھار بارش ہوتی کپڑے بدلتا اور لاٹھی لیکر بھیگتا ہوا مولا علی کے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر واپس آتا اس میں مجھے بڑا لطف آتا تھا اور مجال تھی کہ بخار تو کیا نزلہ بھی ہو جائے۔

سرونج میں ایک ندی بھی تھی اور اسی لئے قصبہ کا تقریباً ہر بچہ تیرنا جانتا تھا۔ برسات میں جب ندی چڑھتی تو بڑا زور باندھتی، بہاؤ بہت تیز ہوتا تھا۔ جوان ہوا تو اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ چڑھی ہوئی ندی کو پار کرنا میرا بڑا دلچسپ مشغلہ ہوتا تھا۔

سواریاں

بیل گاڑی اور گھوڑی گھر میں تھے۔ اس لئے بیل گاڑی چلانے اور گھڑ سواری کے مواقع بکثرت پیش آئے۔ گھوڑے کی سواری کا اتنا شوق تھا کہ چند دوست مل کر دوسروں کے گھوڑے پانی پلانے کے لئے ندی پر لے جایا کرتے تھے۔ ندی ذرا فاصلہ پر تھی اور اس بہانے کچھ دیر تک گھوڑا دوڑانے کا موقع مل جاتا تھا۔

جاندار سواریوں میں گھوڑے جیسی تیز رفتار اور وفادار کوئی سواری نہیں اسی لئے جہاد کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "الخیل معقود بنو اصیہا الخیر إلی یوم القیامہ" (روز قیامت تک کے لئے گھوڑے کی پیشانی سے خیر باندھی دی گئی ہے)

بچپن میں سائیکل کی سواری بھی سیکھی اور ایک مرتبہ اس سے گر کر جبڑا بھی تڑوا لیا۔ جس کے نتیجہ میں چبانے میں تکلیف کی وجہ سے کئی روز تک نرم حلوا اور دودھ جلیبی کھانے کو ملے۔

سندھ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران ایک اوسط درجہ کی موٹر سائیکل خریدی جس کی آہستہ خرامی کی کیفیت یہ تھی کہ پورے ایکسیلیٹر پر بھی اس کی رفتار تیس سے آگے نہ بڑھتی تھی، موٹر رکشا تک اسے پاس کرتے ہوئے گذر جاتے تھے اور

میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا تھا۔ اس کے بعد ساڑھے تین ہارس پاور کی مچلیس خریدی اور پھر موٹر رکشاؤں سے اس طرح انتقام لیا کرتا تھا کہ جہاں موٹر رکشا نظر آئی، خواہ کتنی ہی دور ہو، زن سے اسے کراس کیا کرتا تھا اور جب تک میرے پاس موٹر سائیکل رہی اس انتقامی کارروائی میں شاذونادر ہی فرق آیا۔

اس کے بعد موٹر کا شوق چرایا۔ بڑے لڑکے اظہر نے جو نیشنل بینک میں ملازم تھا، پراویڈنٹ فنڈ سے تین ہزار روپے قرض لئے اور یونیورسٹی کے سالانہ امتحان کی آمدنی ملا کر، جس سے اساتذہ کے کچھ فالتو شوق پورے ہو جایا کرتے ہیں، تین ہزار روپے میں نے دیئے۔ اس طرح چھ ہزار میں ایک اسکوڈا خرید لی۔ جس کی کیفیت بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم یہ تھی کہ میں اس پر ایک گھنٹہ سوار ہوتا تھا اور وہ مجھ پر ۲۴ گھنٹے سوار رہتی تھی۔ بالآخر اٹھائیس سو کے نقصان سے اسے فروخت کیا۔

اسکوڈا رکھنے کے دوران کراچی کے کاریگروں کا بھی خوب تجربہ ہوا۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ دھکے کے بغیر شاذونادر ہی اسٹارٹ ہوتی تھی اور خصوصاً سردیوں کی صبح میں یہ عالم ہوتا تھا کہ بچے سڑک پر دھکے لگا کر اسے منا رہے ہیں اور لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں۔

ایک بڑے میاں جن سے یہ کہہ کر تعارف کرایا گیا تھا کہ یہ اسکوڈا کے مسیحا ہیں۔ آخر وقت تک اس کے سلف کے پیچھے پڑے رہے اور کئی بار انجن ڈاؤن کر کے اس کا سلف تبدیل یا اپنی دانست میں درست کیا۔ انجن اس لئے ڈاؤن کرنا پڑتا تھا کہ اس کا سلف انجن کے پیچھے تھا۔ اس طرح وہ حضرت خوب پیسے بٹورتے رہے اور ایک بار بھی یہ کہہ کر نہ دیا کہ اس کی بیٹری چارج یا تبدیل کرا لو۔ بیٹری میں اتنی جان تو آجاتی تھی کہ وہ سلف کو ایک دو بار آگے پھینک دیا کرتی تھی اور انجن سے کچھ گھر گھر کی آواز بھی آجاتی تھی، اس کے بعد ٹائیں ٹائیں فش۔ پھر اگر سلف انجن کو اسٹارٹ نہ کرے تو اس میں سلف کا کیا قصور؟

ایک عربی مثل ہے "قال الجدار للمسمار: لم تشقنی؟ قال - سل من یدقنی" (دیوار نے کیل سے کہا۔ تو مجھے کیوں چیر رہی ہے؟ کیل نے جواب دیا اس سے پوچھ جو مجھے ٹھونک رہا ہے)۔

اس کے بعد اللہ نے سعودی عرب پہنچا دیا۔ یہاں کار رکھنا ایسا ہے جیسے پاکستان میں سائیکل رکھنا۔ کسٹم ڈیوٹی برائے نام ہونے کی وجہ سے کاریں بہت سستی ہیں۔ پٹرول اس پانی سے زیادہ سستا جو پلاسٹک کی بوتلوں میں ملتا ہے اور آمدنی اتنی کہ پاکستان میں اس کا تصور بھی مشکل تھا۔ چنانچہ اللہ نے یہاں ایک نہیں اپنی اور بچوں کی ملا کر بیک وقت کئی کئی گاڑیاں دیں۔ فللہ الحمد۔

شکاریات

"سروج" تین اطراف سے گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ تیتر، بٹیر، ہرن، چیتل سابھر، تیندوے، چیتے، شیر ہر طرح کے جانور اس میں موجود تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو مسلمان بچہ بھی جوان ہوتا تھا، بندوق سنبھال لیتا تھا۔ میں بھی عمر کی اس منزل پر پہنچا تو اپنے بہنوئی احمد علی صاحب مرحوم کی بھرمار بندوق پر قبضہ کر لیا۔ اس کا سب سے پہلا نشانہ جو بنا وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیامبر کی نوع سے تھا۔ بندوق میں صرف بارود ٹھونکی اور تقریباً تین گز کے فاصلہ پر ایک شاخ پر بیٹھے ہوئے ہدہد پر داغ دی۔ بھولا پرندہ صرف بندوق کی دھمک اور بارود کے اثر سے بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہا۔ میں نے اسے ذبح کیا اور اس کا دل نکال کر کھایا، کیونکہ سن رکھا تھا کہ ہدہد کا دل کچا کھانے سے ذہن تیز ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک گدھ کو مار دیا۔ والد صاحب سے ذکر کیا تو فرمایا کہ گدھ کی عمر بہت طویل ہوتی ہے اور اس خیال سے کہ شاید اس کی نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی ہو مسلمان اسے نہیں مارتے۔ پھر ایسے جانور کو مارنا بھی درست نہیں

جس سے استفاع جائز نہ ہو۔

میرے شکار کے بے شمار واقعات ہیں جن میں کوئی جدت نہیں۔ ہر شکاری کو اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ صرف دو معمولی سے واقعے کا ذکر کرتا ہوں:

ایک مرتبہ بانسوں کا ٹھیکہ لیا اور بہت گھنے جنگل کے درمیان واقع چھوٹے سے میدان کے ایک گاؤں میں قیام کیا۔ گاؤں ویران تھا اور اس کے ایک گھر کا صرف ایک برآمدہ سالم تھا۔ میں نے جنگلات کے دو سپاہیوں کے ساتھ اسی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ مدتوں سے وہاں آبادی نہ ہونے کی وجہ سے جانور اتنے بیباک تھے کہ مور، مرغیوں کی طرح سامنے پھرتے تھے اور اندھیری رات میں برآمدے سے تھوڑے فاصلہ پر چیتلوں کی آنکھیں اس طرح چمکتی تھیں جیسے کسی نے بیک وقت بے شمار ٹارچیں روشن کر دی ہوں یا ستارے آسمان سے زمین پر اتر آئے ہوں۔ جب میں وہاں پہنچا تو پوری رات کا چاند تھا۔ شکار کی ہوک اٹھی۔ میں چپراسی کے مشورہ سے ایک پکے ہوئے بہیڑے کے درخت پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ محسوس ہوا جیسے ایک چھوٹا ہاتھی چلا آرہا ہے۔ قریب آیا تو دیکھا کہ نیلا تھا۔ نیلے کی نظر مجھ پر پڑی تو ٹھٹکا، گویا قدم وہیں گڑ گئے۔ میں نے سانس روک لی تاکہ ادنی سی حرکت بھی نہ ہو۔ اطمینان ہونے پر وہ آگے بڑھا، ہر قدم پر میری طرف دیکھتا اور ٹھٹکتا۔ بالاخر جانور انسان کے چکر میں آگیا، جونہی اس نے زمین پر سے بہیڑہ کھانے کے لئے گردن نیچی کی میں نے بندوق داغ دی۔ گولی دل میں بیٹھی، پھر بھی وہ ایک فرلانگ پر جا کر گرا۔ چپراسی دوڑے اور دو آدمیوں نے پوری قوت سے بڑا چھرا اس کی گردن پر چلایا تب ذبح ہو سکا۔ رات کو بناتا کون! جھاڑیاں کاٹ کر اسے چھپا دیا گیا اور واپس آگئے۔

علی الصباح چپراسی نے جگایا کہ سامنے ہرن کھڑے ہیں۔ میں نے سوچا کہ نیلے کا گوشت کون کھائے۔ بستہ سے ذرا سر کا اور ہرن کا ایک بچہ شکار کیا۔ نیلے کو جا کر دیکھا تو اس کی پوری ایک ٹانگ کسی درندے نے کھالی تھی۔ قریب کے گاؤں میں ایک

قصائی کو خبر کی۔وہ نیلے کا گوشت گاؤں میں لے جا لے جا کر بیچتا اور اپنے پیسے بناتا رہا۔

ایک مرتبہ بندوق لے کر تنہا نکل پڑا۔ہرنوں کی ایک ڈار دیکھی جو مجھے دیکھ کر دور ہی سے بھاگ پڑی۔لیکن سامنے سے آتے کچھ آدمی دیکھ کر پلٹی اور بندوق کی زد پر میرے سامنے سے بھاگتے ہوئے گذرنے لگی۔کھیت میں قدآدم جوار کھڑی تھی۔اس لئے میں انہیں دیکھ نہ سکتا تھا۔میں نے یہ سوچ کر کہ یہ تو نکلے جاتے ہیں دونالی بندوق کا ایک فائر ان سے آگے کر دیا۔ہرن بدحواس ہو گئے کہ اب کدھر جائیں اور اس بدحواسی میں بلیوں اچھلنے لگے۔ایک منڈی اچھلنے پر جونہی جوار کے پودوں سے اوپر ابھری میں نے دوسرا فائر کر کے گرالیا۔

جب میں نے حیدرآباد آرمی میں ٹریننگ کے خاتمہ پر نشانہ بازی کا ٹیسٹ دیا اس وقت بندوق کی اس مشق نے بگڑتا ہوا کام بنالیا۔

نشانہ بازی کے ٹیسٹ کے لئے جو رائفلیں دی جاتی ہیں انہیں پہلے زیرو کیا جاتا ہے تاکہ رائفلوں کی مار میں بجائے خود غلطی کا احتمال نہ رہے اور پھر بھی نشانہ صحیح نہ لگے تو اسے نشانہ باز کی غلطی شمار کیا جائے۔ٹیسٹ میں جب نشانہ ابھر کر سامنے آیا تو میں نے فائر کیا۔گولی گل سے ایک بالشت نیچے اور ایک بالشت دائیں جانب ہٹ کر گی۔انسٹرکٹر چلایا: ہے صاحب کیا کرتا ہے۔میں نے سوچا کہ میرا نشانہ پہلے سے بھی درست ہے اور اس وقت تو دونوں کہنیاں ریت کی بوریوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔یقیناً یہ بندوق کی غلطی ہے۔میں نے دوسرا نشانہ گل سے ایک بالشت اوپر اور ایک بالشت بائیں جانب لیا۔گولی گل ہوئی۔بقیہ چاروں فائر اسی طرح ٹھیک نشانہ پر بیٹھے اور ہر بار انسٹرکٹر کی آواز بلند ہوتی رہی: شاباش۔

درندوں کے سوا میں نے ہر طرح کے جانوروں کا شکار کیا ہے اور اگر ریاست کے قانون کے مطابق شیر کو مارنا منع نہ ہوتا تو شاید اس کی نوبت بھی آجاتی۔میں نے شیر کو تقریباً بیس ہاتھ کے فاصلہ پر جنگل میں بیٹھا دیکھا ہے۔میں اور میرے ساتھی ماسٹر

اسماعیل صاحب شکار کو جا رہے تھے کہ بیلوں نے بدکنا شروع کر دیا اور شیر کی بو آنے لگی۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ واپس مڑنا ممکن نہ تھا۔ دونالی بندوق تیار کر لی کہ اگر اس نے حملہ کر دیا تو فائر کئے بغیر کوئی چارہ نہ ہو گا، ہوش و حواس اس تصور سے قائم تھے کہ اگر اس نے حملہ کیا تو اس کا نشانہ بیل ہو گا، ہم نہیں۔ شیر کی نظریں راستے کی جانب تھیں لیکن جونہی ہم سامنے آئے، شرافت دیکھئے کہ شیر نے ہمیں ناقابل اعتنا سمجھ کر شان بے نیازی سے گردن دوسری جانب موڑ لی۔ جنگل کا بادشاہ جو ٹھیرا۔

سرونج میں شکار کی اتنی لت تھی کہ جب میں کراچی آیا تو بارہا ایسا ہوا کہ سڑکوں کے کنارے بیٹھے ہوئے پٹھانوں کی بندوقیں لے کر ایک ایک پیسہ میں غبارے اڑایا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ چندو بھیا کے ساتھ شکار کو گیا، واپسی میں مولا علی کے پہاڑ پر ایک بلند پتھر پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ نیچے اور بھی چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ میں نے ایک ٹولے کو لڑھکایا تو بچھو کے چند بچے نظر آئے اور ایک سوراخ میں جانے لگے۔ میں نے سوراخ پر گیہوں کے دل کے برابر موٹا ایک چھوٹا سا پتھر رکھ دیا۔ بچے سوراخ میں گھسنے کے لئے اس پتھر کے گرد چکر لگاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ایک چھوٹا سا سفید بچھو آیا سوراخ کا منہ بند پا کر پتھر کے گرد چکر لگایا، پھر پتھر پر ڈنک مارا، میں نے دیکھا کہ پتھر چھار چھار ہو گیا اور سب یکے بعد دیگرے سوراخ میں داخل ہو گئے۔ مجھ پر خوف سا طاری ہوا کہ جس کے ڈنک سے پتھر کا یہ حشر ہو سکتا ہے انسان کا کیا حال ہو گا۔ فوراً بندوق اٹھائی اور چل پڑا۔ حکیم فخر احمد صاحب سے جب اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ کاش وہ ٹکڑے تم لے آتے۔ بچھو کے ڈنک سے جو پتھر ٹوٹ جائے وہ بہترین سنکھیا بن جاتا ہے

ہم اپنے بچپن میں چار چھ انگل لمبی اور چھوٹے چاقو کے پھل جیسی چوڑی بانس کی کھپچیاں بناتے تھے اور برگد کے پتوں کو توڑ کر ان کی جڑوں سے ٹپکتا ہوا دودھ ان

میں لگا دیتے تھے۔ دودھ ہو الگ کر ایسا چپکتا تھا کہ چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اسی کو لاسہ کہا جاتا ہے۔ کسی جگہ دانہ ڈال کر بیچ میں لاسے رکھ دیا کرتے تھے۔ چڑیاں دانہ پر آتی تھیں تو جس چڑیا کا پیر لاسہ پر پڑا چپک گئی۔ چونچ سے چھڑانا چاہا تو چونچ چپک گئی، پر لگے تو پر چپک گئے۔ غرض جتنا پھڑپھڑاتیں اتنی ہی چپکتی جاتیں اور جب ڈھیر سی چڑیاں چپک جاتیں تو جا کر پکڑ لیا کرتے اور تل کر کھاتے۔ چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں نمک مرچ اچھی طرح جذب ہو جاتا ہے۔ ان بوٹیوں کو کھانے اور نازک نازک ہڈیوں کو کرر کرر چبانے کی لذت اب تک تصور میں ہے۔

ایک مرتبہ میں اور مولانا نذیر الدین صاحب شکار کو جاتے ہوئے حاجی پور سے گذرے۔ راستہ میں ایک کچی کوٹھری کے سامنے کھڑا ہوا ایک ہجوم نظر آیا۔ لوگوں نے بتایا کہ اندر ناگ دیوتا ہے۔ ہم دونوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ تقریباً دو گز لمبا کالا ناگ چولھے کے اوپر بنے ہوئے ایک طاق میں تھا۔ کوٹھری کا عرض چھوٹا تھا۔ اس لئے سامنے جانا احتیاط کے خلاف تھا اور طول میں سے صرف اتنا نظر آرہا تھا کہ وہ مسلسل بل کھا رہا تھا اور کبھی اس کا منہ، کبھی دھڑ اور کبھی دم طاق سے نیچے لٹک آتے تھے۔ مولانا نے کہا کہ اس کا کچھ حصہ اب لٹکے تو میں بندوق چلاتا ہوں تم لکڑی لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ اس کا کمر کا حصہ لٹکا تو مولانا نے اپنی دیسی بندوق داغ دی جس میں چھرے بھرے تھے۔ پوری کمر کٹ گئی۔ صرف ایک انگلی کے برابر کھال جڑی رہی۔ اور پہلے کمر سے نیچے کا دھڑ، پھر اوپر کا دھڑ آہستہ آہستہ گرنا شروع ہوا۔ میں لکڑی لے کر آگے بڑھ گیا کہ منہ گرے تو کچل دوں۔ جیسے ہی منہ گرا تو میری طرف اس تیزی سے لپکا کہ پلک جھپکنے میں اس کا منہ میرے پیروں سے صرف ایک بالشت کے فاصلہ پر تھا اور زبان لپلپا رہی تھی۔ جتنے حصہ میں جان تھی اس نے تو حرکت کی لیکن اگلا جاندار حصہ پچھلے حصہ کو گھسیٹ نہ سکا ورنہ شاید آج یہ سطریں لکھنے کے لئے میں زندہ نہ ہوتا۔ پھر ڈنڈے نے اس کے جاندار حصہ کو بھی بے جان کر دیا۔

اسی لئے سانپ کو مارنے کا اصول یہ ہے کہ کسی ایسی لکڑی سے جو ہاکی کی اسٹک کی طرح آگے سے مڑی ہوئی ہو پہلے اس کی کمر پر مارا جائے تا کہ وہ بھاگنے کے قابل نہ رہے۔ پھر اس کا منہ کچل دیا جائے اس طرح کہ آنکھیں سالم نہ رہیں۔

مشہور ہے کہ سانپ کی جان نکلتے وقت مارنے والے کی صورت اس کی نظروں میں ہوتی ہے اور جان نکلنے پر وہی صورت خشک ہو کر آنکھوں میں رہ جاتی ہے۔ اس کا جوڑا اگر اس کی آنکھوں کو دیکھ لے تو وہ ساری زندگی اس صورت کی تلاش میں رہتا ہے اور مل جائے تو موقع پا کر ڈس لیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

جس زمانے میں ترازو بانٹ کا مشغلہ تھا۔ عشاء کے کافی دیر بعد دوکان بند کر کے عشاء کی نماز کے لئے مسجد کنگران گیا۔ میرے سوا مسجد میں اور کوئی انسان نہ تھا، فرشتوں اور جنات کی خبر نہیں۔ گرمی کا زمانہ تھا، صحن میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد قعدہ کی حالت ہی میں بیٹھا آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہا تھا کہ پنڈلی میں کسی چیز کا لمس محسوس ہوا، حرکت کے بغیر آنکھ کھولی تو تقریباً ایک ہاتھ لمبی، کلائی سے کچھ کم موٹی دینئر تھی (دینئر سانپ کی ایک قسم ہے جو کاٹتی نہیں، پھنکارتی ہے اور اس کی پھونک جہاں پڑ جائے وہیں سے گوشت گلنا شروع ہو جاتا ہے) اللہ کا شکر ہے کہ حواس بجا رہے، میں حرکت کئے بغیر دینئر کی حرکات دیکھتا رہا۔ وہ بائیں پنڈلی سے دونوں رانوں کے بیچ میں آئی پھر دائیں پنڈلی کی طرف مڑی اور جب میں نے دیکھا کہ اس کا منہ گھٹنے سے آگے نکل گیا تو میں نے فوراً گھٹنے پھیلا دیئے اور کھڑا ہو گیا۔ حوض کے پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ لایا اور اسے مارا۔

سرونج میں، اندھیری راتوں میں، ہم خرگوش کا شکار عموماً ٹیمک کے ذریعہ کرتے تھے۔ ایک گیس بتی لے کر اس کے شیشہ کو ٹن کے چوڑے ٹکڑے سے چاروں طرف سے بند کر کے صرف ایک طرف سے متوسط درجہ کا گول سوراخ کر دیا جاتا ہے اور ایک آدمی گیس لے کر چلتا ہے اس طرح کہ سوراخ سے نکلتی ہوئی روشنی صرف

سامنے پڑے ۔ اس کے دونوں جانب بندوقیں لئے ہوئے دو شکاری ہوتے ہیں اور دونوں آدمی تاریکی میں ہوتے ہیں ۔ گیس بتی والا لوہے کے چھلوں کو ایک تار میں ڈال کر مسلسل حرکت دیتا رہتا ہے تاکہ سب کے قدموں کی آواز اس کی آواز میں دب جائے ۔ جب روشنی کسی جانور پر پڑتی ہے تو عموماً صرف روشنی پر اس کی نظر جم جاتی ہے ، کسی اور سمت اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا ۔ اسی وقت بندوق داغ دی جاتی ہے ۔ یہ ٹیمک کا شکار کہلاتا ہے ۔ ہم نے اس طرح بکثرت خرگوش شکار کئے ہیں ۔ کبھی کبھی گیس بتی کے بجائے پانچ سیلوں والی بڑی ٹارچ سے بھی کام لیا ہے ۔

مٹھائی کی عادت

اب تو نہیں لیکن اس وقت "جب آتش جواں تھا" میری یہ کیفیت تھی کہ مٹھائی سے پیٹ بھر لیا کرتا تھا ۔ مقدار کے تفاوت سے نیت تو ہر شخص کی بھر جاتی ہے لیکن متھرا کے چوبوں کی طرح صرف مٹھائی سے پیٹ بھر لینا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ یا تو غیر معمولی فطری مناسبت ہو یا چوبوں جیسی ریاضت جو عموماً اس پر مبنی ہوتی ہے کہ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے ۔

ایک مرتبہ اپنے مرحوم تایازاد بھائی محمد طاہر انصاری صاحب کے پاس الہ آباد جانا ہوا ۔ دو روز گذر گئے دسترخوان پر کوئی میٹھی چیز نہ آئی ۔ میں اور طاہر بھائی جس کمرے میں سوتے تھے اس سے اگر باورچیخانہ میں جانا ہوتا تو اس کمرے میں سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا جس میں بھاوج اور بچے سوتے تھے رات کے وقت جب سب سو رہے ہوں ، جوان دیور کا بھاوج کے کمرے میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن مٹھائی کی طلب نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں خاموشی سے اٹھا اور اس احتیاط کے ساتھ کہ آہٹ سے بھاوج کی آنکھ نہ کھلے ان کے کمرے میں سے ہوتا ہوا باورچیخانہ میں پہنچا اور شکر سے اپنی طلب کو تسکین دے کر جب لوٹا تو گذرتے ہوئے بھاوج نے دریافت کیا: مظہر میاں

کیا بات ہے۔ گویا جاتے وقت ہی بھاوج جاگ گئی تھیں اور چپ اس لئے سادھ لی تھی کہ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہوئی اور راز افشاء کر دیا۔ اس کے بعد کوئی وقت ایسا نہیں گذرا جب دسترخوان پر میٹھی چیز موجود نہ ہوتی ہو۔

میں جس زمانہ میں ٹونک میں مفتی تھا۔ نواب سعادت علی خان بیمار ہوئے، علماء اور مفتیان کرام کو ختم بخاری کے لئے بلایا گیا اختتام پر حسب دستور شیرینی تقسیم ہونی تھی لیکن شکر کی اس زمانہ میں چونکہ قلت تھی اس لئے سب کو دس دس سیر شکر تقسیم کر دی گئی۔ عالم تجرد میں قافلہ کی مسجد کے جس کمرہ میں میری رہائش تھی۔ اس کے سامنے والی مٹھائی کی دوکان میں میرا ماہوار حساب بندھا ہوا تھا۔ حلوائی کو جب معلوم ہوا تو آیا اور کہنے لگا کہ یہ شکر بلیک کے داموں مجھے دے دیجئے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ خوب ہے کہ شکر میں تمہیں دے دوں اور پھر مٹھائی تم سے خرید کر کھاؤں۔ مجھے تو مٹھاس چاہئے خواہ کسی شکل میں ہو۔ بلکہ ملاوٹ کے بغیر ہو تو زیادہ مرغوب ہے میں نے بھی دس سیر شکر اس طرح پوری کی کہ جب بھی طلب ہوئی پاؤ آدھ پاؤ پھانک لی۔

مٹھاس کے رسیا ایک ایرانی عالم واجد علی شاہ کے مہمان ہوئے۔ زردہ کھانے کے بعد واجد علی شاہ نے دریافت کیا: پسند آیا؟ فرمایا "غنیمت است" (غنیمت ہے۔) واجد علی شاہ نے باورچی کو بلایا۔ اس نے کہا حضور برابر کی شکر ملائی ہے۔ دوبارہ اس نے دو گنی شکر ملائی۔ پھر دریافت کیا تو پھر وہی جواب دیا۔ واجد علی شاہ نے حکم دیا کہ امکان کی حد تک زیادہ سے زیادہ شکر ڈال کر زردہ اس طرح پکایا جائے کہ چاول خراب نہ ہوں۔ حکم کی تعمیل ہوئی، چنانچہ جب اس طرح زردہ پک کر آیا تو واجد علی شاہ نے پھر وہی سوال دہرایا اور جواب میں ایرانی عالم نے پھر وہی کہا کہ۔ غنیمت است۔ باورچی کو بلایا گیا تو اس نے کہا کہ حضور ایک سیر چاول میں پانچ سیر شکر ڈالی ہے۔ ایرانی عالم

بولے " بہ بینید خود معترف است کہ یک سیر غیر شیرینی آمیختہ ۔ (دیکھئے خود اعتراف کر رہا ہے کہ شیرنی کے علاوہ ایک سیر کوئی اور چیز بھی ملائی ہے) ۔

مٹھاس سے میری فطری مناسبت کو میرے استاد مرحوم مولانا محمود الحسن صاحب نے مزید جلا دی ۔ اس لئے کہ برسوں معمول رہا کہ کھانا گھر سے لاتا تھا اور اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا ۔ مولوی یوں بھی مٹھاس کے معاملہ میں نیک نام ہیں اور مولانا محمود الحسن صاحب تو گویا اس قسم کے مولویوں کے امام تھے ہر کھانے کے بعد جب ٹیپ کا بند خواہ وہ گڑ کی ڈلی ہی کی شکل میں ہو منہ میں رکھتے تو سرشار ہو کر آنکھیں بند کر لیتے اور اس کا جرم یا رس پیٹ میں پہنچتا تو والہانہ انداز میں گہری سانس لے کر لمبی سی الحمدللہ کہتے ہوئے فرماتے کہ یہ پیٹ میں اگرچہ سب کے بعد گئی لیکن معدہ کی تہہ میں سب سے پہلے پہنچی ۔

برسوں یہ معمول رہا کہ والدہ مرحومہ رات کی باسی روٹی سینک کر اس میں بقدر اشک بلبل گھی ملا کر گڑ کا مالیدہ بنا دیا کرتی تھیں ۔ وہی میرا ناشتہ ہوتا تھا ۔ چائے کا اس زمانہ میں رواج نہ تھا ۔

مجھے یہ بات بھی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ چمچے سے کھائی جانے والی نمکین چیزیں تو بڑے چمچے سے کھائی جائیں اور شیریں چیزیں چھوٹے چمچے سے ۔ معاملہ برعکس نہ ہو تو کم از کم " مثلاً بمثل " تو ہو کہ شیرینی اگر صرف زبان پر ہے ، منہ کے سارے زاویوں میں نہ پھیلے ، تو مزہ ادھورا رہتا ہے ۔

کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ قرآن کریم میں نمک کا تو ذکر ہے وہ بھی " عذب فرات " کے مقابلہ میں " ملح اجاج " کہہ کر لیکن کھانے کی کسی نمکین چیز کا ذکر نہیں ۔ " ولحم طیر مما یشتھون " ضرور ہے ۔ لیکن گوشت بذات خود نمکین نہیں ہوتا ۔ اس کے برخلاف " انھار من عسل مصفی " کا ذکر ہے تو کہیں انار اور انگور جیسے میٹھے پھلوں کا اور پھل کھٹا کسیلا اور کڑوا تو ہوتا ہے لیکن نمکین پھل نہ دیکھا نہ سنا ۔ بلکہ

اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ کہہ دیا جائے تو شاید بعید نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست (نمک کے سوا) کوئی نمکین چیز پیدا ہی نہیں کی۔ انسان نے جس طرح انگور سے شراب بنالی نمک سے نمکین غذاؤں کی عادت ڈال لی۔

بیماریاں

اللہ کا شکر ہے کہ میں بیمار بہت کم ہوتا ہوں۔ برسوں گذر جاتے ہیں۔ بخار تو کیا سر میں درد تک نہیں ہوتا۔ بچپن میں البتہ کئی بار اکتر ااور تجاری میں مبتلا ہوا۔ اس کا علاج میں اس طرح کرتا تھا کہ گھر سے نمک مرچ چرایا، کچی املیاں توڑیں، ندی کے پاٹ پر تیز مرچوں کا کوچا بنایا، لنگوٹ باندھا اور کوچے کا ایک لقمہ منہ میں لے کر پانی میں غوطے لگاتا رہا۔ اس طرز علاج سے اکترے اور تجاری کا شدید بخار بھی اس طرح بھاگتا کہ پھر مدتوں پلٹ کر نہ آتا تھا۔

اب بڑھاپے میں البتہ چند امراض کا شکار ہو گیا ہوں وہ بھی اب تک شدید نہیں جبکہ چاند کے حساب سے میری عمر ۷۳ سال ہو چکی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ سارے جسمانی اور دماغی کام معمول کے مطابق کرتا ہوں۔ گو جوانی جیسی بات نہیں۔

اللہ کا شکر ہے موت سے مجھے کبھی خوف نہیں آتا۔ جب بھی موت کا تصور آتا ہے بس اتنا خیال ہوتا ہے کہ اعمال تو پلے ہیں نہیں، مرنے کے بعد اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

باب سوم

عملی زندگی

کسبِ معاش

ہندوستان میں ملازمت

عدالت شرع شریف ٹونک

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ملازمت کی فکر ہوئی ۔ میں کچھ عرصہ سرونج میں گذار کر والد صاحب مرحوم کی اجازت سے ٹونک چلا گیا تا کہ محکمہ ۔ عدالت شرع شریف میں مفتی کی حیثیت سے ملازمت کے لئے قسمت آزمائی کی جائے ۔

ٹونک میں تقریباً چھ ماہ تک میں اس عدالت میں امیدوار کی حیثیت سے کام کرتا رہا ۔ جب ناظم شریعت قاضی عرفان صاحب میرے کام اور میری طبیعت سے مطمئن ہو گئے تو ایک روز مجھے لے کر ہوم ممبر صاحبزادہ عبدالتواب خاں صاحب کے پاس گئے اور ایک مسل بھی ساتھ لیتے گئے جس میں میرے ہاتھ کی تحریریں تھیں ، اور وہ تحریریں صاحبزادہ صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا کہ ملاحظہ فرمائیے خط کتنا پاکیزہ ہے جیسے موتی پروئے گئے ہیں ۔ شریعت کا محکمہ ہوم ممبر صاحب ہی کے تحت تھا ۔ موصوف نے ضابطہ میں میرے تقرر کی سفارش کر دی اور نواب صاحب نے مفتی کی حیثیت سے میرا تقرر کر دیا ۔

اس محکمہ میں عائلی قوانین سے متعلق ۲۴ قسم کے مقدمات کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق کیا جاتا تھا ۔ میرے علاوہ تین مفتی اور تھے ۔

مجھے چونکہ علم فرائض سے مناسبت تھی ، اس لئے میراث کے تمام مقدمات میرے سپرد کئے جاتے تھے ۔ سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے سید

اسماعیل میاں کی میراث کے مقدمہ نے مجھ سے کافی محنت لی، جس میں مجھے اٹھارہ اٹھارہ بطون کا حساب کرنا پڑتا تھا۔

تقریباً دو سال اس محکمہ میں ملازمت کے بعد میں نے اپنا تبادلہ سرونج کے سعادت ہائی اسکول میں کرالیا۔

سعادت ہائی اسکول سرونج

دسمبر ۱۹۴۲ء میں میری شادی ہوئی جبکہ میں ٹونک کے محکمہ عدالت شرع شریف میں مفتی کی حیثیت سے ملازم تھا۔ بیوی کو ٹونک بلانے کا مطلب یہ تھا کہ بیس روپے ماہوار کی تنخواہ میں مکان کا کرایہ بھی برداشت کروں، گھرداری کا سارا خرچہ بھی اٹھاؤں اور سرونج کی سالانہ آمدورفت کا صرفہ بھی برداشت کروں۔ اس کے مقابلہ میں سرونج میں گھر تھا، والد صاحب مرحوم حیات تھے، اس لئے میں نے اپنا تبادلہ سرونج کے سعادت ہائی اسکول میں کرالیا۔ تنخواہ میں اگرچہ چار روپے ماہوار کا اضافہ ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے تبادلہ زیادہ باعزت جگہ سے کم مرتبہ والی جگہ پر کرایا اور یہ صورت چار روپے ماہوار کے اضافہ کی خاطر نہیں بلکہ محض اس لئے پیش آئی کہ تم کہیں اور ہم کہیں گوارا نہ تھا۔

سعادت ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اعجاز خاں صاحب مرحوم متکبر اور سخت گیر آدمی تھے۔ اسکول کے سینئر اساتذہ ان سے ان کی اکڑفوں کی وجہ سے ناراض رہا کرتے تھے۔ مجھ سے بھی اعجاز خاں کی بنتی نہ تھی۔

ایک مرتبہ میں نے اعجاز خاں سے کوئی بات کرنی چاہی۔ اجازت کے بغیر کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی، چنانچہ میں نے چپراسی کے ذریعہ اجازت طلب کی۔ جواب ملا کہ جو کچھ کہنا ہے لکھ کر بھیج دو۔ میں خاموش ہو گیا اور لکھ کر بھی کچھ نہ بھیجا۔

ایک روز میری عربی کی کلاس تھی، جس میں صرف ایک طالب علم تھا اور چونکہ وہ اس روز غیر حاضر تھا اس لئے میں اسٹاف روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اعجاز خاں نے راؤنڈ لیا اور مجھے اسٹاف روم میں بیٹھا دیکھ کر کہا: آپ کی تو اس وقت کلاس ہے، آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں آپ سے کوئی زبانی بات نہیں کرنا چاہتا جو کچھ دریافت کرنا ہے لکھ کر دریافت کریں۔ میرے اس جواب پر دوسرے اساتذہ کو بھی حیرت ہوئی۔ اعجاز خاں اپنے کمرے میں گئے اور فوراً مجھ سے تحریری طور پر جواب طلب کیا۔ میں نے لکھ دیا کہ اس کلاس میں صرف ایک لڑکا ہے اور آج وہ غیر حاضر ہے اس لئے میں اسٹاف روم میں بیٹھا تھا۔

اسکول شروع ہونے سے پہلے وہ چپراسی کو اسکول کے باہر کھڑا کر دیا کرتے تھے تاکہ اگر کوئی ٹیچر دیر میں آئے تو انہیں رپورٹ کی جائے۔ ایک روز مجھے پندرہ منٹ کی دیر ہو گئی، فوراً جواب طلب ہوا۔ میں نے لکھا کہ آپ جو کئی کئی گھنٹے دیر میں آتے ہیں یا اسکول آکر کئی گھنٹوں کے لئے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب طلب کرنے والا کوئی نہیں، اور مجھے آج پندرہ منٹ کی دیر ہو گئی تو آپ نے جواب طلب کر لیا۔ بہرحال مجھے آنے میں دیر ہوئی ہے اور اس کی جو سزا ہو میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔

اعجاز خاں سے خاص طور پر میری اور مسٹر چاند بہاری لال کی، جو سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے، اسی طرح کی نونک جھونک چلتی رہتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعجاز خاں نے "اوجیر" کو جو ٹونک کا وزیر اعلیٰ تھا، میری شکایت لکھ بھیجی۔ اس شکایت کی بنیاد پر میرا تبادلہ محکمہ تعلیم سے دوبارہ محکمہ شریعت میں کر دیا گیا۔

عدالتِ شریعت میں واپسی

محکمہ شرعیہ میں میری جگہ دوسرے صاحب کا تقرر ہو چکا تھا اور کوئی آسامی خالی نہ تھی۔ مجھے وہاں رک کر سرکاری فیصلہ کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے ملازمت

کی پروانہ کی اور چند ہی روز ٹونک میں رہ کر اپنے دوست محمد یوسف اسحاقی صاحب مرحوم کے پاس دہلی چلا گیا۔

اخبار ڈان کی ملازمت

تیسرے روز ہی اسحاقی صاحب نے مجھے "ڈان" اخبار میں پروف ریڈر کی حیثیت سے ملازم رکھوا دیا۔ اس وقت تک میں نے صرف میٹرک کیا تھا۔ اس عرصہ میں یہ صورت حال پیش آئی کہ محکمہ شریعت نے "اوجیر" کے توسط سے محکمہ تعلیم کو باقاعدہ جواب دے دیا تھا کہ ہمارے پاس کوئی آسامی خالی نہیں۔ اور اتفاق یہ ہوا کہ میرے تبادلہ کے چند روز بعد ہی اعجاز خاں کا بھی تبادلہ ہو گیا اور سرونج میں حامد علی خاں صاحب ہیڈ ماسٹر ہو کر آ گئے۔

سرونج کے اسکول میں واپسی

مجھے "ڈان" میں ملازمت کرتے چار روز ہی گزرے تھے کہ میرے ساتھیوں میں سے ماسٹر اسماعیل صاحب اور ماسٹر مشتاق صاحب میرا پتہ لگا کر دہلی پہنچ گئے اور مجھے سرونج واپس لے آئے۔ محکمہ شرعیہ کا جواب اسکول پہنچ چکا تھا اور میری جگہ اسکول میں خالی تھی۔ لہٰذا مجھے اپنی جگہ پر واپس لے لیا گیا۔ ہندوستان کے حالات دگرگوں ہوئے اور تعصبات کی جڑیں گہری ہوتی گئیں تو میں دل برداشتہ ہو کر گرمیوں کی تعطیلات میں مشتاق صاحب کے ساتھ حیدرآباد دکن چلا گیا۔

حیدرآباد اور فوجی خدمت

فانی بدایونی کا ایک شعر ہے۔

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

فانی کی طرح مجھ پر بھی یہ عقدہ اس وقت کھلا جب قسمت نے مجھے خود حیدر آباد دکن پہنچایا اور کان ملکی اور ہندوستانی کی اصطلاحات سے آشنا ہوئے۔

ملک تقسیم ہو چکا تھا، جا بجا مسلم کش فسادات ہو رہے تھے۔ دماغ ہر وقت کھولتا رہتا تھا کہ بدلہ کس طرح لیا جائے۔ اسلامی ملک کے اعلان جہاد کے بغیر انفرادی طور پر اس طرح بدلہ لینا جائز نہیں کہ کسی بھی بے قصور غیر مسلم کو مار دیا جائے۔ پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا، کیونکہ اس وقت تک کی عمر تو کانگریسیت میں گزری تھی۔ اس کے سوا اور کوئی راہ نہ سوجھی کہ حیدر آباد دکن جا کر فوج کی ملازمت کی جائے۔

ان دنوں میں سرونج کے سعادت ہائی اسکول میں ملازم تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں ۱۶۔ مئی ۱۹۴۸ء کو میں نے حیدر آباد کا رخ کیا اور مولانا سید معظم حسین قاسمی مرحوم کے مکان پر قیام کیا۔ مولانا میرے استاد قاری سید فصیح احمد صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور سرونج کے ریاض المدارس میں کافی عرصہ تک تعلیم پاتے رہے تھے۔ بعد میں پٹنہ کے مدرسۃ شمس الہدیٰ کے پرنسپل ہوئے۔

جلد ہی حیدر آباد آرمی ایجوکیشن کور میں ملازمت کے لئے درخواست دے دی جس کا مثبت نتیجہ چھ ماہ کی صبر آزما مدت کے بعد برآمد ہوا۔ جو رقم ساتھ لایا تھا وہ اس عرصہ میں ختم ہو گئی اور چونکہ ہندوستان نے ان دنوں حیدر آباد کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اس لئے والد صاحب مرحوم بھی کچھ بھیجنے سے معذور تھے۔ جو جذبہ مجھے وہاں لے گیا تھا وہ واپسی کی اجازت نہ دیتا تھا، ساتھ ہی یہ غم بھی ہر وقت ذہن پر سوار رہتا تھا کہ کب تک دوسرے پر بار بنا رہوں۔ سخت پریشانی کا عالم تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

اس عرصہ میں مولانا معظم حسین نے میرے ساتھ حقیقی بھائیوں جیسا سلوک کیا اور قلت معاش کے باوجود ہمہ وقت خندہ پیشانی کے ساتھ میری ہر ضرورت کا لحاظ

رکھا ان کی والدہ اور ہمشیرہ کا سلوک بھی میرے ساتھ بالکل بیٹے اور بھائی جیسا رہا۔ ملازمت کے بعد جب میں نے بیوی کو بلایا تو انہیں بھی بیٹی کی طرح سمجھا اور جب وہاں الطبر پیدا ہوا تو ماؤں کی طرح اس کی بھی پرورش کی۔ اللہ تعالیٰ والدہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور دونوں بہن بھائیوں کو دارین کی سعادتیں عطا فرمائے۔ میں ان کے احسانات زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ (اب جبکہ ۱۹۹۴ء ہے دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے)۔

اس عرصہ میں ٹونک کے مولا بخش صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا جو حیدر آباد میں جنگلات کے افسر تھے اور بعد میں ریاست ٹونک کے ممبر مال (وزیر مالیات) ہوئے۔ فرمایا: یہاں کا آب ودانہ صبر ایوبی چاہتا ہے، بڑی مشکل سے پکڑتا ہے اور جب پکڑ لیتا ہے تو مشکل ہی سے چھوڑتا ہے۔ انہوں نے جو فرمایا تھا اس کا پہلا حصہ تو میں نے بھی سچ ہی پایا۔ انقلاب نہ آتا تو شاید دوسرا حصہ بھی حقیقت بنتے دیکھ لیتا۔

فوجی ملازمت کے سلسلے میں سب سے پہلے ایجوکیشن کور کے کمانڈر کرنل عطاء الرحیم کے سامنے پیش ہوا اس کے بعد ایک بورڈ کے سامنے جس کی صدارت ایک بریگیڈیر کر رہے تھے۔ آخری انٹرویو حیدر آباد آرمی کے کمانڈر ان چیف جنرل عیدروس نے لیا۔ جنرل عیدروس کی مادری زبان عربی تھی۔ میری ڈگریوں میں شاید فاضل دیو بند دیکھ کر عربی میں سوال کیا۔ میرے کچھ پلے نہ پڑا۔ میں نے عربی میں جواب دیا کہ میں نے کتابی عربی پڑھی ہے اور آپ اہل زبان ہیں، آپ کا لہجہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مسکرائے اور اسی پر انٹرویو ختم ہو گیا۔

اس وقت جنرل عیدروس کا چاؤشی لہجہ کیا سمجھ میں آتا۔ سعودی عربیہ میں رہتے ہوئے اب سترھواں سال ہو رہا ہے، نہ میری سمجھ میں سعودی لہجہ آتا ہے نہ مصری۔ یونیورسٹی میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا مخطوطات سے سر کھپاتا رہتا ہوں۔ مقامی لوگوں سے اختلاط ہو تو ان کا لہجہ سمجھ میں آئے۔ مجھ سے کہیں بہتر مقامی زبان تو وہ غیر عرب

سمجھتے اور بولتے ہیں جو دو کانوں پر کام کرتے ہیں۔

بہر حال آخری انٹرویو کے چند روز بعد تقرر کا پروانہ مل گیا اور جسم پر وردی اور کاندھے پر ایک اسٹار اور پٹی سجائے میں ذرا اکڑ کر چلنے لگا۔اس اکڑ کا احساس خود مجھے پہلی بار اس وقت ہوا جب ایک رکشا والے نے میری سائیکل کو ٹکر ماردی اور میں وردی سمیت چت ہو گیا۔دوڑ کر جھپٹا، ڈانٹ کر روکا اور پوری قوت سے اس کی پیٹھ پر مکہ رسید کیا۔بیچارہ عاجزی کے سوا کیا کرتا۔اس کے جانے کے بعد کچھ انسانیت لوٹ کر آئی کہ غلطی تو خود میری تھی۔سائیکل پر دوبارہ اس کا پیچھا کیا اور اسے روک کر معافی مانگی۔غریب کا دل خوش ہو گیا اور میرا دماغ بھی عرش سے فرش پر آگیا۔

جب حیدرآباد اور انڈیا کے درمیان "نورا کشتی" ہوئی تو انڈر ٹریننگ ہونے کی وجہ سے مجھے محاذ پر نہ بھیجا گیا دوسرے فوجیوں سے جو واقعات سننے میں آئے عجیب تھے: دشمن کی فوج کا کہیں پتہ نہیں کہ ریاست کی فوج کو پسپائی کے احکام موصول ہو رہے ہیں۔محاذِ جنگ پر ایمونیشن کی پیٹیاں سپلائی کی جارہی ہیں، ہر پیٹی کا وزن پورا ہے اور محاذ پر انہیں کھولا جارہا ہے تو ٹھیک اسی وزن کے پتھر بھرے ہوئے ہیں۔اس مصنوعی جنگ میں رضاکاروں نے بڑے مخلصانہ جذبات کے ساتھ اپنی جانیں قربان کیں۔ دشمن کا ٹینک آتا دیکھ کر ایک رضاکار سے کچھ نہ بن پڑا تو بڑا سا پتھر بغل میں دبا کر ٹینک کے آگے لیٹ گیا۔ہاتھی کے پیر کے نیچے مکھی کی کیا حقیقت، ٹینک پیستا ہوا نکل گیا۔

بہر حال دکن میں "صادق از دکن" کی تاریخ ایک بار پھر دہرائی گئی۔

قرآن کریم میں حکومتوں کے انقلاب کے اثرات ملکہ سبا کی زبانی ان الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں: "إن الملوک إذا دخلوا قریۃً أفسدوھا و جعلوا أعزۃ أھلھا أذلۃ" (بادشاہ جب کسی بستی میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کرتے ہیں اور اس کے عزت دار لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں)۔

انقلاب تو بہر حال انقلاب ہے لیکن انقلاب کی تہہ میں تعصبات کا لاوا بھی دہک رہا ہو تو نتائج اور بھی روح فرسا ہوتے ہیں۔

میری آنکھوں نے اس انقلاب کے بعد حیدر آباد میں یہی دردناک منظر دیکھا ہبو کیشن کور کی حد تک یہ حال تھا کہ کرنل عطا الرحیم پاکستان سدھار گئے اور ایک مدراسی برہمن کیپٹن شنکرن نے میجر کے عہدہ پر فوری طور پر ترقی پاکر کور کی کمان سنبھال لی۔ کل تک یہ حالت تھی کہ جو نیئر مسلمان افسر بھی کیپٹن شنکرن کو گھاس نہ ڈالتے تھے اور آج یہ حالت ہو گئی کہ سینیئر افسر تک میجر شنکرن کا سامنا کرتے ہوئے کانپتے تھے۔

میں ایک سال سے کور کی گاڑیوں کا انچارج تھا۔ میجر شنکرن نے یہ چارج ایک ہندو افسر کو دلا کر مجھے اس حال پر چھوڑ دیا کہ میرے پاس کوئی کام ہی نہ تھا۔ تقریباً چھ ماہ بعد وہ ہندو پندرہ روز کی رخصت پر جانے لگا تو میجر کے حکم سے یہ کام مجھے سنبھالنا پڑا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ واپس آکر اسی کو یہ کام کرنا ہے اس سے باقاعدہ چارج نہ لیا۔ لیکن واپس آکر اس نے باقاعدہ چارج لینا شروع کر دیا۔ اور تمام چیزیں تو ٹھیک تھیں، پیٹرول ناپا گیا تو اس میں ۵۵ گیلن کی کمی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب پیٹرول کی قلت تھی اور بلیک سے پیٹرول پانچ روپے فی گیلن فروخت ہوتا تھا۔ میں نے چارج نہ دیا۔ رسالدار میجر نے جو مسلمان تھے، دریافت کیا تو میں نے حقیقت حال بتا دی۔ کہا کہ مجھے پہلے ہی اس کا شبہ تھا، لیکن چونکہ شبہ تھا اس لئے تم سے اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم باقاعدہ چارج بھی نہ لو گے۔ دیکھو! اگر اپنے باپ سے بھی چارج لو تو باقاعدہ لو ورنہ اس کے لئے تیار رہو کہ جو نتائج بھی ہوں وہ تمہیں بھگتنے ہیں۔ جب چارج میں تاخیر ہوئی تو میجر شنکرن کے سامنے میری پیشی ہو گئی۔ ان کے اور میرے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

میجر: (بالکل فرعونی انداز میں) ابتک چارج کیوں نہیں دیا؟

میں: چارج کیسے دوں، ۵۵ گیلن پیٹرول کم ہے۔

میجر: تم نے بیچ کھایا؟

میں: ایک سال تک کام کرنے کے بعد جب میں نے چارج دیا تھا تو ایک قطرہ بھی کم نہ تھا۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ میں نے پندرہ روز میں ۵۵ گیلن بیچ کھایا تو مجھے اسی وقت کوارٹر گارڈ بھیج دیجئے۔

میجر: میں کچھ نہیں جانتا، دو روز کے اندر اندر چارج دو۔

میں: ایک ہفتہ سے پہلے چارج نہیں دے سکتا۔

میجر: تم جا سکتے ہو۔

ایک سال تک یہ کام کرنے کی وجہ سے ہندو ڈرائیور تو میرے حسن سلوک کے نتیجہ میں قابو میں تھے ہی۔ میں نے دو ڈرائیوروں سے کہا کہ روزانہ ایک ایک گاڑی خراب کر کے ورکشاپ بھیجو۔ اور ورکشاپ والوں سے، کہ ان سے بھی میرے تعلقات تھے، کہہ دیا کہ ہر گاڑی کی مرمت اور ٹیسٹ کے لئے مزید پیٹرول طلب کرنا اور میں پیٹرول صرف کاغذ پر بھیجوں گا، حقیقتہً نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ایک ہفتہ میں ۶۵ گیلن پیٹرول کھپایا۔ دس گیلن پیٹرول دونوں ڈرائیوروں کو دیا کہ اسے بیچ کر باہم تقسیم کر لو اس کے بعد چارج دے دیا۔

چارج دینے کے بعد میجر شکرن نے پھر بلایا اور دریافت کیا۔ پٹرول کی کمی کس طرح پوری ہوئی؟ میں نے جو حقیقت تھی اس کا اظہار کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔

ہیڈ کوارٹر میں ایک ہندو میجر ہی تمام یونٹوں کے پیٹرول کا حساب کتاب کا انچارج تھا۔ مجھے یہ بات کئی روز بعد معلوم ہوئی کہ میجر شکرن نے ہیڈ کوارٹر کے اس ہندو میجر کو ایک خفیہ خط لکھا تھا کہ اس مہینے کے پیٹرول کے حساب میں اگر تمہیں کچھ خامی نظر آئے تو اسے نظر انداز کرنا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو اسی وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ پرانے لوگ شادی بیاہ کے موقع پر لڑکے کی عزت و امارت کے

بجائے سب سے پہلے یہ دیکھا کرتے تھے کہ وہ ہڈی کا کیسا ہے اس کی وجہ عامیانہ محاورہ کے مطابق یہ تھی کہ "اصل سے دغا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔" میجر شنکرن چونکہ ذات کا برہمن تھا اس لئے معاملات جب صداقت کے ساتھ اس کے سامنے آگئے تو اس کی نسلی شرافت رنگ لائی، ورنہ مجھے فوجی جیل بھیج دینا اس کے لئے کیا مشکل تھا۔

انقلاب کے بعد حیدر آباد آرمی ڈسبینڈ ہونے لگی۔ ایمو کیشن کور ختم کئے جانے سے کچھ روز قبل میرا تبادلہ فرسٹ انفنٹری بریگیڈ میں کر دیا گیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اب کیا انڈین آرمی کے تحت پاکستان آرمی سے جنگ کروں گا، اپنی سبکدوشی کی درخواست پیش کر دی جسے بخوشی منظور کر لیا گیا۔

کس جذبہ سے فوجی ملازمت کی تھی اور انجام کیا ہوا" اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

یہ حقیقت ہے کہ میں نے کسی ملازمت کو فوجی ملازمت سے بہتر نہیں پایا۔

ریاست کے دور میں دولت کی ریل پیل تھی اور دولت کی کثرت جس اخلاقی انحطاط کا سبب بنتی ہے وہ انحطاط ریاست کے مسلمانوں پر بدرجہ اتم کار فرما تھا۔ داشتہ (یورپی اور امریکی گرل فرینڈ سے کم تر و بدتر) رکھنے کا رواج عام تھا اور خود داشتہ بھی یہ کہتے ہوئے نہ شرماتی تھی کہ میں فلاں کی داشتہ ہوں۔

ایک مرتبہ گرمیوں کی ایک شام میں مغرب سے کچھ پہلے ایک محل کے پاس سے گزرا۔ اس کی چھت پرستان بنی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا یہ کون ہیں؟ جواب دیا۔ فلاں پرنس کی داشتائیں ہیں، اور یہ محل صرف ان کی داشتاؤں کے لئے مخصوص ہے۔

ہندوستان کے ایک شریف خاندان نے اپنے دو لڑکوں کی شادی کے لئے ہندوستان ہی کے دوسرے شریف خاندان کی دو بیٹیوں کے لئے، ایک مشترک دوست کے ذریعہ رشتہ بھیجا۔ لڑکی والوں نے غور و فکر کے لئے مہلت مانگی۔ کافی دن گزرنے

پر کوئی جواب نہ ملا تو مشترک دوست کو بھیجا گیا۔ لڑکی والوں نے جواب دیا کہ رشتہ آنے کے بعد ہم نے معلومات کیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ لڑکوں نے کبھی کوئی داشتہ نہیں رکھی تو ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ مرد ہیں، ثبوت کے بغیر اپنی لڑکیوں کی قسمت کیسے پھوڑ دیں۔

کسی نواب کی ایک عظیم الشان حویلی تھی صرف ایک مخبوط الحواس بیٹا ان کا وارث ہوا۔ والی ریاست میر عثمان علی خان صاحب نے لڑکے کو اپنی کفالت اور حویلی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ صدر دروازے پر تالا ڈال دیا گیا اس پر سرکاری مہر لگا دی گئی اور پہرے دار مقرر کر دیئے گئے۔ حویلی کے ایک حصہ میں خزانہ تھا اور دوسرے حصہ کی بالائی منزل جامعہ نظامیہ کے طلبہ کے ہوسٹل کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ دونوں حصوں کے درمیان دو بہت بلند دیواروں سے گھرا ہوا ایک وسیع قطعہ اراضی تھا جس میں آم کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ ہوسٹل کے طلبہ ہر سال آموں کو پھلتے، پکتے، گرتے اور خاک میں ملتے دیکھتے اور حسرت کرتے رہ جاتے۔ ایک سال کچھ طلبہ نے رسوں کا اہتمام کیا اور آم کھانے کے لئے نیچے اتر گئے۔ ٹہلتے ہوئے اس حصہ تک بھی جا پہنچے جہاں خزانہ تھا۔ کمروں کی صرف کنڈیاں چڑھی تھیں کوئی تالا نہ تھا۔ ایک کمرہ کھول کر دیکھا تو محبوب علی خان کے دور کے روپیوں سے بھرا ہوا تھا، دوسرے میں صرف چاندی کی اینٹیں تھیں تیسرے میں صرف سونے کی، چوتھے میں صرف جواہرات۔ عمر کے تفاوت سے جس کو جو بھایا اٹھایا اور واپس چڑھ آئے۔ پھر کئی بار یہ واردات ہوئی۔ بازار میں محبوب علی خاں کے دور کے سکہ کی، جس کا چلن نہ تھا، ریل پیل ہوئی تو پولیس چونکی۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ یہ طلبہ کی حرکت ہے۔ سنا ہے تقریباً دو لاکھ کی مالیت کی چوری ہوئی تھی، ۱۹۵۰ء سے پہلے کے دو لاکھ۔ سرکار کو خبر ہوئی تو معاملہ کو محض اس خیال سے دبا دیا کہ ان کے استاد کے قائم کردہ مدرسہ کی بدنامی نہ ہو۔

حیدر آباد پہنچ کر ایک دو روز بعد ہی کسی دوکان پر گیا اور پوچھا: فلاں چیز ہے۔

دوکاندار نے اس طرح گردن ہلا کر، جس طرح ہمارے اطراف میں نفی کے لئے ہلاتے ہیں، جواب دیا۔ جی ہو۔ میں واپس جانے لگا تو بولا: لینا نہیں؟

کھانے مجھے دو ہی جگہ کے پسند آئے۔ ایک دلی دوسرے حیدر آباد۔ لکھنو جانے کا اتفاق تو ہوا ہے قیام کا موقع نہیں ملا۔ کھٹاس کو نکال دیا جائے، ہمارے ذوق کے مطابق، تو حیدر آبادی کھانوں کا جواب نہیں اور ملکی کے نزدیک کھٹاس نکال دی گئی تو رہا ہی کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بنگالی دوست کے گھر مچھلی کھاتے ہوئے میں نے بو کی شکایت کی تو بولے: بو نہ ہو تو مچھلی ہی کیا۔

ایک دعوت میں ساگ پر نظر پڑی۔ اس کا ایک لقمہ لیا تو اتنا کھٹا کہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا، نہ اگلتے بنے نہ نگلتے۔ انتہائی جبر کر کے حلق سے اتارا۔ املی کے پتوں کا ساگ تھا اور اس میں بھی شاید مزید کھٹائی پڑی تھی۔ اس کے بعد مجھے کھٹائی سے اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ حیدر آباد سے واپس آکر بھی دہی کے سوا برسوں کوئی کھٹائی زبان پر نہ رکھی۔

حیدر آباد کے بگھارے بیگنوں کا جواب نہیں، بشرطیکہ کھٹائی کم ہو، بگھارے بیگن سامنے ہوں تو انسان قورمہ کو بھی ہاتھ نہ لگائے۔ ویسے قورمہ بھی کافی لذیذ ہوتا ہے۔ مصالح کی لذت بوٹیوں کے اندر تک پیوست ہوتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ قورمہ ہم اس طرح پکاتے ہیں کہ دہی میں گرم مصالح وغیرہ ملا کر اس میں بوٹیاں ڈال دیتے ہیں اور انہیں بانس کی لمبی لمبی نوکدار تیلیوں سے بہت دیر تک گودتے ہیں، پھر چند گھنٹوں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

کھٹاس کی طرح مٹھاس بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ خوبانی کا میٹھا تو بالائی ملائے بغیر مجھ جیسے مٹھاس کے رسیا سے بھی چند لقموں سے زیادہ نہ کھایا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک نواب صاحب کے گھر زردہ کھایا، تصور اس کی لذت سے آج تک سرشار ہے۔

حیدر آباد میں چہار مینار کے قریب لسی کی ایک دوکان بڑی مشہور تھی۔ چار

آنے سے دو روپیہ تک کا ایک گلاس تھا۔ اس میں اتنی خوشبودار چیزیں ڈالی جاتی تھیں کہ ایک گھنٹہ تک جو ڈکار بھی آتی تھی خوشبودار ہوتی تھی۔

حیدرآباد کے لوگ خ کو ق اور ق کو خ بولتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے کراچی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کو ہمارے رفیق کار بلخی صاحب مرحوم کی شکایت میں انگریزی میں ایک خط لکھا۔ وہ خط صدر شعبہ کے توسط سے بلخی صاحب کے پاس پہنچا۔ مقصود یہ تھا کہ اپنی پوزیشن واضح کی جائے۔ بلخی صاحب مرحوم ذہین آدمی تھے، خط دیکھتے ہیں فرمانے لگے کہ یہ مولوی فلاں صاحب (حیدرآبادی) کا ہے۔ پوچھا گیا کہ آپ نے کیسے سمجھا؟ کہا: اس میں خ کو ق لکھا گیا ہے۔ Balakhi کے بجائے Balaqi لکھا تھا۔

اللہ کا شکر ہے حیدرآباد دکن کا قیام عافیت سے گزر گیا۔

کیمیاسازی

حیدر آباد آرمی سے استعفا دے کر سرونج آیا تو بیروزگاری سے سابقہ پڑا۔ دور بدل چکا تھا، اس لئے ملازمت ملنے کی توقع نہ تھی۔ لیکن شکم پری کا کوئی سہارا تو ہونا چاہئے تھا۔ خیال آیا کہ کاش کیمیا کا کوئی نسخہ یا خزانہ ہاتھ آجاتا تو پوری زندگی بے فکری سے گزرتی۔ اسی دوران مرزا عبدالغفار بیگ صاحب سے ربط ہوا۔ موصوف کو اس طرح کی دھت تھی پہلے تو مجھے لئے لئے سرونج کے اطراف کے ویران علاقوں میں گھومتے رہے کہ وہ بوٹی مل جائے جس میں پارہ حل ہو جاتا ہے تاکہ ان کے خیال کے مطابق کیمیا کا ابتدائی مرحلہ سر ہو سکے۔ خدا خدا کرکے ایک بوٹی ملی۔ بڑے خوش ہوئے۔ گھر آکر اس کے پتوں کو پارہ کے ساتھ کھرل میں ڈال کر گھٹائی شروع کر دی۔ دیکھا کہ پارہ پتوں میں جذب ہو کر رفتہ رفتہ اپنا وجود ختم کرتا جارہا ہے حتیٰ کہ پارہ کا نام ونشان بھی نہ رہا۔ بہت خوش ہوئے۔ لیکن فرمایا کہ موسل چلتے رہنا چاہئے تاکہ پارہ کی نادیدہ رمق بھی باقی نہ رہے۔ میں نے مشق ستم جاری رکھی۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ پارہ دوبارہ نمودار ہونا شروع ہوا اور جس طرح رفتہ رفتہ تحلیل ہوا تھا اسی طرح رفتہ رفتہ پورا پارہ نکل آیا۔ موصوف پر مایوسی طاری ہوئی اور پھر کیمیا کے اس عمل کو ترک کر دیا گیا۔

ایک روز مجھے لے کر راؤجی کی حویلی گئے۔ یہ ایک ہندو راجہ کی بہت بڑی حویلی ہے اور اس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ حویلی کی چھت پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ مرزاجی مسجد کے فرش اور دیواروں کو مختلف مقامات سے انگلی کے ذریعہ ٹھونک ٹھونک دیکھتے رہے اور فرمایا کہ اس میں کسی جگہ ایک پارس پتھر، ایک قلم اور حویلی کے خزانہ کا نقشہ چھپا دیا گیا ہے۔

میں ایسے دو حضرات کو جانتا ہوں جن کے متعلق میرا گمان غالب یہ ہے کہ انہیں کیمیا کا فن آتا تھا۔ایک اچھن میاں دوسرے قاری صبغتہ اللہ دونوں سرونج کے باشندے تھے۔

اچھن میاں کہتے تھے کہ یہ فن میں نے اپنے والد سے سیکھا ہے۔ان کے والد کا اصل نام تو اللہ جانے کیا تھا، سرونج میں انہیں ننھو خان صاحب کہتے تھے۔اچھن میاں کا بیان ہے کہ میرے والد کو سونا بنانا بھی آتا تھا اور چاندی بنانا بھی۔نواب ابراہیم علی خان صاحب کو ایک مرتبہ انہوں نے ربیع الاول میں بارہ من چاندی ڈھال کر دی تھی۔

ٹونک کے نواب ابراہیم علی خان صاحب میلاد شریف کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ بارہ روز تک عشاء کے بعد میلاد کی مجلس ہوتی تھی اور چاندی اور سونے کے جھاڑ فانوس اور درخت و گلدستے بنائے جاتے تھے اور نکتی کے ایک ایک پاؤ کے لڈو تقسیم کئے جاتے تھے۔شرکاء کی کوئی تخصیص نہ تھی۔عقیدت کی بنا پر یا شیرینی کی لالچ میں پورا ٹونک ہی ابل پڑتا تھا۔نواب صاحب ہاتھ میں تسبیح لئے رات بھر مجلس میلاد میں بیٹھے رہتے۔ویسے بھی نمازی اور ذاکر و شاغل آدمی تھے۔

اچھن میاں کہتے تھے کہ میرے والد نے مجھے سونا بنانے کا نسخہ نہیں بتایا۔وہ کہتے تھے کہ مجھے جس طرح کا سونا بنانا آتا ہے وہ تیزاب پر نہیں ٹھہرتا اس میں دھوکا ہے۔ البتہ چاندی کو کتنی ہی مرتبہ تیزاب میں ڈال دو اس میں فرق نہیں آتا۔اچھن میاں تجارت کرتے تھے۔ہمارے سامنے انہوں نے کئی بار جوش میں کہا کہ میرا دل غنی ہے، جب چاہوں گا چاندی کے کڑھاؤ کے کڑھاؤ ڈھال لوں گا۔

میری طرح ماسٹر محمد اسمٰعیل خان صاحب مرحوم اور حمید میاں سے بھی اچھن میاں کی بے تکلفی تھی۔حمید میاں اور ہم سب اچھن میاں کی بیٹھک میں شطرنج کھیلا کرتے تھے۔حمید میاں ان کے رشتہ کے بھائی تھے اور ہم سب اچھن میاں سے عمر میں

پھونے تھے۔

مجھ سے حمید میاں اور ماسٹر اسماعیل خان صاحب نے بیان کیا، اور مجھے ان کے بیان میں دروغ گوئی کا شبہ نہیں، کہ ایک روز باتوں باتوں میں چاندی بنانے کا ذکر آ گیا، دونوں نے اچھن میاں کو چڑھا دیا وہ بھرے میں آ گئے۔ اپنے لڑکے کو آواز دی کہ انگیٹھی لاؤ، اسے دہکایا اور کٹھالی میں رانگ ڈالی ایک شیشی اندر سے لائے۔ جب رانگ چرخ کھانے لگی تو شیشی میں سے ایک تنکے سے اکسیر نکالی اور رانگ پر ڈال دی وہ چرسے بیٹھی اور چاندی بن گئی۔

حمید میاں اور اسماعیل خان صاحب کا خیال ہے کہ اچھن میاں کو اکسیر بنانا نہیں آتا تھا، بس ایک شیشی میں انہیں اپنے والد کی بنائی ہوئی اکسیر ہاتھ لگ گئی تھی اور وہ صرف اسی قدر چاندی بنانے پر قادر تھے جتنی اس اکسیر سے بن سکتی تھی۔ واللہ اعلم۔

اچھن میاں کے کچھ حالات میں نے اپنی کتاب "کچھ یادیں" میں بھی لکھے ہیں اور اس میں حضرت مفتی عبدالمجید صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر بھی ایک مفصل مضمون ہے۔

قاری صبغۃ اللہ صاحب، قاری عبدالمالک صاحب کے شاگرد تھے۔ مشہور تھا کہ اگر انہیں پردہ میں بٹھا دیا جائے تو شبہ یہ ہوتا تھا کہ قاری عبدالمالک صاحب پڑھ رہے ہیں۔ مختلف لحنوں سے قرآن پڑھتے تھے اور خاصے خوش الحان تھے۔ کچھ روز میں نے بھی ان سے ٹونک میں، جبکہ میں شریعت میں مفتی تھا، قرأت کی مشق کی ہے۔

ایک مرتبہ منشی فاضل کا امتحان دینے ٹونک سے دہلی جانے لگا تو قاری صاحب میرے پاس زرد رنگ کا ایک سفوف لائے جس میں سنہری ذرات تھے کہنے لگے کہ دہلی میں دوافروشوں کی دوکانوں پر معلوم کرنا، اگر یہ مل سکے تو لیتے آنا۔ میں نے سبب پوچھا کمال بے تکلفی ہونے کے باوجود پس وپیش کے بعد بتایا کہ یہ اس اکسیر کے نسخہ کا ایک جزو ہے جس سے سونا بنایا جاتا ہے۔

پھر اس کا شان نزول بتایا کہ میں ایک رمضان میں حسب عادت تراویح میں قرآن سنانے کے لئے سورت گیا۔ وہاں ایک درویش آئے اور پورے مہینے میرا قرآن سنا۔ حالانکہ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ بکثرت سورت آتے ہیں لیکن کبھی ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ٹھیرتے۔ عید کے بعد وہ مجھے ایک عطار کی دوکان پر لے گئے اور ایک پرچہ پر دواؤں کے نام لکھ کر اسے دیئے کہ انہیں باندھ دو۔ دوائیں لے کر آئے۔ میرے سامنے اکسیر بنائی اور کہتے گئے کہ اچھی طرح سمجھ لو۔ اس اکسیر کے ذریعے تانبے سے سونا بنا کر دکھایا اور پھر اکسیر کا نسخہ اور بنی ہوئی اکسیر کی شیشی مجھے دے دی، یہ کہہ کر کہ میں تمہارے قرآن سے بہت خوش ہوا اور جی چاہا کہ یہ نعمت تمہیں دے دوں۔ دواؤں کی تھوڑی تھوڑی مقدار بھی نمونہ کے طور پر مجھے دی تھی۔

کہنے لگے کہ میں نے اس اکسیر کے ذریعہ سیروں سونا بنایا ہے اور اب جبکہ اکسیر قریب الختم ہے تو میں نے اس کے اجزاء خریدے۔ سارے اجزاء مل گئے۔ ایک جزء اس نام سے نہیں ملتا جو نسخہ میں لکھا ہوا ہے، اور اسی کا یہ سفوف ہے۔ یہ بھربھری ڈلی کی طرح تھی، رنگ زرد تھا، اس میں ابر پڑے ہوئے تھے اور اس میں سنہری ذرات شامل تھے۔ اس کا نام نسخہ میں "........ہلدی" ہے (مجھے یاد نہیں رہا کہ قاری صبغتہ اللہ نے مجھے کیا نام بتایا تھا)۔ بہرحال میں نے دہلی میں بعض دوکانوں پر تلاش کیا لیکن خالی ہاتھ واپس آیا۔

ایک مرتبہ حیدر آباد (دکن) میں، جبکہ میں فوج میں ملازم تھا، رسالدار میجر حفیظ الدین صاحب سے اچھن میاں کے چاندی بنانے کا ذکر آگیا۔ فوجی مزاج کے مطابق کہنے لگے کہ تم بے وقوف ہو، تمہیں چاہئے تھا کہ چند دوست مل کر انہیں جنگل میں لے جاتے اور وہاں اچھی طرح ان کی ٹھکائی اڑاتے۔ ان سے اجزاء لکھواتے اور خرید کر لے جاتے پھر اپنے سامنے اکسیر اور چاندی بنواتے، پھر انہیں رہا کرتے اور بعد میں معافی مانگ لیتے۔

لکشمی کا عمل

ایک روز عبدالغفار بیگ صاحب نے فرمایا کہ دولت حاصل کرنے کے لئے اگر چاہو تو لکشمی کا عمل کر سکتے ہو۔ میں نے دریافت کیا وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ہندوؤں کی دولت کی دیوی لکشمی دراصل ایک جن عورت ہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مریدنی ہے۔ کسی ویران کنوئیں کے پاٹ پر بیٹھ کر ایک عمل چالیس روز تک پڑھا جاتا ہے۔ چالیسویں روز لکشمی آتی ہے اور ذرا فاصلہ پر سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس قدر حسین اور جاذب نظر ہوتی ہے اور اتنی ہیجان انگیز خوشبو میں بسی ہوتی ہے کہ عامل کو اپنے اوپر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر عامل ضبط کرے اور عمل کو جاری رکھے تو تھوڑی دیر کے بعد اڑ جاتی ہے۔ اس کی پرواز کے بعد اگر اس جگہ کو کھودا جائے جہاں وہ بیٹھی تھی تو ایک لاکھ روپے کی مالیت کا سونا نکلتا ہے۔ اور اگر عامل بے قابو ہو کر اس کو ہاتھ لگا دے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ فرماتے تھے میں نے بھوپال میں ایک شخص کو دیکھا ہے جس نے یہ عمل کیا تھا اور پاگل ہو کر سڑکوں پر "ہائے پری! ہائے پری!" چلاتا تھا۔

میں نے جواب دیا کہ میں دولت کی لالچ میں پاگل ہو جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

دفینے معلوم کرنے کا عمل

ایک روز عبدالغفار بیگ صاحب نے فرمایا کہ کسی مسجد میں عشاء کے بعد، جب کہ سب نمازی رخصت ہو چکے ہوں، حصار میں بیٹھ کر اول و آخر گیارہ گیارہ بار درود شریف اور درمیان میں پانچ سو بار "یاخالص یا مخلص یا خلاص بحق خواجہ خضر مہتر الیاس" چالیس روز تک پڑھا جائے تو کھلی آنکھوں دفینے نظر آنے لگتے ہیں۔ میں نے ٹوری کی مسجد میں یہ عمل شروع کر دیا۔ پہلی رات ہی کو خواب دیکھا کہ میں اپنے تایا زاد بھائی مہدی حسن صاحب مرحوم کے مکان میں داخل ہو رہا ہوں۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی تقریباً انگوٹھے کی موٹائی کے برابر دومنہ کی ایک سبز ناگن پر نظر پڑی جو ایک سوراخ میں داخل ہو رہی تھی۔ ناگن کا دوسرا منہ باہر تھا اور اتنی لمبی تھی کہ سوراخ میں گھستی جارہی تھی، لیکن ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

صبح ہوئی تو اس خواب کا ذکر محمد شاہ صاحب عرف شاہ جی سے کیا جن کی دوکان پر میری بیٹھک تھی اور جو اس طرح کے معاملات میں میرے ہمراز تھے۔

دوسری رات خواب دیکھا کہ تلیا والے کالے خانصاحب کے ساتھ کنگران کی مسجد کے برآمدے میں بیٹھا ہوں۔ حوض کی طرف سے سنہرے رنگ کا ایک خوبصورت بچھو ہماری طرف آیا۔ بچھو کی دم تقریباً ایک گز لمبی اور ڈیڑھ بالشت چوڑی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا سر تھا۔ کالے خان صاحب نے گھبرا کر کہا۔ بچھو! میں نے کہا: گھبرائیں نہیں ہمیں نہیں کاٹے گا۔ چنانچہ بچھو میری ران سے اپنی دم رگڑتا ہوا چلا گیا۔

دوسرے روز حسب معمول اس خواب کا ذکر بھی میں نے شاہ جی سے کیا۔

تیسری رات خواب دیکھا کہ میں اور کپتان الیاس صاحب (ایک بڑے ذاکر و

عامل بزرگ جو ریاست کی فوج میں کپتان تھے) ایک اونٹنی پر بیٹھے گڈری بازار سے گزر رہے ہیں۔ اونٹنی کی مہار کپتان الیاس صاحب کے ہاتھ میں ہے اور میں پیچھے بیٹھا ہوں۔ (واضح رہے کہ مذکورہ عمل کے آخر میں "الیاس" نام ہے۔)

دوسرے روز اس خواب کا ذکر شاہ جی سے کیا ہی تھا کہ کورٹ کی طرف سے کپتان الیاس صاحب کو آتے دیکھا۔ تسبیح ہاتھ میں تھی۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا اور چلتے چلتے ان سے گذشتہ رات کے خواب کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ تم کوئی عمل تو نہیں پڑھ رہے ۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا، عمل کے نتیجہ میں جو خواب نظر آئے اس کا کسی سے ذکر نہیں کرتے، عمل کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد کئی روز تک عمل پڑھتا رہا کوئی خواب نظر نہیں آیا۔ اور یہ سوچ کر کہ غالباً عمل کا اثر ختم ہو چکا ہے، میں نے وہ عمل ترک کر دیا۔

اس کے بعد شاہ جی نے حاضرات کا عمل بتایا۔

حاضرات کا عمل

محمد شاہ صاحب عرف شاہ جی نے میری بے روزگاری اور کیمیا یا دست غیب کے اعمال میں میرا اشتغال دیکھ کر ایک روز کہا کہ اگر کوئی عمل کرنا ہی ہے تو میں آپ کو حاضرات کا عمل بتاتا ہوں، جس میں کچھ پڑھنا پڑھانا نہیں۔ لیکن اگر کرنا ہے تو یہ عمل آپ اپنی ذمہ داری پر کریں گے، میں اس کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا، اس لئے کہ میں اس عمل کے نتیجے میں نقصان اٹھا چکا ہوں۔

شاہ جی نے بتایا کہ اس عمل کے ذریعہ مجھے اور میرے ایک شریک کو چاندی کی اینٹوں سے بھری ایک کنالی نظر آئی جو ہمارے صحن میں گڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے کھودنا شروع کیا، کدال جب کنالی پر پڑی تو ہم نے بہت احتیاط سے کھدائی کی، لیکن کنالی میں، اکھ کے سوا کچھ نہ نکلا۔

اس واقعہ کو چند روز ہی گزرے تھے کہ میرا بیٹا شدید بیمار پڑا اور مر گیا اور میرے شریک کار کا ایک بیٹا پاگل ہو گیا۔

اس تمہید کے بعد شاہ جی نے بتایا کہ "رئی" بوٹی کا پودا جڑ سے اکھاڑو، لیکن ایسی جگہ سے کہ اس پودے سے وہاں لوہا لگنے کا احتمال نہ ہو، اسے سایہ میں خشک کر لو۔ ایک "گاگا" پتھر (وہ سفید ساخت پتھر جس سے چقماق کا کام لیا جاتا ہے) ایسی جگہ سے لو کہ اس سے بھی لوہا چھو جانے کا احتمال نہ ہو۔ کمہار سے کچی ٹھیکری لاؤ۔ سنوری (پٹ سن کی لکڑی) لو اور اس کی آگ سے اس پودے کو جلاؤ اور گاگا پتھر سے رگڑ کر اسے سرمہ بنا لو۔ اس میں سے تھوڑا سا سرمہ چنبیلی کے خالص تیل میں ملا کر آئینہ پر لگاؤ اور رات کو تاریک کمرے میں کسی نابالغ بچے کو دکھاؤ۔ بچہ جتنا چھوٹا ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ آئینہ دیکھ کر بچہ کہے کہ بھنگی کو بلا کر اس جگہ کی صفائی کراؤ۔ اسے نظر آئے گا کہ بھنگی آیا اور اس نے ایک جگہ جھاڑو دی۔ پھر کہے کہ بھشتی کو بلاؤ کہ چھڑکاؤ کرے۔ چنانچہ چھڑکاؤ ہو

۷۔ پھر کہے کہ تخت بچھاؤ اور بادشاہ کو بلاؤ۔ چنانچہ وہ تخت پر ایک بادشاہ کو بیٹھا دیکھے گا پھر جو چاہے اس بادشاہ سے دریافت کرے۔

میں نے شاہ جی کی رہنمائی میں سرمہ تیار کر لیا۔ پھر ان سے کہا کہ آپ کا مکان راؤجی کی حویلی سے ملا ہوا ہے۔ اس حویلی کے کسی مقام میں خزانہ کا مدفون ہونا بھی معروف ہے اور آپ کا ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ کیوں نہ آپ ہی کے مکان میں آپ ہی کے بچے کے ذریعہ یہ عمل کیا جائے۔ کیونکہ خطرہ تو خزانہ کو حاصل کرنے میں ہے، اس سے پہلے کے مراحل میں تو کوئی خطرہ نہیں۔

شاہ جی، اللہ مغفرت فرمائے، تیار ہو گئے۔

میں نے عمل کی صداقت کا امتحان کرنے کے لئے ایک شخص کو اس مکان سے باہر ایک درخت کے نیچے کھڑا کر دیا، اور ایک ٹوٹی ہوئی بوتل میں کچھ بیر بھر کر اسے ایک نیو میں دفن کر دیا۔ اس کے بعد عمل شروع کیا۔ صفائی اور بادشاہ کے تخت پر جلوہ افروز ہو جانے کے بعد میں نے بچہ سے کہا کہ بادشاہ سے پوچھو کہ فلاں شخص کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ فلاں درخت کے نیچے کھڑا ہے۔ میں نے یہ دریافت کرنے کے لئے کہا کہ میرے گھر کی گھڑونچی میں پانی کے کتنے برتن رکھے ہوئے ہیں؟ اس نے برتنوں کی تعداد بالکل صحیح بتائی۔ میں نے کہا کہ بادشاہ سے یہ پوچھو کہ فلاں نیو کے نیچے کیا گڑا ہوا ہے؟ بچے نے بتایا کہ ایک ٹوٹی ہوئی بوتل میں ہری ہری گول گول کوئی چیز بھری ہے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ بچہ صحیح کہہ رہا ہے تو میں نے کہا کہ بادشاہ سے دریافت کرو کہ راؤجی کی حویلی کا خزانہ کہاں ہے۔ بچے نے کہا کہ زمین کے نیچے ایک دروازہ نظر آ رہا ہے جس میں بڑا سے تالا پڑا ہے۔ شاہ جی نے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ اس خزانہ کو اندر سے دکھاؤ۔ بچہ بولا کہ ابا جی! ایک طرف لوہا ہی لوہا اور دوسری طرف سونا ہی سونا پڑا ہے۔ شاہ جی نے کہا کہ پوچھو: کیا ہم یہ خزانہ لے سکتے ہیں؟ بچے نے کہا کہ ہاتھ کے اشارہ سے منع کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ اچھا بادشاہ کا شکریہ ادا کرو اور کہو کہ آپ جا سکتے ہیں۔

عمل ختم ہونے کے بعد میں نے بچے سے پوچھا کہ کیا وہ جگہ تمہیں یاد ہے جہاں خزانہ دکھایا گیا؟ اس نے جواب دیا کہ مسجد کے صحن میں جو قبر ہے اس کے نیچے خزانہ کا دروازہ تھا۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی علامت تمہیں یاد ہے۔ اس نے کہا کہ قبر پر آڑا آڑا بانس پڑا ہوا ہے۔

جس وقت عمل ختم ہوا، رات کے بارہ بجے تھے۔ میں نے شاہ جی سے کہا کہ مسجد کے صحن کی قبر کے نیچے خزانہ کا ہونا تو سرونج کے سارے عامل جانتے ہیں، لیکن قبر پر آڑا آڑا بانس پڑا ہونا یہ عارضی علامت ہے، اسی وقت چل کر دیکھنا چاہئے چنانچہ ہم حویلی کی مسجد میں گئے۔ واقعتہً اس کے صحن کی قبر پر آڑا آڑا بانس پڑا ہوا تھا۔

راوجی کی یہ حویلی مغلیہ دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ راوجی نے یہ کیا تھا کہ حویلی کے ایک کونہ میں چھوٹی سی مسجد بنا کر اس کے صحن میں قبر بنا دی تھی اور اس کے نیچے خزانہ تھا (حویلی کی چھت پر بھی اسی طرح کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کا ذکر پہلے گزر چکا)۔

خزانہ کی حفاظت کی خاطر یہ ترکیب اختیار کی گئی تھی اس لئے کہ مسلمانوں کی حکومت تھی اور مسلمان مسجد اور قبر کا احترام کرتے ہیں۔ اس لئے اگر پتہ چل بھی جائے تو مسلمان نہ مسجد ڈھائیں گے نہ قبر کھودیں گے۔

سرونج میں ایک جاگیردار نبی داداخان کو بھی حاضرات کے ذریعہ دفینے حاصل کرنے کا شوق تھا اور منشی عبدالعزیز صاحب کے بڑے بھائی منو خان ان کے شریک کار تھے اس لئے کہ منو خان الٹے پیدا ہوئے تھے اور بچے کی طرح اس شخص میں بھی آئینہ میں مناظر دیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو الٹا پیدا ہوا ہو۔ ان دونوں نے بھی حاضرات کے ذریعہ اس خزانہ کا پتہ چلانے کے بعد اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ رات کے وقت کدال پھاوڑے لے کر پہنچے، دیکھا کہ اس جگہ ایک لمبا تڑنگا تنگ دھڑنگ وجود ہاتھ میں ننگی تلوار لئے کھڑا ہے۔ دونوں بھاگے اور کئی روز تک دونوں کو بخار آتا رہا۔

اول تو کسی دفینہ کا پتہ چلانا ہی آسان مسئلہ نہیں، پھر پتہ چل بھی جائے تو اس

کا حاصل کرنا اس سے زیادہ مشکل مرحلہ ہے، صرف حقدار ہی کو ملتا ہے اور یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ حقدار کون ہے۔

قرآن کریم میں حضرات موسیٰ و خضر علیہما السلام کے ذکر میں ہے کہ حضرت خضر نے ایک گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے کر درست کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس کے نیچے خزانہ تھا، اگر دیوار گر جاتی تو دوسرے نکال لیتے، درآنحالیکہ اللہ کی منشا یہ تھی کہ جو یتیم بچے اس کے حقدار ہیں جب وہ جوان ہوں تو وہ اس خزانہ کو نکالیں۔

مولانا محمود الحسن صاحب گیاوی سرونج میں مدرسہ ریاض المدارس کے صدر مدرس تھے۔ پان کے عادی تھے اور چاندی کی ڈبیہ میں پان رکھا کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ مقصود احمد صاحب حاضرات کا عمل جانتے تھے اور اس مقصد کے لئے بنایا ہوا کاجل کسی نابالغ بچے کے ناخون پر لگایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا محمود الحسن صاحب ظہر کی نماز پڑھ کر درسگاہ میں آئے اور تدریس سے پہلے پان کھانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ پان کی ڈبیا موجود نہیں۔ حافظ مقصود صاحب فوراً ایک بچہ کو لے کر کمرہ میں گئے اور تاریکی کر کے اس کے ناخن پر کاجل لگا کر ڈبیا کے بارے میں دریافت کیا۔ بچے نے بتایا کہ ڈبیا فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہے اور وہ بڑے بازار میں بدر الدین کی دوکان کے سامنے کھڑا ہے، فوراً دو لڑکوں کو روانہ کیا گیا، اس لڑکے کو پکڑ لائے، ڈبیا اس کے پاس موجود تھی۔

میرے برادر نسبتی مولانا نذیر الدین صاحب اور ان کے کچھ دوست الہ آباد کے مولوی کے امتحان میں جانے لگے تو انہوں نے حافظ مقصود احمد صاحب سے کہا کہ حاضرات کے ذریعہ امتحانی پرچے معلوم کریں۔ چنانچہ انہوں نے کاجل لگایا بچے نے کہا کہ ہاتھ کے اشارہ سے منع کر رہے ہیں۔

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ حاضرات کے ذریعہ اگر اسم اعظم یا کیمیا کا نسخہ یا کوئی اور اہم راز معلوم کرنا چاہیں تو نہیں بتایا جاتا۔ البتہ اگر کسی بیمار کا مرض اور اس کا علاج معلوم کرنا ہو تو بتا دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تجارت

جب میں سونا بنانے اور دفینے حاصل کرنے جیسے فضول کاموں سے مایوس ہوا تو پیٹ کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ مجبوراً میں نے تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چھوٹے بازار میں چوراہے کی وہ کونے کی دوکان کرایہ پر لی جس کے سامنے دائیں جانب کا راستہ راؤجی کی حویلی کو جاتا ہے۔ اس میں پرچون کی دوکان کی اور پان کا سامان بھی رکھا۔ سرمایہ کل دو سو روپے تھا۔ لیکن جس کا آبائی پیشہ ملازمت ہو وہ تجارت کیا جانے! پہلی بار جب آموں کا موسم آیا تو کیفیت یہ تھی کہ اگر دس روپے کی بکری ہوئی ہے تو پچیس روپے کے آم گھر جا رہے ہیں۔ قلیل سرمایہ کب تک ساتھ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ ہی میں اس دوکان کو خیرباد کہہ کر دوسری کم کرایہ کی دوکان لی اور اس کے سامنے پھڑ لگا کر گڑ بیچنا شروع کر دیا۔ گڑ کی تقریباً دس سیر کی بھیلی میں خود کاندھے پر رکھ کر بڑے بازار سے چھوٹے بازار لایا کرتا تھا۔

سرونج کے معروف مسلمان تاجر عبدالرحیم صاحب (بھندو بھیا) نے جب دیکھا کہ دیوبند کا فارغ التحصیل عالم اور کل کا ہائی اسکول کا ٹیچر اس طرح گڑ بیچ رہا ہے تو کسی سے کہا کہ اگر ایک سال اس نے اس کام میں استقامت برت لی تو انتہائی کامیاب تاجر ہو گا۔ لیکن جس کا مزاج ہر کام میں عدم استقامت ہو وہ تجارت میں استقامت کہاں سے لاتا۔

تھوڑے دن میں گڑ کی دوکان بھی ختم کر دی اور والد صاحب مرحوم سے دو سو روپے لے کر انڈوں کی خریداری شروع کی تاکہ انہیں جے پور لے جا کر فروخت کیا جائے۔ جے پور کے پہلے چکر میں کچھ فائدہ ہوا، لیکن دوسرے چکر میں پونجی آدھی رہ گئی۔ اور اس مرحلہ پر کوئی اور صورت نہ پا کر میں نے پاکستان کے سفر کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

انڈوں میں نقصان اٹھا کر جب میں سرونج پہنچا تو تین چار روز بعد میں نے بیوی سے کہا کہ ایک بکس میں میرے کپڑے اور ضرورت کا فلاں فلاں سامان رکھ دو۔ بیوی کے مزاج میں چونکہ بے انتہا سنجیدگی ہے اس لئے خاموشی سے سامان رکھتی گئیں اور جب روانگی میں صرف ایک روز رہ گیا تو مجھ سے دریافت کیا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: انڈوں کے کچھ پیسے باقی ہیں انہیں وصول کرنے جے پور جارہا ہوں۔ بولیں: جے پور کے پچھلے سفر میں تو یہ اہتمام نہ تھا۔ آپ کم از کم مجھے تو بتادیں کہ کہاں جارہے ہیں۔ میں نے جواب دیا: وہم چھوڑو، میں جے پور ہی جارہا ہوں۔ شاید زندگی بھر کا یہی ایک راز ہے جو میں نے اپنی ہمدم و ہمراز سے پوشیدہ رکھا، صرف اس اندیشہ سے کہ کہیں میرے پاکستان جانے کے فیصلہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوجائے۔

اس طرح میں کسی کو بتائے بغیر پاکستان آگیا، جب پاکستان سے میرا پہلا خط والد صاحب کے پاس سرونج پہنچا تو میرے گھر اور سسرال میں حسب توقع کہرام مچ گیا لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا، اللہ کو یہی منظور تھا، اور مستقبل نے بتایا کہ اسی میں بہتری تھی۔

سفرِ پاکستان

مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ میں نے پاکستان آنے کا ارادہ اس لئے نہیں کیا کہ ہندوستان میں دین کے برباد ہونے کا خطرہ یا پاکستان میں دین کی خدمت کے مواقع زیادہ تھے۔ میرے پاکستان آنے کا محرک کوئی مذہبی داعیہ نہ تھا بلکہ ابتر معاشی حالات تھے جنہوں نے مجھے پاکستان دھکیل دیا۔ گویا صرف اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے رزق حلال کی تلاش میرے لئے پاکستان آنے کا اصل مقصد تھا۔

مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ میں نے نہ صرف پاکستان بنانے میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت کی، کیونکہ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے زیر اثر کانگریسی ذہنیت رکھتا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ میں کبھی کانگریس کا ممبر نہیں بنا اور سچی بات یہ ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی جنرل ضیاء الحق سے پہلے کا پاکستان مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ البتہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں پاکستان کی مذہبی افادیت عملی طور پر سامنے آئی کہ یہاں مسلمان کم از کم اس پوزیشن میں تو ہیں کہ اگر اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہیں تو کوئی داخلی غیر مسلم طاقت انہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی اور دارالاسلام کی ادنیٰ تعریف یہی ہے۔ یہ صورت متحدہ ہندوستان میں ممکن نہ تھی۔

میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ پاکستان کے حامی عوام کی غالب اکثریت نے خالص دینی جذبہ سے پاکستان کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے صرف "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کی خاطر اپنی جانیں قربان کی تھیں اور محض اس جذبہ کے تحت اپنا گھر بار لٹایا تھا کہ ایسا دارالاسلام بنایا جائے جہاں اللہ و رسولؐ کے قوانین کی حکمرانی ہو۔

بہر حال میں ۱۹۵۳ء میں کھوکھراپار کے راستے کراچی پہنچا اور اپنے بھتیجی داماد فرید الدین کے پاس قیام کیا۔ دوسرے روز میرے دوست مولانا سراج احمد صاحب مجھے

اپنے گھر لے گئے اور ملازم ہونے کے کچھ عرصہ بعد میں نے علیحدہ رہائش اختیار کر لی۔

اس سفر میں یہ حادثہ پیش آیا کہ میرا بکس گم ہو گیا، جس میں میری اسناد بھی تھیں۔ میں کراچی اس حالت میں پہنچا کہ میرے پاس صرف بدن کا جوڑا تھا اور ملازمت کے لئے اسناد کے بجائے صرف اللہ کا سہارا تھا۔

پاکستان میں ملازمت

نائب مفتی

کراچی پہنچنے کے چھٹے روز ہی مجھے دارالعلوم نانک واڑہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نائب مفتی کی حیثیت سے ۱۲۵ روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں میری پہلی ملازمت افتاء کے کام سے شروع ہوئی اور پاکستان میں بھی ملازمت کی ابتداء افتاء ہی کے کام سے ہوئی۔

اس ملازمت کی تفصیل میں نے اپنی کتاب "چند یادیں" میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے تذکرہ میں لکھی ہے۔

ایس۔ ایم۔ کالج

دارالعلوم میں ملازمت کے دوران ہی میں نے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی اجازت بلکہ دعاؤں سے ایس۔ ایم۔ کالج، کراچی میں ملازمت کے لئے درخواست دی انٹرویو کے لئے گیا تو میرے پاس شیروانی نہ تھی اور زمانہ جب الناس باللباس کا ہو تو شیروانی کے بغیر جاتا کیسے۔ چنانچہ کراچی کے جونا مارکیٹ سے دو روپے میں ایک شیروانی خریدی اور اسے جسم پر اوڑھ کر (کیونکہ فٹ نہ تھی) انٹرویو میں شریک ہوا۔ انٹرویو میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور میرے ساتھی ایک صاحب اور بھی تھے، جو حیدرآباد سندھ کے سٹی کالج میں لکچرار تھے۔ ان کا چہرہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز تھا۔

پرنسپل غلام مصطفیٰ شاہ نے ان سے پہلا اور آخری سوال کیا کہ اگر کلاس میں طلبہ نے آپ سے سوال کیا کہ آپ اسلامیات پڑھاتے ہیں اور چہرہ پر ڈاڑھی نہیں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ جواب دیا۔ میں کہوں گا کہ ہاں میرے چہرے پر ڈاڑھی نہیں اور ڈاڑھی اسلام میں ضروری بھی نہیں ہے۔ اسی جواب پر ان کا انٹرویو ختم ہو گیا اور پرنسپل نے کہہ دیا کہ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ پرنسپل غلام مصطفیٰ شاہ ظاہر کے بہت سخت تھے اور باطن کے بہت اچھے۔

ایس۔ ایم کالج میں اسلامیات کی لکچرر شپ کے لئے میں نے ٹونک کے ایک صاحب صاحبزادہ ضیاء احمد خاں کو بھی درخواست دینے کی ترغیب دی تھی۔ وہ سفارش کے لئے اپنے چچا صاحبزادہ ولی احمد خاں صاحب کے پاس پہنچے، جو ریاست دوجانہ میں وزیر اعظم رہ چکے تھے اور بڑے صاحب اثر و رسوخ تھے۔ چچا نے دریافت کیا کہ تمہیں اس جگہ کا علم کیسے ہوا؟ جواب دیا: فلاں نے بتایا ہے۔ دریافت کیا: کیا وہ خود بھی امیدوار ہے؟ ہاں۔ انہوں نے جواب دیا۔ فرمایا: بڑے ظرف کا آدمی ہے کہ جس جگہ کے لئے خود امیدوار ہے، دوسروں کو بھی اس جگہ کے لئے ترغیب دے رہا ہے۔ اسے میرے پاس لاؤ۔ میں گیا تو فرمایا کہ میں نے تم جیسے آدمی کم دیکھے ہیں۔ میں سب سے پہلے تمہاری سفارش کروں گا، اس کے بعد ضیاء احمد کی۔

ہم باہر نکلے تو میں نے ضیاء احمد خاں سے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے پاس جو سفارش ہے اسے میں اپنے لئے استعمال کر لوں۔ چنانچہ میں دوبارہ ان کے پاس گیا بھی نہیں۔

میں نے جب پہلی بار ٹونک کے محکمہ شرعیہ میں ملازمت کے لئے درخواست دی تو میرے برادر نسبتی مولانا نصیر الدین صاحب بھی امیدوار تھے۔ اگرچہ اس وقت برادر نسبتی نہ بنے تھے لیکن بات پختہ ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ جب آپ امیدوار ہیں تو میں درخواست نہ دوں۔ فرمایا کہ ضرور درخواست دو۔ دیکھو سب سے

زیادہ خوشی تو مجھے اپنے تقرر کی ہو گی اور اگر میرا تقرر نہ ہو سکا تو کسی اجنبی کے مقابلہ میں زیادہ خوشی تمہارے تقرر کی ہو گی۔

زندگی بھر یہی اصول میرے پیش نظر رہا اور اسی جذبہ سے ضیاء احمد صاحب سے میں نے ذکر کیا تھا۔

تقرر کا اختیار بھی اللہ کی امانت ہے۔ جن ہاتھوں میں یہ اختیار ہو اگر وہ اسے صحیح طور پر استعمال کریں اور تقرر صرف استحقاق کی بنا پر ہو تو حیدر آباد دکن کی اصطلاح کے مطابق چٹھی مٹھی پٹھی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عثمان بن ابی طلحہؓ سے جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے، بیت اللہ کی چابی لی تو حضرت عباسؓ نے درخواست کی کہ آئندہ کے لئے کلید برداری کی خدمت ان کے سپرد کر دی جائے۔ یہی درخواست حضرت علیؓ نے بھی کی۔ حضورؐ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے۔ وہیں یہ آیت نازل ہوئی۔ إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها الاية (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کیا کرو) حضورؐ باہر تشریف لائے تو یہ آیت تلاوت فرمائی اور چابی عثمان بن ابی طلحہؓ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت تک یہ چابی تمہارے پاس ہی رہے گی۔

بہرحال میں نے بھی حالات کے تقاضے کے مطابق سفارش کے لئے تگ و دو کی اپنے دوست اور کرم فرما حکیم سید محمود احمد صاحب برکاتی سے ذکر کیا، وہ مجھے فوراً حکیم نصیر الدین صاحب کے پاس لے گئے۔ حکیم نصیر الدین صاحب نے نشتر صاحب مرحوم سے کہا، نشتر صاحب نے گذدر صاحب مرحوم سے اور گذدر صاحب نے پرنسپل غلام مصطفیٰ شاہ صاحب سے۔ نتیجتاً میرا تقرر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لئے اسباب

...ام فرما دیتا ہے ۔ چونکہ اللہ کو میرا کام بنانا مقصود تھا اس لئے اسباب کی کڑیاں خود ... ملتی گئیں ۔

چند سال بعد ایس ۔ ایم ۔ کالج میں اسلامیات کے لکچرر کی ایک اور جگہ نکلی ۔ ...ے ایک قریبی دوست ، جن کے تعلقات حکیم برکاتی صاحب سے اتنے ہی تھے جتنے ...ے ، ان کے پاس گئے ۔ چند روز تک برکاتی صاحب کو فرصت نہ ملی کہ حکیم نصیر ...ین صاحب کے پاس جائیں اور لے کر گئے تو برکاتی صاحب ہی کا بیان ہے کہ حکیم ...یر الدین صاحب بات کو اس طرح ٹال گئے جیسے سنی ہی نہیں ۔ کڑیاں وہی تھیں ...ن ملیں اس لئے نہیں کہ اللہ کو منظور نہ تھا ۔

ایس ۔ ایم ۔ کالج میں یوں تو ابتدائی دو تین دن تک ہر کلاس میں ہوٹنگ ...ی لیکن انٹر کامرس کی سیکنڈ ایئر کی ایک کلاس کے سوا ہر کلاس میں سکون ہو گیا ۔

اسی سیکنڈ ایئر کی کلاس کو مجھ سے پہلے جو معمر بزرگ پڑھاتے تھے ان کے ساتھ ...ے تقرر سے چند روز قبل یہ معاملہ پیش آیا تھا کہ لڑکے شور کر رہے تھے اور وہ ...نکھیں بند کئے لکچر دے رہے تھے ۔ اتفاق سے پرنسپل راؤنڈ لیتے ہوئے اس کلاس میں ... اور مولانا کے برابر جا کر کھڑے ہو گئے ۔ طلبہ پرنسپل کی وجہ سے دفعتہً خاموش ...وئے تو مولانا کو اس خلافِ معمول سنانے پر تعجب ہوا ۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ...نسپل برابر کھڑے ہیں ۔

میں جب اس کلاس میں پہنچا تو طلبہ نے آیئے ، آیئے ، سبحان اللہ اور ماشاء اللہ ...یسے نعروں سے استقبال کیا ۔ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا ...کہ پوری کلاس لکچرار ہے اور تنہا میں طالب علم ۔ حاضری لی تو شور اور بلند ہو گیا ، معلوم ...ہی نہ ہوتا تھا کہ اس میں پراکسی کتنی ہے ۔ پھر میں نے اپنے بچپن کے اصول کے مطابق ...سب کو گدھا سمجھ کر بولنا شروع کیا تو تقریباً بیس منٹ کے بعد خاموشی ہوئی ۔

دوسرے روز حاضری لینے میں شور بدستور رہا اور تقریباً دس منٹ میں خاموشی

طاری ہوئی ۔ اس کے بعد سے میں نے حاضری لینی چھوڑ دی اور وتیرہ یہ اختیار کیا کہ کلاس میں داخل ہوتے ہی یہ کہہ کر کہ کل بات یہاں تک پہنچی تھی بولنا شروع کر دیتا تھا اور پورے گھنٹہ بے تکان بولتا جاتا تھا اور جب گھنٹہ پر موگری پڑتی تو یہ کہہ کر نکل جاتا تھا کہ باقی باتیں انشاء اللہ کل ہوں گی۔

اس کلاس پر میں نے تقریباً پندرہ روز میں مکمل طور پر قابو پایا اور تقریباً ایک ماہ بعد اس کلاس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ پورے کالج میں اس سے بہتر کوئی کلاس نہ تھی۔

اسی کلاس کے ایک طالب علم نے مجھ سے کہا کہ صاحب پہلے تو ہم جانتے بھی نہ تھے کہ اسلامیات بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہے۔

ایک مرتبہ دو ماہ کے لئے مجھے سائنس کی کلاسز دی گئیں ۔ ایک روز کھڑے ہونے کے بجائے حسب عادت میز پر بیٹھا لکچر دے رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ کلاس میں تھے اور مکمل خاموشی طاری تھی ۔ پرنسپل نے راؤنڈ لیا اور مجھے اس طرح پڑھاتے دیکھ کر جو استاد ان کے ساتھ تھے ان سے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا مولوی نہیں دیکھا جس کا کلاس پر اتنا سخت کنٹرول ہو۔

جب ایس ۔ ایم ۔ کالج میں میرا تقرر ہوا، میں لالو کھیت نمبر ۴ میں رہتا تھا۔

ایک مرتبہ پرنسپل نے اپنے کمرے میں بلایا اور ہمارے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

پرنسپل: آپ کے پاس ذاتی مکان ہے؟

میں: ایک پلاٹ پر ناجائز قبضہ کر کے جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔

پرنسپل: سندھ مدرسہ میں ایک مکان خالی ہوا ہے، آپ چاہیں تو اس میں منتقل ہو سکتے ہیں ۔ لیکن وہ مکان مسجد سے متعلق ہے، آپ کو مسجد میں امامت کرنی ہو گی۔

میں: میں اپنے آپ کو امامت کے قابل نہیں سمجھتا۔

پرنسپل: کیوں؟

میں: لوگ امامت کی ذمہ داریاں محسوس نہیں کرتے اس لئے ہر کس و ناکس امامت کا منصب سنبھال لیتا ہے۔

پرنسپل: میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ آپ خود بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ سوچ لیجئے۔

اس گفتگو کے بعد میں کمرے سے واپس چلا آیا۔ اتفاق سے گفتگو کے وقت ایس ایم۔ کالج کے ہیڈ کلرک کمال صاحب مرحوم بھی موجود تھے۔ ان سے قدرے بے تکلفی ہو چکی تھی۔ باہر آئے تو مجھ سے کہا کہ آپ بڑے بے وقوف ہیں، اس مکان کے لئے مولانا ---- صاحب نے بھی کوشش کی اور مولانا ---- صاحب نے بھی۔ میں نے خود پرنسپل سے کہا کہ مکان مجھے دے دیجئے۔ میں اپنی جیب سے تنخواہ دے کر امام مقرر کر دوں گا، لیکن پرنسپل نے ہر ایک کو انکار کر دیا اور کہا کہ مکان مظہر بقا کو ملے گا۔ لیکن آپ کا دماغ اتنا خراب ہے کہ فوری طور پر انکار کر دیا۔ آپ نے مکان اور اس کا محل وقوع دیکھا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے سمجھایا تو نفس نے دل میں یہ بات ڈالی کہ میں خود تو مکان طلب نہیں کر رہا۔ اگر اللہ کی طرف سے از خود انتظام ہو رہا ہے تو وہ اہلیت بھی پیدا کر دے گا۔ چنانچہ میں نے کمال صاحب سے کہہ دیا کہ پرنسپل سے کہہ دیجئے کہ مجھے منظور ہے۔

میں سندھ مدرسہ کے مکان کی نچلی منزل میں منتقل ہو گیا۔ بالائی منزل میں ایک شیعہ مولوی صاحب کی رہائش تھی جو شیعہ مسجد کے امام تھے۔ اگرچہ ریٹائر ہو چکے تھے، لیکن ان کا سامان باقی تھا اور ان کے بچے وہیں سوتے تھے۔

میں اس مکان میں پہنچا تو دیکھا کہ رات کو نو دس بجے کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک لوہے کا پلنگ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلسل گھسیٹا جاتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سر پر آرا چل رہا ہے۔

میں نے مقررہ وقت پر اپنے بعض کالج کے ساتھیوں کو بھی بلایا اور انہوں نے بھی مسلسل پلنگ گھسیٹے جانے کی آوازیں سنیں۔ چند روز بعد ان کا سامان چلا گیا اور

ان کی جگہ ایک دوسرے شیعہ مولوی باقر صاحب آئے جو میرے کالج کے ساتھی تھے۔ انھوں نے بھی یہ ستم کیا کہ روزانہ رات گئے دھم دھم کی آوازیں آتی تھیں جیسے کوئی زور زور سے پاؤں مارتا ہوا ادھر سے ادھر آجا رہا ہے۔

بالآخر تنگ آکر میں نے پرنسپل سے کہا کہ میں اوپر کی منزل میں منتقل ہونا چاہتا ہوں۔ پرنسپل نے منظور کر لیا اور میں اوپر چلا گیا۔ منتقل ہونے سے پہلے باقر صاحب کو پرنسپل کا حکم معلوم ہوا تو مجھ سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے آپ اوپر کیوں جانا چاہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ جب اوپر چلا جاؤں گا تب بتاؤں گا۔ چنانچہ جب میں اوپر منتقل ہو گیا تو پہلی ہی رات میں نے کچھ گھاس منگوا کر ہاون دستے میں ڈالی اور اپنے لڑکے اظہر سے کہا کہ پوری قوت سے اسے کوٹے۔ اس نے جو موسل چلائے تو باقر صاحب فوراً دوڑے ہوئے اوپر آئے۔ بقا صاحب! بقا صاحب!! یہ کیا ہو رہا ہے، پوری چھت ہل رہی ہے۔ میں نے کہا اب معلوم ہوا کہ میں اوپر کیوں آنا چاہتا تھا۔ جب خود دھم دھم کرتے تھے تو احساس نہ ہوا۔ باقر صاحب، اللہ انہیں خوش رکھے، بڑے ظریف آدمی ہیں اور مجھ سے کیا سب ہی سے ان کی بڑی بے تکلفی ہے۔ اب بھی میں جب کراچی جاتا ہوں تو ان سے ضرور ملتا ہوں اور وہ بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔

مولوی باقر صاحب کی طبیعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کالج میں میرے تقرر کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک روز میں کلاس میں جانے لگا تو کہنے لگے کہ دو چار کھٹمل ہوں تو میری کلاس میں بھیج دینا۔ چونکہ بے تکلفی ہوئی نہ تھی اس لئے مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک شیعہ عالم اور یہ بات (شیعہ اور سنی طلبہ کی اسلامیات کی کلاسز علیحدہ علیحدہ ہوتی تھیں)۔ ایک روز میں تراویح کے لئے نیچے اترا تو باقر صاحب مکان کے باہر بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: آؤ آج تو مسلمان بن جاؤ، ہمارے ساتھ تراویح پڑھ لو۔ کچھ نہ بولے خاموش رہے۔

تراویح سے واپس آیا تو اسی بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں قریب پہنچا تو کہا کہ حضرت عمرؓ

خواہ مخواہ کی مصیبت تمہارے اوپر لاد دی۔ منہ تو دیکھو کیسا ست رہا ہے، یاروں کو دیکھو مزے سے بیٹھے پان چبا رہے ہیں۔

تراویح تو خیر فرض نہیں، باقر صاحب کے تو فرض نمازوں میں بھی مزے تھے۔ پانچ کے بجائے تین اوقات میں مسجد جانا اور عصر کو ظہر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ پڑھ لینا ان کا معمول تھا۔ میں اگرچہ حنفی ہوں لیکن اس طرح جمع بین الصلاتین کو برا نہیں سمجھتا، کیونکہ ترجیحات کی بات تو دوسری ہے لیکن سفر اور مطر کے حضر میں بھی اس طرح کی جمع بین الصلاتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ شیعہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں میں اسے بھی برا نہیں سمجھتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے اور شیعہ ہی نہیں مالکی مسلک کا ایک بہت بڑا طبقہ بھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے۔

مجھ سے پہلے سنی مسجد کے امام مولانا آفتاب صاحب تھے جو سندھ مدرسہ میں پڑھاتے تھے۔ مفتی صاحبداد صاحب مرحوم کے صاحبزادے موذن تھے۔ یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ سندھ مدرسہ کی سنی مسجد میں امامت کے فرائض میں انجام دوں گا ایک روز موذن مجھے ملے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے، مولانا آفتاب صاحب کو کیوں علیحدہ کیا گیا؟ جواب دیا صاحب وہ دیوبندی تھے۔ میں چپ ہو گیا اور دل میں کہا کہ خدا خیر کرے وہ تو صرف فکری طور پر دیوبندی تھے اور میں تو دیوبند کا فارغ التحصیل ہوں۔ موذن کو تو بالآخر میری دیوبندیت کا علم ہونا ہی تھا۔ انہوں نے میرے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دیا، میں نے کبھی کچھ نہ کہا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی تو موذن صاحب نے امامت کی اور میں پہنچا تو صف میں شامل ہو گیا۔

جمعہ سے قبل تقریر کی بدعت بھی رواج کے مطابق میرے ذمہ تھی میں نے کبھی تقریر میں اختلافی مسائل کا ذکر نہیں کیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ میرا پیٹ تو کالج کی ملازمت سے بھرتا تھا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ اختلافی مسائل چھیڑ کر اپنا جتھا بناؤں

اور انہیں بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کروں ۔ دوسرے یہ کہ میرے مزاج میں اسلام کے بارے میں تو تشدد ہے لیکن اس سے نیچے اتر کر دیو بندیت تو کیا حنفیت تک میں تشدد نہیں ۔ اور اسی لئے میرے بعض شیعہ اور اہل حدیث احباب تک مجھ سے کھل کر اختلافی مسائل پر بات کرتے ہیں اور ہم کبھی ایک دوسرے کی بات پر برا نہیں مانتے ۔

بہر حال جب مؤذن صاحب نے اچھی طرح جانچ لیا کہ میں خلف الرشید (الخلف الرشید) قسم کا دیو بندی نہیں تو میرے پیچھے نماز شروع کر دی ۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ایس ۔ ایم کالج کی ملازمت اور امامت کا تقریباً چھ سالہ زمانہ عزت اور حسن وخوبی کے ساتھ گزار دیا ۔

سندھ یونیورسٹی

ابھی ایم ۔اے کا نتیجہ شائع بھی نہیں ہوا تھا کہ سید غلام مصطفیٰ شاہ کی درپردہ سفارش سے اکتوبر ۶۱ء میں میرا تقرر لکچرر کی حیثیت سے سندھ یونیورسٹی میں ہو گیا ۔ شعبہ "تہذیب اسلامی و تقابل ادیان" میں تقرر ہوا جس کے صدر ڈاکٹر بالے پوتہ تھے ۔

انٹرویو کے بعد ڈاکٹر بالے پوتہ صاحب نے فرمایا آپ کا تقرر ہو گیا ہے ۔ اب آپ یہاں دلجمعی سے کام کیجئے ۔ اسے Stepping Stone نہ بنایئے گا ۔

ڈاکٹر بالے پوتہ صاحب ۔ اللہ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ دنیا میں رکھے ، ایمان پر خاتمہ فرمائے اور آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے ، انتہائی شریف النفس انسان ہیں ، علما ، صوفیہ اور پروفیسرز کے درمیان تو میری زندگی ہی گزری ، دوسرے بہت سے لوگوں سے بھی قریبی تعلق رہا ۔ انسانی اخلاق اور مروت کی جن بلندیوں پر ان کے قدم تھے ، میں نے دوسروں کے سر بھی وہاں تک پہنچے ہوئے نہ دیکھے ۔ یہ میرا اپنا تاثر ہے ، دوسروں کے تاثرات مختلف ہوں تو ان سے مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ میں ان کے لئے بکثرت دعا کرتا ہوں ۔

سندھ یونیورسٹی میں ایک سال ہی گزرا تھا کہ میں نے کراچی یونیورسٹی میں درخواست دی ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑی شفقت سے میرے اس اقدام کی مخالفت کی ، پھر بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔ جب میں نے انٹرویو کے سلسلہ میں کراچی جانے کے لئے تین روز کی رخصت کی درخواست دی تو فرمایا: تین روز کی رخصت کس لئے؟ آپ ضابطہ میں صرف انٹرویو کے دن کراچی میں ہوں گے ، اس لئے صرف ایک روز کی رخصت لیجئے اور رہنا چاہیں تو مزید دو روز رہیے ۔ میری طرف سے اجازت ہے ۔

کراچی یونیورسٹی میں تقرر ہو جانے پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے روکنے کی ایک کوشش اور کی ۔ فرمایا جب تک آپ کا Substitute نہ مل جائے میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے فوری طور پر مولانا ابو الفتح محمد صغیر الدین صاحب کو کراچی سے بلایا جن کی ڈگریاں مجھ سے زیادہ اور اخلاق مجھ سے کہیں بلند تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں قبول فرمایا۔ جب میں ان سے رخصت ہونے کے لئے گیا تو فرمایا: اب بھی وقت ہے، سوچ لیجئے ۔ کراچی یونیورسٹی میں آپ کو یہاں جیسا آرام نہ ملے گا، وہاں پہنچ کر آپ سیاست کا شکار ہو جائیں گے ۔ آپ چاہیں تو مولانا ابو الفتح صاحب بھی یہاں رہ سکتے ہیں اور آپ بھی ۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب جب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو اجازت ہی دے دیجئے ۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب سے میرا شعبہ جاتی تعلق ختم ہو گیا اور قلبی تعلق تو تاحیات بلکہ انشاء اللہ بعد ممات بھی قائم رہے گا۔

سندھ یونیورسٹی میں سیاست سندھیوں کے ہاتھوں میں تھی اور مہاجر عموماً بے تعلق سے رہتے تھے ۔ کراچی میں تمام تر، الا ماشاء اللہ، مہاجر تھے ۔ یہاں پہنچ کر واقعۃً مقامی سیاست نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کراچی یونیورسٹی

۱۹۶۳ء میں میں نے سندھ یونیورسٹی کی ملازمت ترک کر کے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ معارف اسلامیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی ابتدا کی۔ اس کے انٹرویو کا حال میری دوسری کتاب "کچھ یادیں" کے اس مضمون میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے جو مولانا منتخب الحق مرحوم پر لکھا گیا ہے۔

اس ملازمت کے ابتدائی چھ سال تو تدریس اور پی ایچ۔ ڈی کی تیاری میں گزرے، اس کے بعد میں یونیورسٹی کی سیاست کا شکار ہو گیا۔ روزانہ عصر کے بعد سے رات کے تقریباً بارہ بجے تک میرے لان میں لوگوں کا اجتماع رہتا اور ہر آنے والے کو چائے پیش کی جاتی (اللہ کا شکر ہے کہ ویسے بھی ہمیشہ سے میرا دسترخوان وسیع رہا ہے، اب البتہ بیوی کے بڑھاپے کی وجہ سے اس میں کمی آگئی ہے)۔ اس اجتماع میں عام طور پر یونیورسٹی کی سیاست پر گفتگو ہوتی تھی اور اس میں شریک ہونے والے زیادہ تر لوگ میرے استاد ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم کی طرف رجحان رکھتے تھے جو یونیورسٹی کی انتظامیہ کے مخالفین کے سرگردہ تھے۔ لیکن جب ایک مرحلہ وہ آگیا جس میں اسلام پسندوں، جس کے نمائندہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم تھے، اور ان کے مخالفین میں اسلام پسندی کے نام سے جنگ چھڑ گئی تو میں نے قریشی صاحب کا ساتھ دیا اور ڈاکٹر یوسف صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے اور آخر تک ناراض رہے۔

ایسوسیئیٹ پروفیسر ہو جانے کے بعد یونیورسٹی میں بھٹو صاحب کے دور میں شعبوں کی صدارت کے لئے روٹیشن یعنی دو دو سال کی بچہ سقائی کا نظام نافذ ہوا تو مولانا منتخب الحق صاحب کے بعد دو سال کے لئے میں بھی صدر شعبہ ہوا۔

بھٹو صاحب کے دور میں یونیورسٹی میں بہتری کے نام سے بدتری کا دور شروع ہوا۔ تدریسی اور غیر تدریسی عملہ کی کشمکش شروع ہوئی۔ ماتحت اپنے افسروں سے اکڑنے لگے، طلبہ اساتذہ کے وقار کی دھجیاں بکھیرنے لگے، حتیٰ کہ جونیئر اساتذہ سینیئر اساتذہ سے بدتمیزی پر اتر آئے۔ اس وقت سے حالات مسلسل ابتری کی طرف بڑھتے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جس یونیورسٹی میں پولیس کا داخلہ اس کے تقدس کے خلاف سمجھا جاتا تھا، رینجرز کے بغیر اس کا نظام چلانا ناممکن ہو گیا۔

شعبہ معارف اسلامیہ میں مولانا منتخب الحق صاحب کے آخری ایام صدارت ہی سے اصول فقہ کی تدریس میرے ذمہ رہی اور پھر جب تک میں یونیورسٹی میں رہا اصول فقہ کا پرچہ میں ہی پڑھاتا رہا۔

یونیورسٹی میں تقرر کے دو سال بعد سے تجرید بخاری کا پرچہ بھی مستقلاً میرے پاس ہی رہا۔ تجرید بخاری پڑھاتے وقت ہر سال کم از کم ایک بار یہ صورت پیش آتی تھی کہ کسی رقت انگیز مضمون کے بغیر میرے آنسو رواں ہو جاتے تھے اور گریہ اس قدر غالب آتا تھا کہ مجبوراً مجھے تھوڑی دیر کے لئے گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑتا تھا۔ میں نے مولانا منتخب الحق صاحب سے ایک بار اس کا ذکر کیا تو فرمایا: یہ حدیث کا فیض ہے۔ کسی شخص کی سند کا اگر صحیح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتصال ہو تو کبھی کبھی اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔

برسوں سے تمباکو کے ساتھ پان کھانے کی عادت کی وجہ سے ہر کلاس میں جانے سے پہلے پان کھانا میرا معمول تھا۔ لیکن بخاری کی کلاس لینے کے لئے منہ صاف کرکے جاتا تھا۔ میری کالج کے زمانہ ہی سے یہ عادت بھی تھی کہ ہمیشہ ٹوپی اتار کر پڑھاتا تھا۔ لیکن بخاری پڑھاتے وقت کبھی سر ننگا نہ کرتا تھا۔

کبھی کبھی ایسا ہوا کہ بخاری کے درس میں میں نے ادب کی وجہ سے ٹوپی تو سر پر ہی رکھی لیکن گرمی کی وجہ سے جوتے اتار دیئے۔ ایک لڑکی نے اپنے والد سے جا کر کہا

کہ ہمارے فلاں استاد پان کی عادت کے باوجود منہ صاف کر کے، ٹوپی پہن کر اور جوتے اتار کر بخاری شریف پڑھاتے ہیں۔ اس کے والد اصفہانی کی چائے کی کمپنی میں ملازم تھے، چائے کے کئی ڈبے لے کر آئے اور کہا کہ مجھے تو انتہائی حیرت ہوئی کہ یونیورسٹی میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حدیث کا اس درجہ ادب کرتے ہیں کہ پڑھاتے وقت جوتے بھی اتار دیتے ہیں۔ ان کو تو میں نے جوتے اتارنے کی اصل وجہ نہیں بتائی لیکن آئندہ کے لئے جوتے اتار کر حدیث پڑھانے کی عادت ڈال لی۔

مولانا منتخب الحق صاحب کی صدارت کے زمانہ میں شعبہ میں مولانا ظفر اللہ صاحب کے تقرر کا مسئلہ زیر غور تھا۔ اس موقع پر شعبہ کے دو اساتذہ نے وائس چانسلر کو لکھ کر بھیجا کہ مولویوں کو انگریزی نہیں آتی اور بی۔ اے کی لازمی اسلامیات کی ساری انگریزی کی کلاسیں ہمیں لینی پڑتی ہیں اس لئے شعبہ میں کسی انگریزی پر قادر شخص کا تقرر کیا جائے۔ مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو آئندہ سال کی ابتداء میں جب پرچے تقسیم ہونے کے لئے اسٹاف کی میٹنگ ہوئی تو میں نے کہا کہ انگریزی کی آرٹس اور سائنس کی کلاسیں میں لوں گا۔ سارے اساتذہ اور خود صدر شعبہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ واسطہ نہ پڑنے اور مشق نہ ہونے کی وجہ سے میں اس زمانہ میں انگریزی کے چند جملے بھی صحت اور روانی کے ساتھ نہ بول سکتا تھا۔ تاہم صدر شعبہ نے خود میری رغبت پر دونوں کلاسیں مجھے دے دیں اور یہ اندازہ کر کے کہ اس کے لئے اسے بہت محنت کرنی پڑے گی ان دو کلاسوں کے علاوہ صرف تجرید بخاری کی ایک مزید کلاس دی جسے میں برسوں سے پڑھا رہا تھا اور اس کے پڑھانے کے لئے کسی خاص محنت کی ضرورت نہ تھی۔

انگریزی میں پڑھانے کے لئے مجھے جتنی سخت محنت کرنی پڑی میں نے اپنی تدریسی زندگی میں اتنی سخت محنت کبھی نہیں کی۔ کرتا یہ تھا کہ خورشید صاحب کی مرتب کردہ اور یونیورسٹی سے منظور شدہ اسلامیات کی کتاب کے ایک معتدبہ حصہ کا

روزانہ انگریزی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر پولیٹیکل سائنس کے صلاح الدین صاحب سے جن کی انگریزی کی صلاحیت بہت نفیس تھی، اس کی اصلاح کراتا تھا۔ اس کے بعد اسے رات کو زبانی یاد کرتا تھا۔ پھر فجر کی نماز کے بعد کمرہ بند کرکے اور کلاس لینے کا تصور کرکے جو اس روز پڑھانا ہوتا اس کی ریہرسل کرتا تھا اور پھر جاکر کلاس لیتا تھا۔ ترجمہ کرتے کرتے آخر سال تک انگریزی کی صلاحیت ایسی ہو گئی تھی کہ ایک روز صلاح الدین صاحب نے کہا کہ اب تمہاری انگریزی میں صرف ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جیسی ان لوگوں کی تحریروں میں ہوتی ہیں جو انگلش میڈیم سے پڑھ کر انگریزی ادب میں ایم اے کرتے ہیں۔

مضمون تو میں رٹ کر پڑھا دیا کرتا تھا اور چونکہ انگریزی صلاح الدین صاحب کی اصلاح کردہ ہوتی تھی اس لئے اس میں نقص بھی نہ رہتا تھا، لیکن جب کوئی لڑکا انگریزی میں سوال کرتا تو جواب میں انگریزی کی کمزوری صاف نمایاں ہوتی تھی۔ اسی لئے انگریزی میڈیم کی کلاسوں پر میرا وہ مثالی کنٹرول نہ ہو سکا جو ہمیشہ اردو میڈیم کی کلاسوں پر ہوا کرتا تھا۔

میرے مزاج میں مزاح کا عنصر خاصا ہے لیکن کلاس میں میں ہمیشہ انتہائی سنجیدہ رہتا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کالج اور یونیورسٹی کی ہر کلاس پر میرا مکمل کنٹرول رہتا تھا۔ البتہ یونیورسٹی کی بی۔اے کی لازمی اسلامیات کی ایک کلاس پر میں آخر سال تک مکمل کنٹرول نہ کر سکا، جسے ایک دوسرے صاحب پڑھاتے تھے اور درمیان میں ان کے چلے جانے کی وجہ سے صدر شعبہ نے میری مرضی کے خلاف یہ کہہ کر مجھے یہ کلاس دی تھی کہ تمہارے سوا اس پر کوئی کنٹرول نہیں کر سکتا لیکن افسوس کہ میں ان کی توقع پر پورا نہ اتر سکا۔ بگڑی ہوئی کلاس پر کنٹرول بہت مشکل ہوتا ہے۔

ہمارے شعبہ میں ایک جوڑے نے معاشقہ شروع کر دیا۔ وقت ختم ہو جانے کے بعد بھی دونوں کو تنہائیوں میں اور کھڑے بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف دیکھا

جانے لگا۔ایک روز کلاس کا وقت ختم ہو جانے کے بعد میں نے دونوں کو گفتگو میں مصروف دیکھا تو لڑکی سے کہا: کیا تمہیں گھر پر کوئی کام نہیں ہوتا؟ چونکہ دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی اس لئے بپھر گئی اور کہا: سر آپ نے کیا سمجھ کر یہ بات کی، اور روتی ہوئی صدر شعبہ کے کمرے میں داخل ہو گئی۔اس کے پیچھے میں بھی داخل ہوا اور اس سے کہا کہ اگر تو نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو جوتا اتار کر یہیں تیرے دماغ کا خناس نکال دوں گا۔مولانا منتخب الحق صاحب نے یہ منظر دیکھا تو لڑکی سے کہا: استاد اور شاگرد کے درمیان میں کوئی مداخلت کرنا نہیں چاہتا۔مظہر بقا صاحب کے کمرے میں جا کر انہیں سے بات کرو۔لڑکی میرے کمرے میں آئی تو میں نے کہا کہ میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، تم اپنے گھر کا پتہ بتاؤ میں تمہارے والد سے بات کروں گا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے معافی مانگی اور آئندہ کے لئے شکایت کا موقع نہ دینے کا وعدہ کیا۔اس کے بعد سے دونوں کو کم از کم شعبہ میں ملتے نہ دیکھا گیا۔صدر شعبہ کو جب معاملہ کا علم ہوا تو مجھ سے فرمایا: اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے ایسے فتنہ کو ختم کر دیا جس کی مجھے کئی روز سے فکر تھی لیکن مداخلت کی جرآت نہ ہوتی تھی۔

ایم۔اے فائنل کی کلاس میں ایک لڑکی تھی "عابدہ" کافی شوخ لڑکی تھی، ایک روز اس نے اپنی عادت کے مطابق شوخی کے ساتھ کوئی سوال کیا۔میں نے دو سکینڈ خاموش رہ کر کہا: عابدہ! ایک سچ بات بتاؤں! اس نے کہا: جی سر۔میں نے کہا: سچ یہ ہے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔کلاس میں اپنی سنجیدگی کے برعکس میرے منہ سے یہ بات نکلی تو عابدہ کا منہ فق ہو گیا اور پوری کلاس پر سناٹا چھا گیا۔میں نے کہا: اپنی محبت کی وجہ بھی بتا دوں، بات یہ ہے کہ تیرا نام بھی عابدہ ہے اور میری بیٹی کا نام بھی عابدہ ہے، تو بھی دبلی پتلی ہے اور میری بیٹی بھی، تو بھی سانولی سی ہے اور وہ بھی، تو بھی شوخ ہے اور وہ بھی، اس لئے میں تجھے دیکھتا ہوں تو ہمیشہ میرا ذہن اپنی بیٹی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔یہ سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔کلاسز ختم ہونے کے بعد وہ سیدھی میرے

گھر پہنچی اور میری بیوی سے کہا امی آج سے میں آپ کی بیٹی ہوں اور کلاس کا واقعہ بھی سنا دیا۔

اس کے بعد سے گویا وہ بیٹی ہی بن گئی اور اس کی شادی ہونے کے بعد تک میری بیوی نے بھی اس کے ساتھ بیٹی جیسا برتاؤ کیا۔ ہمارے سعودیہ چلے جانے کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہ معلوم کہاں چلی گئی۔ جہاں بھی ہو اللہ اسے خوش رکھے۔

ایک روز شعبہ کے اساتذہ کی موجودگی میں لباس میں سادگی کا ذکر آگیا۔ میں نے کہا کہ اس کی ابتدا ہمارے شعبہ سے ہونی چاہیئے کہ ہم شیروانی چھوڑ دیں۔ مولانا منتخب الحق صاحب نے فرمایا: بہت مشکل ہے ساری عمر کی عادت ہے۔ میں نے کہا کوئی مشکل نہیں۔ دوسرے روز سے میں نے شیروانی چھوڑ دی۔ دوسرے اساتذہ حتیٰ کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نے بھی (وائس چانسلر ہونے سے پہلے) کہا اور کہلوایا لیکن میں نے عادۃً شیروانی نہ پہنی۔ البتہ شادی یا کسی اور تقریب میں پہن لی اور اپنی شیروانیاں تقسیم کر دیں۔ سعودیہ میں تو لمبا کرتا (ثوب) اختیار کر لیا ہے۔ شیروانی کا کوئی قصہ ہی نہیں۔ البتہ اب بھی میرے پاس دو شیروانیاں ہیں، ایک گرم دوسری سرد جو پاکستان کی تقریبات کے مواقع کے لئے رکھی ہیں۔

ریڈیائی تقاریر

ایس ۔ ایم ۔ کالج کی ملازمت کے دوران ریڈیو پاکستان کراچی سے تقریروں اور مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا اور کراچی یونیورسٹی کی ملازمت کے اختتام تک تقریباً بیس سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان تقریروں کے مسودات میرے پاس محفوظ تھے جنہیں میرے برادر نسبتی محمد سعید الدین فاروقی مرحوم نے، میرے سعودیہ جاتے وقت، یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ کسی وقت ان کی اشاعت کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے ۔ نہ معلوم اب وہ مسودات ان کے بیٹے شبیہ عمر فاروقی کے پاس محفوظ ہیں یا نہیں ۔

ان میں سے کچھ تقریریں ایک کتابچہ کی صورت میں شائع بھی ہو چکی ہیں ۔ جس کا عنوان تھا "چند تقریریں" ۔

ریڈیو سے میری تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو گھر میں ریڈیو نہ تھا، تقریر سننے کے لئے بیوی ایک ہمسایہ کے گھر جایا کرتی تھیں ۔ بالآخر انہی کے اصرار پر پچاس روپے میں ایک پرانا ریڈیو سیٹ خرید لیا گیا۔

آسیبی اثرات

میں آسیبی اثرات کا منکر تو کبھی نہیں رہا لیکن اتنا زیادہ قائل بھی نہ تھا کہ چھینک بھی آئے تو اسے آسیب کی طرف منسوب کر دوں ۔ لیکن میرے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے کہ منکر ہوتا تو بھی قائل ہو جاتا ۔

کراچی یونیورسٹی کیمپس میں ایک مزار ہے جس پر میں نے سندھیوں کو سالانہ عرس کرتے بھی دیکھا ہے ۔ یونیورسٹی کے دھوبی نے جو اس مزار کا معتقد اور خادم بھی تھا مجھ سے بیان کیا کہ یہ یوسف شاہ یا شیر شاہ صاحب بخاری کا مزار ہے اور اس نے انہیں چاندنی رات میں قبر سے نکل کر میدان میں ٹہلتے اور پھر قبر میں واپس جاتے دیکھا ہے ۔ واللہ اعلم ۔ ویسے میں اس طرح کی باتوں پر آسانی سے ایمان نہیں لاتا ۔ اس مزار کے قریب چند قبریں اور بھی ہیں ۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب کیمپس بننے لگا تو اس وقت کے یونیورسٹی انجنیئر عبدالمنان صاحب نے مزار کو مسمار کرا دیا اور جس روز مزار مسمار ہوا اسی روز صدر میں آتشزدگی کا مشہور واقعہ پیش آیا جس میں ان کی بیوی بچے اور خاندان کے دیگر افراد ایک دکان میں بند ہو کر گھٹ کر مر گئے ۔ صرف ایک بچی جو ماں کے ساتھ نہ تھی بلکہ گاڑی میں ڈرائیور کے پاس تھی ۔ عبدالمنان صاحب نے اسے مزار کی بے حرمتی کا نتیجہ سمجھا اور مزار کو از سر نو بنوا کر اس پر ایک کمرہ بھی تعمیر کرا دیا ۔

اس چھوٹے سے قبرستان کے متصل ایک مکان ہے B-10 ۔ مجھے معلوم تھا کہ بعض لوگ اس مکان میں رہائش سے گھبراتے تھے ۔ کافی دن خالی پڑا رہنے کے بعد جب یہ مکان مجھے الاٹ ہوا تو میں نے سوچا منتقل ہونے سے پہلے خشک لان کو پانی دے کر ہرا کر لوں ۔ پہلے ہی روز عصر کے بعد لان میں پانی دے رہا تھا ۔ میرے داماد

عبدالرزاق بھی موجود تھے اور میرا نواسہ فاروق بھی جس نے نیا نیا پیر چلنا شروع کیا تھا فاروق ایک پتھر پر گرا اور پیشانی کی کھال پھٹ گئی۔ عبدالرزاق کو اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس دوڑایا۔

جب اس مکان میں منتقل ہو گئے تو حسب ذیل واقعات پیش آئے:

۱۔۔۔ ایک روز میں نے خواب دیکھا کہ لوگوں نے ایک تابوت لا کر گیراج کے سامنے رکھا ہے اور اس میں دو کفن پوش لاشیں ہیں۔

۲۔۔۔ میری بیوی نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے: اس مکان کے صحن میں جو چیز گڑی ہوئی ہے اسے نکال کر دور پھینک دو۔ انہوں نے صحن کھود کر ایک پتلا نکالا اور بے بی (ہماری بچی) اور شنو (ہماری نواسی) کو لے کر سیمنٹ فیکٹری کی پہاڑی پر گئیں۔ پتلا پھینک کر واپس ہونے لگیں تو دیکھا کہ بے بی غائب ہے وہ چیخیں اور اسی چیخ پر ان کی آنکھ کھل گئی۔

۳۔۔۔ میں نے خواب دیکھا کہ چینی شکل و صورت کا ایک حجام بقچہ لئے میرے پاس بیٹھا ہے۔ اپنی قینچی زور سے میرے داہنے کان کی طرف لاتا ہے گویا کان چھوڑے دے گا اور جب قینچی کان کے قریب آتی ہے تو آہستہ سے کان کا ایک بال کاٹ لیتا ہے، پھر بائیں جانب آکر اسی عمل کو دہراتا ہے۔

۴۔۔۔ عبدالرزاق جو پہلے السر کے مریض تھے بیمار پڑ گئے اور اتنے کہ ایک رات انہیں سیاہ خون کی قے آئی کہتے ہیں کہ سیاہ خون کی قے آنے کے بعد انسان بچتا نہیں۔ ڈاکٹر منظور عالم صاحب کو بلوایا۔ وہ بھی دیکھ کر گھبرا گئے اور فوراً جناح یا سول ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ عبدالرزاق چند روز سول ہسپتال میں رہے۔ کچھ بھی نہ تھا۔

۵۔۔۔ اسلم ایک روز ہسپتال سے عبدالرزاق کے پاس سے منی بس میں آرہا تھا کہ بس چھت کے بل الٹ گئی، لیکن کسی کو چوٹ نہ آئی۔

۶۔۔۔ کواڑ بند کرتے ہوئے اسلم کا انگوٹھا اتنی زور سے دبا کہ بعد میں پورا ناخن سیاہ پڑ گیا

۷ ... میرے ایک بھتیجے نے زمین الاٹ کرانے کے بہانے چار سو روپے اینٹھ لئے اور میری وجہ سے میرے داماد عبد الرزاق، میرا بھانجا مختار اور بھتیجا انوار بھی پھنس گئے اور سب کی رقم ڈوب گئی۔

۸ ... شعبہ میں ایک استاد اور بعض طلبہ کے درمیان تکدر ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو طلبہ نے ان استاد کو مارا، اس طرح کہ ان کا ہونٹ پھٹ گیا اور کپڑے خون میں تر ہو گئے۔ شعبہ۔ اسلامیات کے طلبہ اور اس طرح کا واقعہ! نتیجہ یہ ہوا کہ شعبہ پوری یونیورسٹی میں کیا پورے ملک میں بدنام ہو گیا اس لئے کہ اخبارات میں بھی اس کی رپورٹنگ ہوئی تھی۔

غرض یہ کہ ڈراؤنے خواب جسمانی اور مالی پریشانیاں اور بدنامی، یہ واقعات مسلسل پیش آتے رہے۔

مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا کہ ان چیزوں کے رونما ہونے میں مکان کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں جیسے جیسے پیش آتیں میں ان کا ذکر اپنے پیر بھائی حاجی محمد اعلیٰ صاحب سے کرتا جاتا اور وہ حضرت شاہ زوار حسین صاحب سے ذکر کر دیتے۔ ایک روز میری عدم موجودگی میں حضرت شاہ صاحب نے حاجی صاحب سے فرمایا کہ مفتی صاحب (اس حلقہ کے لوگ مجھے مفتی صاحب ہی کہتے ہیں) جب سے اس مکان میں منتقل ہوئے ہیں مسلسل پریشان ہیں، کہیں اس مکان میں آسیب کا اثر تو نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے تو احتمالاً اس کا ذکر کیا تھا لیکن ان کی یہ بات جب حاجی صاحب نے مجھ سے ذکر کی تو فوراً دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یقیناً یہ آسیب کا اثر ہے۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی یہ عادت مجھے معلوم تھی کہ وہ اس طرح کی باتوں کا ذکر اول تو زبان پر لاتے ہی نہ تھے اور لاتے بھی تھے تو اشاروں کنایوں میں۔ حاجی صاحب کی درخواست پر انہوں نے آٹھ کیلیں پڑھ دیں اور میں نے حسب ہدایت چار کیلیں مکان کے اور چار کیلیں لان کے چاروں طرف گاڑ دیں۔ حضرت شاہ صاحب نے گھر میں اذ

اپنے پاس رکھنے کے لئے دو تعویذ بھی دیئے۔

عصر کے بعد کیلیں گاڑیں اور مغرب کے بعد میں لیٹا تھا کہ کچھ غنودگی سی طاری ہوئی اور خواب و بیداری کی درمیانی کیفیت میں دیکھا کہ مکان کے باہر شمالی لان میں جس طرف قبریں تھیں اوسطاً بیس فٹ لمبا ایک وجود مکان کی طرف منہ کئے کھڑا ہے اس کے دائیں جانب اس کی بیوی کھڑی ہے جو قد میں اس کے کاندھوں کے برابر ہے۔ دونوں حسرت سے مکان کو دیکھ رہے ہیں اور مرغی اور تیتر کے بچوں کی شکل میں ان کے متعدد بچے بیچ میں سے پھلانگ کر قبروں کی طرف باہر جا رہے ہیں۔

جب حضرت شاہ صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ ہو گا کچھ۔ اس کے بعد میں سالوں اس مکان میں رہا، کوئی پریشان کن واقعہ پیش نہیں آیا۔

جامعۃ ام القریٰ

اگست ۱۹۷۷ء میں ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کی جانب سے پاکستان کی وزارتِ تعلیم کو لکھا گیا کہ فقہ اسلامی کی پانچویں کانفرنس میں شرکت کے لئے اپنا کوئی نمائندہ بھیجیں۔ وزارتِ تعلیم نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اور اس نے کراچی یونیورسٹی کو نمائندہ نامزد کرنے کے لئے لکھا۔ کراچی یونیورسٹی نے مجھے نامزد کیا۔ یہ کانفرنس نومبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہونے والی تھی۔ مجھے اس کی خبر اس وقت ہوئی جبکہ کانفرنس کے ختم ہونے میں صرف پانچ روز باقی رہ گئے تھے۔ چونکہ کانفرنس کے اختتام کے نو دن بعد حج ہونے والا تھا، اس لئے مجھے اس کانفرنس میں شرکت نہ کر سکنے کا سخت افسوس ہو رہا تھا۔ پانچ دن کے قلیل عرصہ میں وزارتِ تعلیم اور سی۔ آئی۔ ڈی سے جن کے صدر دفاتر اسلام آباد میں تھے، نو آبجیکشن لینا، کانفرنس میں پڑھنے کے لئے مقالہ لکھنا، سفر کا اور سفر کے لئے پیسوں کا انتظام کرنا بظاہر ناممکن تھا۔ میں مایوسی کے عالم میں یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر اسماعیل سعد کے پاس پہنچا۔ موصوف نے کہا کہ چونکہ سرکاری معاملہ ہے اس لئے اگر آپ اس سلسلے میں اسلام آباد فون کرنا چاہیں تو یونیورسٹی کا ٹیلیفون موجود ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں نے تین روز تک کئی کئی بار اسلام آباد فون کئے، اور ڈاکٹر محمود قاضی کی کوشش سے وزارتِ تعلیم سے اور ایم۔ اے فائنل کے ایک طالب علم کی مدد سے سی۔ آئی۔ ڈی سے تیسرے روز شام کو نو آبجیکشن موصول ہو گیا۔ میں رخصت حاصل کرنے کے لئے رات کو وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید کے گھر پہنچا۔ موصوف نے فرمایا کہ اس وقت تو آپ خود انتظام کر کے چلے جائیں، واپس آنے کے بعد میں آپ کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے سفر کے مصارف دلا دوں گا۔ پیسوں کا انتظام کچھ میرے لڑکے انتظ

نے اور کچھ میرے ہمسایہ ڈاکٹر محمد رفیع نے کیا۔اس طرح میں ریاض اس وقت پہنچا جبکہ اس سے اگلے روز کانفرنس کا آخری سیشن تھا۔

میں نے تنگ ودو کے اس عرصہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر جیسے تیسے چند صفحات کا ایک مقالہ بھی ایک مصری استاد کی مدد سے عربی میں تیار کر لیا تھا۔وہ مقالہ میں نے کانفرنس کے سیکریٹری کو پیش کیا اور اگلے روز اختتامی سیشن میں شرکت کی۔

کانفرنس ختم ہونے پر میں نے کانفرنس کے سیکریٹری کو پیسے دیئے کہ میرے لئے مکہ مکرمہ کے ٹکٹ کا انتظام کر دے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر میں ڈاکٹر غنی الاکرم صاحب کا مہمان ہوا جن کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا ہے۔ غنی الاکرم صاحب پہلے کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور ان کی بیوی ان کی شادی سے پہلے سے میری بیٹی کی طرح تھیں۔وہ ٹونک کے صاحبزادہ محمد علی خاں کی صاحبزادی ہیں جن سے میرے خصوصی تعلقات تھے۔(محمد علی خان کے کچھ حالات بھی میں نے اپنے کتاب "کچھ یادیں" میں لکھے ہیں) اس طرح غنی الاکرم صاحب سے میرا دہرا تعلق تھا۔حج سے فراغت کے بعد غنی الاکرم صاحب نے کہا کہ آپ چونکہ وزٹ ویزا پر آئے ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے ملازمت پر کوئی پابندی نہیں اس لئے آپ یونیورسٹی میں ملازمت کی کوشش کریں۔ غنی الاکرم صاحب بھی مکہ مکرمہ کی کلیتہ الشریعتہ کی لائبریری میں ملازم تھے، جو جامعتہ الملک عبدالعزیز، جدہ کی ایک فیکلٹی تھی (اور اب تک وہیں ملازم ہیں) میں نے ان سے کہا کہ فی الحال میں یہاں ملازمت کی کوشش نہیں کرنا چاہتا۔ایک تو اس وجہ سے کہ میں اس ارادہ سے آیا ہی نہیں دوسرے اس وجہ سے کہ میں کراچی یونیورسٹی میں عنقریب پروفیسر بننے والا ہوں۔ میرے اس انکار کے باوجود ان کا اصرار جاری رہا۔ یونیورسٹی میں ملازم عبدالحمید صاحب اور ڈاکٹر خلیل صاحب نے بھی، جو کراچی یونیورسٹی میں میرے رفقائے کار میں سے تھے، مجھے سمجھایا کہ آپ یہاں ملازمت کی

کوشش کریں کیونکہ یہاں کی ایسوسی ایٹ پروفیسر شپ کے مقابلہ میں کراچی یونیورسٹی کی پروفیسر شپ کی کوئی حیثیت نہیں ۔چنانچہ این ۔ای ۔ڈی انجینیرنگ کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ابراہیم صاحب کے مشورہ سے اپنا بایو ڈیٹا لے کر براہ راست یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبداللہ نصیف کے پاس پہنچ گیا ۔موصوف نے بایو ڈیٹا دیکھ کر کہا کہ ہمارے پاس آپ کے لائق کوئی جگہ نہیں ،آپ کے لئے مناسب جگہ مکہ مکرمہ کی کلیتہ الشریعہ ہے ۔آپ وہاں جائیں میں نے کہا کہ میں تو وہاں کسی کو جانتا نہیں ،آپ کسی کے نام پرچہ لکھ دیں ۔چنانچہ انہوں نے مکہ مکرمہ کی کلیتہ الشریعہ کے ڈین ڈاکٹر سعد الرشید کو پرچہ لکھ دیا کہ ان کی مدد کریں ۔

ڈاکٹر سعد الرشید نے خصوصی طور پر میری مدد فرمائی اور کلیتہ الشریعہ کے مرکز البحث العلمی واحیاء التراث الاسلامی میں میرا تقرر ہو گیا ۔اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔

وائس چانسلر کے آرڈر کے باوجود شئون المتعاقدین کے صدر نے مجھے بہت دن تک پریشان کیا ۔

ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں مجھ حقیر سے فرمایا: تمہارا کام ہو جائے گا (اس خواب کی تفصیل "میرے خواب" کے عنوان کے تحت درج ہے) صبح میں اس یقین کے ساتھ یونیورسٹی گیا کہ آج تو میرا کام ہونا ہی ہے ۔چنانچہ شعبہ . متعاقدین کے صدر نے فوری طور پر شئون الموظفین کے صدر کے مشورہ سے پاکستان کے سعودی سفارتخانے کو خط لکھا کہ انہیں ویزا دے دیا جائے اور مجھ سے کہا کہ آج اس پر وائس چانسلر کے دستخط ہو جائیں گے ،کل آنا ۔میں دوسرے روز گیا تو اس نے مجھے اس خط کی نقل اور ویزا کا نمبر دے دیا ۔اس طرح ایک ماہ اٹھارہ یوم کی کوشش کے بعد میرا کام ہو سکا ۔

میں نے کراچی آکر درخواست دی کہ چونکہ سعودیہ میں میرا تقرر اسی جگہ ہوا ہے

جس کے لئے میں نے چند سال قبل یونیورسٹی کی معرفت درخواست دی تھی، اس لئے مجھے ضابطہ میں تین سال کی بلا تنخواہ رخصت دی جائے۔ دو روز بعد سنڈیکیٹ کی میٹنگ کے بعد نیازی صاحب کے پاس گیا کہ کیا ہوا؟ موصوف نے کہا: "منظوری تو آپ وہاں سے لے کر آئے ہیں، آپ کو کون روک سکتا ہے۔ وائس چانسلر نے آپ کی درخواست سنڈیکیٹ کے سامنے اس طرح پیش کی گویا آپ نے انہیں وکیل مقرر کیا ہو۔"

چند سال پہلے میرے رفیق کار ڈاکٹر طاہر ملک کے لڑکے انور نے برٹش کونسل میں انگلینڈ کے ایک اخبار میں اشتہار دیکھا تھا جس میں جدہ کی جامعہ ملک عبدالعزیز نے مکہ مکرمہ کی کلیۃ الشریعہ کے مرکز البحث العلمی کے لئے کچھ اساتذہ کی آسامیاں مشتہر کی تھیں۔ ڈاکٹر طاہر ملک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس اشتہار میں جس قابلیت کے اشخاص مطلوب ہیں اس پر آپ پورے اترتے ہیں، اس لئے آپ درخواست روانہ کر دیں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر انہیں پاکستان سے لینا ہوتا تو انگلینڈ کے اخبار میں کیوں اشتہار دیتے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ کیا حرج ہے، درخواست تو دے دیں۔ چنانچہ میں نے ان کے اصرار پر کراچی یونیورسٹی کی معرفت درخواست روانہ کر دی۔ اگر یہ درخواست نہ روانہ کی ہوتی تو مجھے یونیورسٹی سے تین سال کی رخصت نہ ملتی کیونکہ یونیورسٹی کا قانون تھا کہ جس بیرونی ملازمت پر تقرر ہوا ہو اس کے لئے درخواست یونیورسٹی کی معرفت روانہ کی جائے۔

میری یہ درخواست تو ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئی تھی لیکن میرا تقرر اسی جگہ ہوا جس کے لئے میں نے یونیورسٹی کی معرفت درخواست روانہ کی تھی۔

بہرحال میں کراچی یونیورسٹی سے اس کی تصدیق لے کر، کہ میں یہاں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں، مکہ مکرمہ گیا اور ۱۵۔ فروری ۱۹۷۸ء، ۸۔ صفر ۱۳۹۸ھ کو ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے کلیۃ الشریعہ کا مرکز احیاء التراث الاسلامی جوائن کر لیا۔ یہی کلیۃ الشریعہ بعد میں جامعہ "ام القریٰ" بنا۔ یہاں اصول فقہ کے مخطوطات کو ایڈٹ کرنے کا

کام میرے سپرد ہوا۔

اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر حیرت ہوتی ہے اس نے مجھے موجودہ ملازمت کی منزل تک پہنچانے کے لئے، جو بظاہر آخری منزل ہے، کس کس طرح تیار کیا جو پہلے سے اس کے علم میں تھی:

اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد عربی کے لئے ریاض المدارس میں داخل ہوا پھر اس میں اور اس کے بعد دارالعلوم دیو بند میں قرأت کی مشق کی جس سے عربی کا تلفظ درست ہوا۔ بڑھاپے میں شیخ محمد شعبان مصری سے سابقہ پڑا کہ ان کی وجہ سے عربی میں گفتگو کرنے پر کچھ قدرت ہوئی۔ کالج اور یونیورسٹی کے تجربہ اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری نے ام القریٰ یونیورسٹی کے لئے اہل بنایا۔ شعبہ میں مولانا منتخب الحق صاحب کے بعد اصول فقہ کی تدریس میرے ہی ذمہ رہی۔ کئی سال پہلے کراچی یونیورسٹی کی معرفت دی ہوئی درخواست نے تین سالہ رخصت دلائی۔ سچ ہے إذا أراد الله شيئا هيأ أسبابه (اللہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو (خود ہی) اس کے اسباب فراہم کر دیتا ہے)۔

کارساز ما بفکر کار ما

فکر ما در کار ما آزار ما

(کام بنانے والے (اللہ) کو خود ہمارے کام کی فکر ہے،

اپنے کام میں ہماری فکر صرف تکلیف اٹھانا ہے۔)

اس موقع پر مجھے گوتم بدھ کا ایک قصہ یاد آرہا ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ سچ ہے یا غلط۔

گوتم بدھ نے شہزادگی کو خیرباد کہہ کر جب مسافرت اختیار کی تو پیٹ بھرنے کے لئے ایک بنیئے کے پاس اس کی چھوٹی بچی کو کھلانے کے لئے ملازمت کر لی۔ بچی جوان ہونے لگی تو اس کے پستانوں میں ابھار شروع ہوا۔ جب ابھار نمایاں ہوا تو ایک

رود گوتم بدھ نے کرتا اٹھا کر ٹٹولا۔ اس عمل کو بیٹے کی بیوی نے دیکھ لیا۔ جب بنیا شام کو آیا تو ماں بھری بیٹھی تھی۔ شوہر سے کہا کہ تم نے بھولا بھالا سمجھ کر اپنی بیٹی جس کے سپرد کر رکھی ہے، آج اس نے یہ حرکت کی ہے۔ بیٹے نے گوتم بدھ کو بلایا۔ سامنا ہوتے ہی گوتم بدھ بیٹے پر برس پڑے کہ تمہیں تو صرف دنیا کمانے کی فکر ہے، گھر میں کیا کچھ بھی ہوتا رہے۔ بیٹے نے پوچھا ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ اپنی بہو کے سینے میں دونوں طرف سخت سخت پھوڑے ابھر رہے ہیں، آج میں نے ٹٹول کر دیکھا تھا۔ بیٹے نے انہیں سکون سے بٹھایا اور سمجھایا کہ جوان ہونے پر لڑکی کی شادی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد بچے ہوتے ہیں، بچے اس دودھ پر پلتے ہیں جو ماں کی چھاتیوں سے نکلتا ہے تم نے جو دیکھا یہ انہی کا ابھار تو ہے جس سے بچوں کی غذا نکلتی ہے۔ یہ سن کر گوتم بدھ نے کہا کہ ابھی تو اپنی بہو نہ جوان ہوئی، نہ شادی ہوئی اور نہ بچے ہوئے اور پرماتما نے ابھی سے بچوں کی غذا کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ تو پھر میں دو روٹیوں کی خاطر تمہارے پاس کیوں پڑا ہوں۔ یہ کہا اور چل دیئے۔

قمری حساب سے جامعہ ام القریٰ کی ملازمت کو یہ سترھواں سال ہے۔ اس سال ۱۴۱۵ھ کے آخر تک ملازمت میں توسیع ہو چکی ہے جو ہر سال کے اختتام پر ہوتی ہے اگر زندہ رہا، قویٰ کام دیتے رہے اور اللہ کو منظور ہوا تو مزید توسیع بھی ہونی چاہئے، اس لئے کہ "معجم الأصولیین" کی تالیف کا جو کام کر رہا ہوں اس کی تکمیل کے لئے خاصا وقت درکار ہے اور ابھی اس کی پانچ میں سے صرف دو جلدیں مکمل ہو کر طبع ہوئیں ہیں۔

دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملازمت کے دوران ہی ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مکہ یا مدینہ کی خاک کا پیوند بنا دے، ورنہ سبکدوشی کے بعد مکہ مکرمہ میں قیام کے لئے از سر نو پاپڑ بیلنا پڑیں گے۔ یا پھر سبکدوشی کے بعد بھی اگر اللہ تعالیٰ کو زندہ رکھنا ہے تو مکہ مکرمہ میں باسانی رہنے کے لئے اسباب پیدا فرما دے۔ آمین۔

قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر حامد حسین حسان صاحب، جو اب جامعہ اسلامیہ اسلام آباد کے مدیر ہیں، مجھے اصول فقہ پڑھانے کے لئے ہمارے مدیر ڈاکٹر ناصر کی اجازت اور میری مرضی سے اسلام آباد لے گئے۔ میں نے یہ سوچ کر آمادگی ظاہر کر دی تھی کہ خود کو ٹیسٹ کر سکوں کہ عربی میں پڑھا سکتا ہوں یا نہیں۔ اس زمانے میں یہ جامعہ نہ بنی تھی بلکہ قائداعظم یونیورسٹی کی ایک فیکلٹی تھی۔

سہروردی مرحوم زندہ اور با اقتدار رہتے تو اسلام آباد شاید دولت آباد ثابت ہوتا لیکن اب تو پاکستان کا مستقل دارالحکومت ہے۔ قدرتی حسن کو انسانی سلیقے نے نکھار کر کیا رونق بخش دی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کسی باغ میں مکان بنا دیئے گئے ہیں۔ ہوا لطیف ہے لیکن آب خراب۔ معدنیات کی کثرت نے پانی کو ثقیل بنا دیا ہے اسی لئے ریاحی تکالیف کی کثرت ہے۔ مقامی باشندوں کے رخساروں پر سرخی تو نظر آتی ہے لیکن قدو قامت پست ہیں۔

وہاں میرا کام برائے نام تھا ہفتہ میں کل تین پیریڈ، سنیچر کے روز دو اور بدھ کو ایک۔ نتیجہ یہ تھا کہ درمیان کے تین دنوں میں مری، ایبٹ آباد، بالاکوٹ یا سوات کی طرف نکل جایا کرتا تھا اور یہ دن خوشگوار گزرتے تھے۔ باقی دنوں میں اسلام آباد میں بور ہوتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر احمد حسن کے مکان پر قیام تھا جو اسلامی ادارہ تحقیقات اسلامی میں پروفیسر ہیں۔ مزاج میں متانت ہے، فطرت میں مسکنت، پھر میرے ہائی اسکول کے پرانے شاگرد ہیں کہ اس زمانہ کے استاد و شاگرد کے درمیان آخر وقت تک ایک فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ ریاح کے مریض ہونے کی وجہ سے ٹنڈے پڑا ہوا بکری کا گوشت ان کی دونوں وقت کی مستقل خوراک تھی جس میں مرچیں برائے نام ہوتی تھیں۔ یکسانیت تو من و سلویٰ سے بھی بیزار کر دیتی ہے۔ لہٰذا مجھ جیسے چٹورے شخص کو ہو

مرض کی حالت میں بھی پرہیز کا عادی نہ ہو یہ غذا کیسے پچتی، وہ بھی روزانہ دونوں وقت آخر نہ رہا گیا تو ایک روز کہہ ہی دیا کہ آپ میرے لئے وہ سالن لایا کریں جو آپ کے علاوہ باقی گھر والوں کے لئے پکتا ہے۔ وہ کھایا تو تسکین ہوئی۔ پھر بھی کبھی کبھی رات کو بازار جا کر خوب چٹپٹے کباب کھایا کرتا تھا۔

ان کے دریافت کرنے پر میں نے کہہ دیا تھا کہ ناشتہ میں چائے اور ایک ابلے ہوئے انڈے کا عادی ہوں۔ ان کی اہلیہ، اللہ ان کو جزائے خیر دے اور اپنی نعمتوں سے نوازے، کے ہاتھوں میں نہ معلوم آلہ حرارت پیمائی تھا کہ پہلے روز انڈے کی زردی جتنی پتلی تھی مجال ہے کہ آخری دن تک اس کے قوام میں ادنیٰ سا فرق بھی آجاتا۔

اسلام آباد میں نہ کوئی دوست تھا نہ عزیز۔ یا تو نماز کے لئے لال مسجد چلا جاتا یا عصر کی نماز کے بعد فوارہ کے سامنے والے ہوٹل میں بیٹھ جاتا۔ بے ضرورت چائے چلتی رہتی، ورنہ دیر تک کرسی پر قبضہ جمائے رکھنا حلال کیسے ہوتا۔ پھر عشاء کے بعد گھر واپس لوٹتا۔

میں ایک ماہ ہی میں اسلام آباد سے اتنا بیزار آگیا تھا کہ تدریس یا طویل قیام کے لئے اسلام آباد کا رخ نہ کرنے کا عہد سا کر چکا تھا۔

ایک روز ہمارے ڈین ڈاکٹر حامد حسن مصری نے کہا کہ میں سوچتا ہوں کہ آپ کے لئے جامعہ ام القریٰ کے مدیر سے کہوں کہ وہ آپ کا مستقل تقرر یہاں کر دیں۔ جگہ خوبصورت ہے اور تنخواہ کے مقابلہ میں مصارف برائے نام۔ کم خرچ و بالانشیں کا مصداق ہوگا۔

میں نے جواب دیا کہ آپ کا یہ طرز فکر میرے ساتھ خیر خواہی نہیں۔ ایک بار ہندوستان سے کلکتہ اجڑ کر پاکستان آباد کیا، پھر پاکستان سے تقریباً اجڑ کر مکہ مکرمہ جا بسا متعلقین بھی میرے ساتھ منتقل ہو چکے ہیں کوئی جدہ میں ملازم ہے کوئی مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم۔ اب اگر میں اسلام آباد میں رہوں تو یا تو دو گھر ہوں ایک مکہ میں دوسرا اسلام

آباد میں یا ایک مرتبہ پھر اجڑنے اور بسنے کا مرحلہ درپیش ہو اور کون بد بخت ہے کہ جو مکہ مکرمہ کی مقدس ترین سرزمین چھوڑ کر کہیں اور آباد ہو۔

میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے اور ہم سب گرمیوں کی تعطیلات میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حامد حسن پھر مجھے اسلام آباد لے جانا چاہتے ہیں۔ میں سفارش کے طور پر ایک مصری استاد کو ساتھ لے کر ان کے گھر گیا کہ مجھے معاف فرمائیں۔ کہنے لگے، آپ نے جو کورس شروع کرایا ہے اسے پورا کون کرے گا اور امتحان کے پرچے کون بنائے گا۔ میں نے کہا کہ یہ کام ڈاکٹر احمد حسن انجام دے لیں گے۔ کہنے لگے کہ صرف ایک سمسٹر کے لئے جانے میں آپ کو کیا عذر ہے؟ میں نے کہا کہ اسلام آباد کے تصور ہی سے میری روح کانپتی ہے۔ کہا کہ تعجب ہے آپ کا اپنا ملک اور آپ کی یہ کیفیت۔

خدا خدا کر کے میری جان چھوٹی اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

اسلام آباد کے قیام کے دوران جب بالاکوٹ جانا ہوا تو حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہما کے مزارات بھی دیکھے۔ جب یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت سید احمد شہید کا سر قلم کر کے انہیں دریائے کنہار میں بہا دیا گیا تھا تو یہاں ان کا مزار کیسے بنا؟ یہ محل غور ہے۔ جس طرح یہ مشہور ہے کہ قاہرہ میں حضرت امام حسین کا سر مدفون ہے، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہاں سید صاحب کا سر مدفون ہو۔ البتہ سید اسماعیل شہید کا مزار صحیح طور پر وہاں موجود ہے۔ ایک چھوٹی سی سرسبز پہاڑی جس کے دونوں جانب دو دریا یا ایک ہی دریا کے دو بہاؤ ہیں اور پہاڑی کے چاروں طرف جنگلی پودینہ کی مہک۔ ایسے روح پرور مقام پر درختوں کے سائے میں اللہ کی چند برگزیدہ ہستیاں آرام فرما ہیں جن میں سے ایک حضرت اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں بلند مقامات عطا فرمائے۔ آمین۔

باب چہارم

علمی زندگی

تالیف و تحقیق

تحقیقی کام

میری زندگی کے تقریباً ۴۴ سال تدریس میں صرف ہوئے۔ زمانہ۔ تدریس کے آخری ایام میں میرے ذہن میں بکثرت یہ خیال آتا تھا کہ پڑھانا گویا ہوا میں باتیں کرنا ہے کہ شاگرد تک تو نام رہتا ہے لیکن شاگرد کا شاگرد بھی نہیں جانتا کہ ہمارے استاد کا استاد کون تھا۔ کاش میرا رزق اللہ نے تصنیف و تالیف میں مقرر کیا ہوتا کہ پیٹ بھی بھرتا، نام بھی رہتا اور علم ینتفع بہ (وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے) کی صورت میں صدقہ جاریہ بھی۔

اس خیال کے پس منظر میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی تھا کہ "عالم کا اصل کام تصنیف و تالیف ہے"۔ ساتھ ہی یہ تمنا بھی تھی کہ بحث اور مستقل تالیف کے بجائے تحقیق کا کام ملے۔

یہ تمنا اس لئے تھی کہ میں اپنی علمی حیثیت جانتا تھا۔ دار العلوم دیوبند نے اگر کچھ صلاحیت پیدا کی بھی تھی تو کالج اور یونیورسٹیوں کی تدریس نے اسے بھی خاک میں ملا دیا اور میرے پاس علم نہیں بلکہ علم کا صرف لیبل رہ گیا۔ مجھ جیسے لوگوں کی مثال ان برساتی کیڑوں جیسی ہوتی ہے جو صرف چند روز پھدکتے اور مر جاتے ہیں۔ اگر وہ کوئی تالیف کریں اور خوبی قسمت سے وہ شائع بھی ہو جائے تو شاید اس کا دوسرا ایڈیشن بھی نہ نکل سکے، اور شاید پہلا ایڈیشن بھی ردی کی ٹوکریوں کے نذر کیا جائے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ تحقیق کے ذریعہ کسی بڑے آدمی کا دامن پکڑ لوں اور اس کے طفیل میں میں بھی زندہ رہوں۔

مور بے کس ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

(کعبہ سے دور کسی مقام پر ایک چیونٹی کو کعبہ پہنچنے کی تمنا تھی۔ اتفاق سے حرم کے کبوتر وہاں دانہ چگنے آئے ہوئے تھے۔ چیونٹی ایک کبوتر کی ٹانگ سے چمٹ گئی دانہ چگ کر جب کبوتر نے اڑان بھری تو اس کے طفیل میں چیونٹی بھی تھوڑی دیر ہی میں کعبہ پہنچ گئی۔)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح میری تمام دوسری بڑی بڑی تمنائیں پوری کی ہیں، یہ تمنا بھی پوری کر دی۔ وہ بھی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ناکارہ سے تالیف کا کام بھی لیا اور تحقیق کا بھی۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔۔۔ "ابو العلاء المعری"۔۔۔(تالیف)

یہ میرا ایم۔اے کا مقالہ تھا جو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔

۲۔۔۔ "رسالہ فخر الحسن"۔۔۔(تحقیق و ترجمہ)

مولانا فخر الدین دہلوی کا یہ عربی رسالہ میری تحقیق و ترجمہ اور ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ "اولاً قسط وار" پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، کراچی کے جرنل میں شائع ہوا، اس کے بعد سوسائٹی نے اسے ۱۹۷۴ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔

۳۔۔۔ "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ"۔۔۔(تالیف)

یہ میرا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔ اس مقالہ کو پہلی بار ادارہ۔ تحقیقات اسلامی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ ادارہ نے اس کے مضامین میں تحریف بھی کی اور تصحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس میں تقریباً ساڑھے تین ہزار طباعت کی اغلاط رہ گئیں۔

میں نے ۱۹۸۶ء میں اس مقالہ کو "بقا پبلی کیشنز" سے دوبارہ شائع کیا۔

دوسری اشاعت میں طباعت کی اغلاط کی تصحیح کے ساتھ ساتھ میں نے اس کے مقدمہ میں تفصیل سے تحریفات کا جائزہ بھی لیا اور ڈاکٹر صغیر حسن معصومی پر، جو ادارہ

کے ڈائریکٹر تھے اور جنہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ بھی لکھا تھا، سخت الفاظ میں تنقید بھی کی۔

اب (اگست ۱۹۹۴ء) جبکہ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ جذبات کی شدت میں کمی آگئی ہے، سوچتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

۴.... "الاصول والضوابط"---(تحقیق)

امام نووی کا یہ رسالہ میری تحقیق کے ساتھ جامعہ ام القریٰ، مکہ المکرمہ، کے مجلۃ البحث العلمی کے عدد ثالث میں ۱۴۰۰ھ میں شائع ہوا۔

۵.... "المختصر فی اصول الفقہ"---(تحقیق)

علی بن العباس البعلی کی یہ کتاب حنبلی اصول فقہ کی ایک مختصر کتاب ہے جسے میری تحقیق کے ساتھ مرکز احیاء التراث الاسلامی، جامعہ ام القریٰ نے ۱۴۰۰ھ میں شائع کیا۔

۶.... "المغنی فی اصول الفقہ"---(تحقیق)

عمر الخبازی کی اصول فقہ حنفی کی متن ہے جسے مرکز احیاء التراث الاسلامی، جامعہ ام القریٰ نے ۱۴۰۳ھ میں شائع کیا۔

۷.... "بیان المختصر"---(تحقیق)

شمس الدین محمود الاصفہانی کی یہ کتاب ابن الحاجب کی اصول فقہ کی معروف کتاب "مختصر المنتہی" کی شرح ہے۔ اصفہانی شافعی اور ابن حاجب مالکی ہیں۔

جامعہ ام القریٰ کے مرکز احیاء التراث الاسلامی نے یہ شرح میری تحقیق کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی۔

۸.... "مختصر المنتہی"---(تحقیق)

میں نے ابن الحاجب کی اس کتاب کی تحقیق کی جو ہنوز طبع نہیں ہوئی۔

۹.... "شرح المغنی"

عمر خبازی نے خود اپنی کتاب "المغنی" کی شرح کی ہے۔ میں نے دو جلدوں میں اس کی تحقیق کی جو ہنوز طبع نہیں ہوئی۔

۱۰۔۔۔ "معجم الاصولیین" ۔۔۔ (تالیف)

یہ کام مرکز البحث العلمی، جامعہ ام القریٰ سے منظور کیا گیا ہے۔ اس کی دو جلدیں جولائی ۱۹۹۴ء میں طبع ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب پانچ جلدوں میں مکمل ہو گی۔

۱۱۔۔۔ "اسلام کا نظام وارثت، مذاہب اربعہ کے مطابق"

کراچی کے پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ نے الجزائری کی "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" کو اردو میں منتقل کر کے اور اس میں شیعہ فقہ کا اضافہ کر کے اسے "الفقہ علی المذاہب الخمسہ" بنانا چاہا۔ چونکہ الجزائری کی کتاب میں میراث کا بیان نہیں، اس لئے مجھ سے اس موضوع پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ میں نے کتاب مکمل کر کے انہیں دے دی اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں۔ سعودی عربیہ چلے جانے کی وجہ سے میں ان سے رابطہ نہ کر سکا۔

۱۲۔۔۔ "چند تقریریں"

ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر شدہ کچھ تقریروں کا مجموعہ ہے جو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔

۱۳۔۔۔ "حیات بقا"

موجودہ تالیف۔

۱۴۔۔۔ "کچھ یادیں"

یہ کتاب کمپوز ہو چکی ہے۔ طباعت کا مرحلہ باقی ہے۔

۱۵۔۔۔ "چند یادگار سفر"

کتاب مکمل ہو چکی ہے، کمپوز کی جانے والی ہے۔

۱۶ .... ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے طبع کردہ سیرت کانفرنس کے لئے لکھا ہوا ایک مضمون، "فکر و نظر" اور "الرحیم" نیز دوسرے مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع شدہ اردو مضامین اور ایک صاحب کے اشتراک سے بعض کورس کی کتابوں کے سندھی سے اردو میں ترجمے ان کے علاوہ ہیں۔

ایک مرتبہ کراچی کے تاجر کتب سلطان حسین صاحب (مرحوم) نے مجھ سے کہا کہ آپ قرآن کریم کا ترجمہ کر دیجئے، میں متن کے بغیر ترجمہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ متن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنا اگرچہ جائز نہیں کیونکہ تحریف کے چور دروازوں میں سے ایک یہ بھی ہے، لیکن میں نے حامی بھر لی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ قرآن کریم پر قلم اٹھانے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل ہو جائے۔ حالانکہ میری یہ جرأت ایسی ہی تھی جیسے گھوڑوں کے نعل لگتے دیکھ کر مینڈکی بھی ٹانگ اٹھالے۔ دوسرے اس وجہ سے، اور یہی وجہ اصل تھی، کہ اس زمانے میں کچھ زیادہ ہی مالی پریشانی تھی۔ پھر شیطان نے ضمیر کی آواز کو یہ کہہ کر دبا بھی دیا تھا کہ میرا کام تو ترجمہ کرنا ہے، گناہ گار اگر ہوگا تو وہ جو اسے متن کے بغیر شائع کرے۔ کام کی عظمت اور اپنے مبلغ علم کا چونکہ احساس تھا اس لئے سوچا یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ میں ادنیٰ سے معنوی تغیر کے بجائے اسے موجودہ زمانہ کے محاوروں کے مطابق بنا دوں گا۔ حالانکہ محاوروں کی زبان اس وقت تو کیا اب تک نہیں آتی۔ بہرحال ان سے مدینہ پریس بجنور کا طبع شدہ قرآن کریم لیا اور شاہ عبدالقادر صاحب کی موضح القرآن، تاکہ اس کا مطالعہ معنوی تغیر سے محفوظ رہنے میں مدد دے سکے، اور کام شروع کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔ چنانچہ بیشتر اوقات تو یہ ہوتا تھا کہ کام کا ارادہ کرتا تھا اور کئی کئی روز گزر جاتے تھے، لیکن قلم اٹھانے کو جی نہ چاہتا تھا اور جبر کر کے اگر قلم پکڑ بھی لیا تو محسوس ہوتا تھا جیسے سر میں بھیجہ نہیں بھوسا بھرا ہے۔ گھنٹوں قلم لئے بیٹھا ہوں اور صرف الفاظ کی جگہ بدلنی ہے یا ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا ہے۔ لیکن ایک دو سطروں سے زیادہ نہ لکھی گئیں۔

تقریباً چھ ماہ اسی طرح گزر گئے مجبور ہو کر میں نے معذرت کر لی۔ ان چھ ماہ میں سورہ بقرہ کے دوسرے رکوع تک پہنچا تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس ناجائز کام سے محفوظ رکھا۔

ایس۔ ایم کالج کی ملازمت کے دوران کراچی میں اردو بازار کے ایک پبلشر اشفاق حسین صاحب نے فرمائش کی کہ انٹر کے کورس کے مطابق اسلامیات کی ایک کتاب لکھ دوں، میں نے قبول کر لی۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کی کہ کتاب میرے نام سے شائع نہ ہو گی۔ انہوں نے تعجب بھی کیا اور نام پر اصرار بھی۔ اور جب میں اپنے انکار پر قائم رہا تو وجہ پوچھی۔ میں نے کہا کہ خلاصے، نوٹس اور کورس کی چالو قسم کی کتابوں پر میں اپنا نام پسند نہیں کرتا۔ بولے: پروفیسر کے نام ہی سے تو کورس کی کتابیں چلتی ہیں۔ میں نے کہا اس کا میں انتظام کر دوں گا۔ چنانچہ کتاب مکمل کر کے دوسرے کالج کے ایک پروفیسر صاحب کو دی کہ اگر آپ کے معیار کے مطابق ہو تو اسے آپ اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت دے دیں۔ دو تین روز مسودہ اپنے پاس رکھ کر انہوں نے میری درخواست منظور کر لی۔ میں نے کہا کہ اجازت نامہ لکھ کر دے دیجئے تاکہ پبلیشر کو اطمینان ہو سکے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیجئے کہ اس کے معاوضہ سے مجھے کوئی سروکار نہ ہو گا۔ انہوں نے دونوں باتیں لکھ کر دے دیں۔

اتفاق سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت آئی۔ ان پروفیسر صاحب کو معلوم ہوا تو پبلیشر کے پاس پہنچے کہ دوسرے ایڈیشن کا معاوضہ میں لوں گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ محنت کسی کی ہو اور معاوضہ کسی اور کو ملے۔ آپ مظہر بقا صاحب کو لائیے ان کے سامنے گفتگو ہو گی۔ موصوف نے مجھ سے ذکر کیا مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ چونکہ بے تکلفی تھی اس لئے میں نے کہا خدا کے بندے مجھ سے معاوضہ کا ذکر کرتے ہوئے تمہیں کچھ شرم آنی چاہئے تھی، کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ قلم پکڑے بغیر مصنف بن گئے۔ اس کے بعد میں پبلیشر کے پاس گیا اور کہا کہ نصف معاوضہ ان کو دے دیجئے۔

باب پنجم

افکار و عقائد اور متفرقات

فقہی مسائل میں میرا طرز عمل

میں حنفی ہوں اور جب تک ہند و پاک میں رہا صرف حنفی مذہب پر عمل کرتا رہا۔ سعودی عربیہ آنے کے بعد جب مکہ مکرمہ میں جو مختلف مکاتب فکر کا سنگم ہے، اقامت کی سعادت حاصل ہوئی، تو حنفیت میں جو شدت تھی اس میں رفتہ رفتہ کمی آنی شروع ہوئی اور دوسرے فقہی مذاہب کے ساتھ متعصبانہ طرز فکر تقریباً ختم ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں متعدد تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

۱۔ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین چونکہ صحیح اور قوی احادیث سے ثابت ہے اس لئے کبھی کبھی رفع یدین بھی کر لیتا ہوں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ایک مرتبہ اپنی نجی مجلس میں حاضرین سے فرمایا تھا: کبھی کبھی رفع یدین بھی کر لیا کرو کیونکہ اگر قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمالیا کہ تم تک میری یہ سنت بھی تو صحیح طریقہ پر پہنچی تھی، تم نے اس پر کیوں عمل نہ کیا تو کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر کوئی حدیث مجھ تک ضعیف طریقہ سے بھی پہنچی تو میں نے کم از کم ایک بار ضرور اس پر عمل کیا۔

۲۔ قیام میں کبھی کبھی، شاذ و نادر، سینے پر بھی ہاتھ باندھ لیتا ہوں۔ اگرچہ جہاں تک میرا علم ہے اس سلسلہ میں صحاح ستہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں اور دوسری کتب حدیث میں اس سلسلے کی جو روایات ہیں وہ کلام سے مبرا نہیں۔

۳۔ سفر میں صحیح احادیث سے جمع تقدیم بھی ثابت ہے اور جمع تاخیر بھی۔ دوسرے ائمہ کے برخلاف احناف اسے جمع حقیقی کے بجائے جمع صوری پر محمول کرتے ہیں۔ میں نے سفر میں بوقتِ ضرورت جمع تقدیم بھی کی ہے اور جمع تاخیر بھی۔

لیکن ایک مرتبہ خیال آیا کہ عصر کے وقت میں ظہر اور عصر کو اور عشاء کے وقت میں مغرب اور عشاء کو جمع کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ حنفی مذہب کے مطابق ظہر اور مغرب کی نمازیں قضا ہوں گی ادا نہیں، لیکن ہو سب کے نزدیک جائیں گی۔ اس کے برخلاف اگر ظہر کے وقت میں اس کے ساتھ عصر کو اور مغرب کے وقت میں اس کے ساتھ عشاء کو جمع کیا جائے تو وقت نہ ہونے کی وجہ سے حنفیہ کے نزدیک عصر اور عشاء کی نمازیں درست ہی نہ ہوں گی۔

چنانچہ اس کے بعد بوقت ضرورت صرف جمع تاخیر کرنے لگا۔

۴۔ طائف چونکہ میقات سے خارج ہے اس لئے وہاں سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے احناف کے نزدیک میقات پر احرام باندھنا ضروری ہے۔ تفریح کی غرض سے بکثرت ہمارا طائف جانا ہوتا ہے۔ تقریباً دو سال تک تو میں واپسی پر عمرہ کا احرام باندھتا رہا، لیکن بعد میں حنفیت چھوڑ کر ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر عمل کرنے لگا کہ جب تک خاص طور پر عمرہ یا حج کی نیت نہ ہو میقات سے احرام باندھنا ضروری نہیں۔

۵۔ حج کے اعمال میں حاجیوں سے بکثرت غلطیاں صادر ہوتی ہیں۔ لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرتے ہیں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ عمل سے پہلے اگر کسی نے مسئلہ دریافت کیا تو حنفی مذہب کے مطابق مسئلہ بتاتا ہوں، اور اگر کسی نے عمل کے بعد دریافت کیا تو اگر وہ عمل کسی بھی امام کے نزدیک درست نہیں، ہو تو بھی حنفی مذہب کے مطابق بتا دیتا ہوں کہ اب تمیں یہ کرنا چاہئے اور اگر ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کے نزدیک وہ عمل درست ہو گیا ہے تو کہہ دیتا ہوں کہ جو ہو گیا وہ گیا، آئندہ ایسا نہ کرنا۔

ایسے مواقع پر میرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طرز عمل رہتا ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اختیار فرمایا تھا کہ صحابہ کی ہر غلطی پر آپ نے "افعل ولا حرج" ہی فرمایا تھا۔

ایک مسئلہ ایسا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی سال ایسا گزرتا ہے جب وہ مسئلہ مجھ سے نہ پوچھا جاتا ہو۔ وہ یہ کہ طواف زیارت سے پہلے کسی عورت کو حیض آجائے اور سیٹ بک ہو۔ اس حالت میں عورت طواف کر نہیں سکتی اور طواف کے بغیر چلی جائے تو زندگی بھر شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی تاآنکہ دوبارہ یہاں آئے اور طواف زیارت کرے اور تاخیر کا دم بھی دے۔ اپنی یا شوہر کی ملازمت وغیرہ کی مجبوری کی وجہ سے وہ رک نہیں سکتی، اور اگر سیٹ منسوخ کرا کے رک بھی جائے تو حج کے ایام میں دوبارہ اپنی مرضی کی سیٹ ملنا آسان نہیں اور یہ بھی ہر ایک کے بس میں نہیں کہ دوبارہ آئے اور طواف زیارت کرے۔

دوسرے ائمہ کے یہاں اس مسئلہ میں زیادہ شدت ہے کہ ان کے نزدیک طہارت کے بغیر طواف کر لیا تو ہوگا ہی نہیں۔ حنفی مذہب میں کچھ نرمی ہے کہ ہو تو جائے گا لیکن بدنہ (گائے یا اونٹ) قربان کرنا واجب ہوگا۔ لیکن عورت سے یہ نہ کہا جائے کہ وہ اسی حالت میں طواف کر لے اور بدنہ کی قربانی دے دے بلکہ اسے اس طرح مسئلہ بتایا جائے کہ اس کے لئے اس حالت میں مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا حرام ہے لیکن اگر اس نے کر لیا تو بدنہ واجب ہوگا۔ اب عورت کی اپنی مرضی ہے چاہے تو وہ اس پر عمل کرے چاہے تو نہ کرے۔

علامہ ابن تیمیہ نے اس پر مفصل گفتگو کے بعد فتویٰ دیا ہے کہ عورت اسی حالت میں طواف کر لے اور اس پر کوئی دم واجب نہیں۔

میں ایسے مواقع پر کہہ دیتا ہوں کہ حنفیہ کے نزدیک تو مسئلہ یہ ہے لیکن علامہ ابن تیمیہ کا فتویٰ یہ ہے۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ کون کس پر عمل کرتا ہے۔

یہ میں لکھ چکا ہوں کہ میری حنفی عصبیت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے، لیکن عدم تقلید کی حدود میں کبھی داخل نہیں ہوا۔

بیعت و خلافت

۱۹۵۴ء میں جبکہ میں دارالعلوم نانک واڑہ میں نائب مفتی کی حیثیت سے کام کرتا تھا، نقشبندی مجددی سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شاہ زوار حسین صاحب خیر پورٹامے والی ریاست بہاولپور سے کراچی تشریف لائے۔ حکیم عبدالکریم صاحب جیلانی مجھے ان کی خدمت میں لے گئے۔ بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ جیلانی صاحب نے کہا کہ مفتی صاحب (یعنی میں) آپ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں۔ موصوف نے اپنی عادت کے خلاف (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا) فوراً مجھے بیعت کر لیا اور حقیقت یہ تھی کہ نہ میں بیعت کے ارادہ سے گیا تھا اور نہ اس سلسلہ میں جیلانی صاحب سے کوئی بات ہوئی تھی۔ بعد میں جب حضرت شاہ صاحب کے حالات معلوم ہوئے تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں نے کسی غلط شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا۔

بیعت کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ذکر کا طریقہ بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور اعمال کے سوا آپ مجھ سے دریافت کئے بغیر اور کوئی عمل نہ کریں۔

اس مجلس میں جیلانی صاحب نے یہ بھی کہہ دیا کہ حضرت یہ اپنی فضول خرچی کی وجہ سے ہمیشہ پریشان اور مقروض رہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: دیکھئے اگر کسی شخص کی تنخواہ سو روپے ماہوار ہو اور وہ نوے یا ایک سو دس روپے ماہوار صرف کرے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ نوے صرف کرے اور دس روپے بچا رکھے تاکہ اس رقم سے ہنگامی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ فرمایا کہ میرا ہمیشہ یہی معمول رہا اور اسی لئے مجھے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔

میں حضرت شاہ صاحب سے بیعت تو ہو گیا لیکن یہ بیعت برائے نام ہی رہی

اس لئے کہ میں کبھی بھی اسباق کی پابندی نہ کر سکا لیکن مکمل بے تعلقی بھی نہیں برتی۔ بالآخر کچھوے کی چال نے مجھے برسوں بعد دائرہ ولایت صغریٰ کے سبق تک پہنچا دیا اور یہ سبق دے کر حضرت شاہ صاحب نے حاجی محمد اعلیٰ صاحب کی موجودگی میں فرمایا کہ اس مرحلہ میں عام طور پر خلافت دے دی جاتی ہے، لیکن ہم ذرا مزید احتیاط برتتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت کا وصال ہو گیا۔

حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر عبدالرحیم گاندھی صاحب نے، جو حضرت شاہ صاحب کے خلیفہ ہیں، محض ازروئے شفقت مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور چند سالوں کے عرصے میں چھ اسباق دیئے لیکن میری طبیعت کو ڈاکٹر صاحب موصوف سے مناسبت نہ ہو سکی، اس لئے ان سے جیسا چاہیئے تھا فیض حاصل نہ کر سکا چنانچہ میں نے انہیں مطلع کئے بغیر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی طرف رجوع کر کے ان سے باقاعدہ بیعت کر لی اور ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اسی وقت اجازت وخلافت بھی عطا فرما دی۔

جب میں ۱۹۹۲ء کی سالانہ تعطیلات میں سعودیہ سے کراچی آیا تو حضرت مجدد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر جو قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی طرف سے ہر سال کراچی میں پیر کالونی میں (اور اس کے بعد حیدرآباد میں) منعقد کیا جاتا ہے، ڈاکٹر گاندھی صاحب نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب سے فرمایا: میں مظہر بقا کو خلافت دینا چاہتا ہوں، آپ غور فرمالیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور اس کے ایک ہفتہ بعد حیدرآباد کے عرس کے موقع پر ڈاکٹر گاندھی صاحب سے کہا کہ میں تو اسے خلافت بھی دے چکا ہوں۔

حضرت قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ نے خلافت کی سند کے طور پر جو کچھ تحریر فرمایا اس کا عکس منسلک ہے۔

Professor
Dr. Ghulam Mustafa Khan
M.A, LL.B., Ph.D., D. Litt.

2, OLD UNIVERSITY CAMPUS,
HYDERABAD, SINDH.

DATED..........................

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ۔ اما بعد
عرض ہو کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی محمد مظہر بقا صاحب
مدظلہ جامعِ علومِ ظاہری و باطنی ہیں اور سلسلۂ عالیہ
نقشبندیۂ مجددیہ کے "مراقبۂ لاتعین" تک کی ترویج کی
اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتے ہیں، اس لیے یہ عاجز اپنی
نااہلی اور بے عملی کے باوجود، محض اللہ تعالیٰ کے فضل و
احسان پر توکل کرکے اُن کو ترویجِ طریقہ و اماتتِ
بدعتِ نامرضیہ و احیاءِ سنتِ سنیۃ کے لیے خلافت
اور اجازتِ تعلیم دینے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔
یہ اجازت (یعنی خلافت) کئی ماہ پہلے ہی عرض کرچکا تھا
لیکن اب تحریری طور پر بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اور
اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی عاجزانہ طور پر معافی کا
خواستگار ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔

احقر — غلام مصطفےٰ خان

چہارشنبہ ۳ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
۲ ستمبر ۱۹۹۲ء

حضرت شاہ زوار حسین صاحب کے حالات پر ایک مستقل کتاب شائع ہو چکی ہے۔ جسے محترم حاجی محمد اعلیٰ صاحب قبلہ نے مرتب فرمایا ہے۔ اس کتاب میں "وفات حسرت آیات"، "ملفوظات"، "حضرت شاہ صاحب کی فقہی بصیرت" اور "کشف وکرامات" کے عنوانات سے ۶۰ صفحات راقم الحروف کے تحریر کردہ بھی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کے کچھ حالات میں نے اپنی کتاب "کچھ یادیں" میں تحریر کئے ہیں۔

پہلا حج

۱۹۷۰ء، ۱۹۷۱ء میں محمد یوسف اسحاقی صاحب مرحوم کے ساتھ حج کی درخواست دی، قرعہ میں نام نہ آیا۔ دینے سے قبل لگن نہ تھی، لیکن اس کے بعد ذہن چونکہ اس طرف مشغول رہا اس لئے لگن پیدا ہو گئی ۔ چنانچہ تگ و دو شروع کر دی ۔ مولانا منتخب الحق صاحب کے ہمراہ ایک میمن صاحب کے پاس گیا جو جہاز راں کمپنی کے ڈائریکٹروں میں سے ایک تھے ۔ موصوف نے وعدہ یا کم از کم کوشش کا وعدہ کرنے کے بجائے یہ کہہ کر تسلی دی کہ اگر آپ کی قسمت میں ہے تو آپ ضرور جائیں گے اور کچھ قصے بھی سنا ڈالے ۔ فرمایا کہ جہاز کی روانگی کے وقت میں موجود رہتا ہوں ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ:

۱.... ایک مرتبہ جہاز روانہ ہونے لگا صرف کپتان کی سیڑھی اٹھنا باقی تھی اور سعودی سفیر معائنہ کے بعد اس سیڑھی سے اتر رہا تھا کہ ایک طرف سے دو پٹھان دوڑے چلے آ رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں کہ ہمیں مت چھوڑو ہم بھی جائیں گے ۔ سفیر نے دریافت کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں ۔ بتایا گیا تو کہا کہ پوچھو کیا ان کے پاس پاسپورٹ ہیں اور ٹیکے لگے ہوئے ہیں ۔ جواب اثبات میں ملا، سفیر نے اسی وقت ویزا دیا اور کہا کہ انہیں میرے حساب پر لے جاؤ۔

۲.... جہاز نے روانگی کے لئے حرکت کی، کنارے سے ذرا سا ہٹا ہی تھا کہ ایک صاحب نے شور مچانا شروع کر دیا ۔ مجھے اتارو ۔ مجھے اتارو ۔ بے انتہا شور مچایا اور پانی میں چھلانگ لگانے کی دھمکی دی ۔ نتیجتاً جہاز کو پھر کنارے لگا کر انہیں اتارا گیا ۔ اسکے بعد جہاز روانہ ہوا۔

۳.... ایک صاحب مکہ معظمہ پہنچ گئے، مسجد حرام میں داخل ہوئے اور خانہ کعبہ پر نظر

پڑی تو منہ سے نکلا: لاحول ولا قوۃ، یہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز تھی جس کے لئے میں یہاں آیا۔

غرض یہ کہ موصوف نے دلاسہ دینے اور قصے سنانے ہی میں ٹرخا دیا لیکن بات جو انہوں نے کہی تھی سو فیصد درست تھی کہ اللہ کو منظور ہو تو کوئی نہیں روک سکتا۔

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ العالیٰ کی خدمت میں حیدر آباد بھی گیا کہ ان سے دعا کراؤں۔ موصوف نے فرمایا: مفتی صاحب (اس حلقہ کے لوگ مجھے مفتی صاحب ہی کہتے ہیں) آپ جانے کی تیاری کریں۔ میں نے آپ کو عرفات کے میدان میں دیکھا ہے۔

واپس آیا تو ابراہیم صاحب انجینئر نے منظوری دے دی۔ اللہ انہیں خوش رکھے یا بصورت دیگر مغفرت فرمائے۔ اپنی منظوری کے بعد بیوی کے لئے بھی منظوری مل گئی جس کا واقعہ بیوی کے ذکر میں ہے۔

حج کا یہ پہلا سفر ہم نے سفینۂ حجاج سے کیا۔ حج کے مصارف فی کس =/1560 روپے تھے۔ جس میں کرایہ کے علاوہ بیرونی زر مبادلہ بھی شامل تھا۔ ہم نے قران کا احرام باندھا تھا اور حج سے صرف دو روز قبل مکہ معظمہ پہنچے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں مکان ملنا آسان نہیں ہوتا۔

محترم محمد حسین کاپڑیا صاحب اس سال انجمن خدام النبی کے انچارج بن کر گئے تھے۔ باب عبدالعزیز کے سامنے سڑک کے پار امام کعبہ کا مکان تھا۔ اس کی نچلی منزل میں انجمن کا دواخانہ اور پہلی منزل میں ان کا دفتر تھا۔ دوسری منزل کاپڑیا صاحب نے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کرایہ پر لے رکھی تھی۔

مکان کی طرف سے ہماری پریشانی دیکھ کر کاپڑیا صاحب نے مجھے اور یوسف اسحاقی صاحب کو مع ہماری بیویوں کے اپنے پاس ٹھہرالیا۔ چنانچہ دو روز تک ان کے مہمان رہے، نہ صرف قیام بلکہ طعام بھی انہی کے ذمہ تھا۔

حج سے فراغت کے فوراً بعد کاپڑیا صاحب کے مشورہ سے ہم انہی کے ہمراہ مدینہ منورہ چلے گئے۔ کاپڑیا صاحب نے عبداللطیف باوانی کی سرائے میں ہمارے قیام کا انتظام کر دیا۔ مدینہ منورہ میں ہم نے ۲۳ روز قیام کیا، اور اس کے لئے سفارشی خط سعودی سفارت خانہ سے لے لیا تھا۔

مدینہ منورہ کا قیام جہاں ہر وقت رحمت برستی ہے انتہائی خوشگوار رہا۔ بیوی کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے مائیکے میں ہوں۔

مدینہ منورہ میں عام طور پر حاجی صاحبان جو زیارات کرتے ہیں ہم نے بھی کیں حضرت سلمان فارسی کے نام سے کھجوروں کا جو باغ موسوم ہے، ان میں وہ دو درخت بھی تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کے لئے اپنے دستِ مبارک سے لگایا تھا۔ باغ کا مالک ان درختوں کی کھجوریں دو ریال فی کھجور کے حساب سے فروخت کرتا تھا۔ ہم نے جس زمانہ میں اس باغ کی زیارت کی ان درختوں کی کھجوریں باقی نہ بچی تھیں۔ (اب اس باغ کے تمام درخت جلادیئے گئے ہیں)۔

مدینہ منورہ میں ۲۳ روز قیام کے بعد جب ہم مکہ مکرمہ واپس آئے تو کاپڑیا صاحب پاکستان واپس ہو چکے تھے اور اپنی قیام گاہ کی چابی ہمارے لئے دے گئے تھے، چنانچہ باقی ماندہ سترہ یوم ہم نے اسی میں گزارے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازے۔

مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ایک خاص بات یہ پیش آئی کہ جب خانہ کعبہ کے غلاف کو محرم میں نیچا کر کے رسہ سے سیا گیا تو میں نے انچارج سے سوئی اور تاگہ لے کر سینے میں شرکت کی، وہ موٹی سوئی اور ریشمیں سیاہ تاگے کے بچے ہوئے ٹکڑے اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ سینے کے دوران سوئی ایک انگلی میں چبھ گئی اور اس میں سے کچھ خون بھی نکلا جو غلاف کعبہ میں جذب ہوا۔

جب انچارج نے حجر اسود اور رکن یمانی کو کھولنے کے لئے اس جگہ سے غلاف کا

حصہ کاٹا تو میرے دل میں یہ تمنا جاگی کہ کاش غلاف کا کوئی ٹکڑا مجھے بھی مل سکتا۔ میں نے انچارج کی بہت خوشامد کی لیکن اس نے جھڑک دیا۔ میں نے اپنے معلم سے کہا کہ قیمتہً ہی مل جائے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کی کوئی صورت نہیں کیونکہ حکومت نے چند سالوں سے یہ کیا ہے کہ پرانے غلاف کو صندوقوں میں بند کر دیتی ہے اور شیبی (خانہ۔ کعبہ کا متولی) کو اس کی قیمت دے دیتی ہے۔

جب میں مایوس ہو گیا تو میں نے نذر مانی کہ اگر مجھے غلاف کعبہ کا کوئی ٹکڑا مل گیا تو میں مسلسل سات طواف کروں گا۔

جس صبح کو پاکستان کے لئے ہماری روانگی تھی، بیوی نے کہا کہ آج رات حرم شریف ہی میں گزاریں، چنانچہ عشاء کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر حرم شریف چلے گئے۔

مجھے خیال آیا کہ میں نے سات مسلسل طوافوں کی نذر مانی ہے، اگر کسی شخص نے روانگی کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے وقت غلاف کا ٹکڑا دے دیا تو نذر کیسے پوری کی جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے مسلسل سات طواف کئے اور آخر میں دعا کی کہ اگر غلاف کعبہ مل جائے تو یہ طواف نذر کے ہیں ورنہ ان کا ثواب میرے والدین کو پہنچے۔

میرے ساتھ ساتھ جب بیوی بھی طوافوں سے فارغ ہوئیں تو کہنے لگیں کہ تھوڑی دیر کمر نکالیں، پھر طواف شروع کریں گے۔ میں نے کہا کہ کمر ہی نکالنا ہے تو سامنے ہی تو گھر ہے، وہاں آرام سے لیٹیں، تھوڑی دیر بعد تو تہجد کے لئے آنا ہی ہے۔ چنانچہ ہم باب جیاد سے نکلے۔ جب دروازہ پر بیٹھے ہوئے شرطی (سپاہی) کے پاس سے گزرنے لگے تو اس نے کہا: "تبغ قماش كعبة؟" (تمہیں کعبہ کے غلاف کا کپڑا چاہیے؟) میں نے اثبات میں جواب دیا، اس نے اپنی جیب سے ایک انچ لمبا چوڑا ٹکڑا نکال کر میرے حوالے کر دیا، میں نے دو ریال اسے نذر کئے۔ فوراً ہی مجھے خیال ہوا کہ اسحاقی صاحب میرے شریک حج ہیں، اگر انہیں بھی میں نے اس میں سے نصف دیا تو بچے گا ہی کتنا، یہ سوچ کر میں نے سپاہی سے کہا کہ "اور ہے؟" اس نے اتنا ہی ٹکڑا مزید دے دیا اور میں

نے مزید دو ریال پیش کیے۔

جب ہم پاکستان واپس آئے تو اسحاقی صاحب مرحوم نے یہ واقعہ اپنی خوشد امن سے بیان کیا اور انہوں نے اس سے متاثر ہو کر کہا کہ میرے والد کا لایا ہوا اسی (۸۰) سال پہلے کا غلاف کعبہ کا ایک گز ٹکڑا میرے پاس موجود ہے، اس میں سے آدھا کاٹ کر لے جاؤ اور مظہر بقا صاحب کو میری طرف سے دے دو۔ چنانچہ آدھے گز کا ٹکڑا وہ میرے پاس لائے، لیکن یہ بھی کہا کہ جب مکہ میں آپ نے مجھے اپنے برابر کا ٹکڑا دیا تو اس میں سے نصف کا حقدار مجھے ہونا چاہئے۔ میں نے اس میں سے نصف کاٹ کر انہیں دے دیا۔ باقی ماندہ نصف میں سے تھوڑا سا ٹکڑا امتیاز احمد مرحوم کو اور تھوڑا سا برائٹ پرنٹرز والوں کو دیا، باقی ماندہ حصہ میرے پاس، سوئی تاگہ اور آدھے انچ ٹکڑے کے ساتھ محفوظ ہے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

مکہ مکرمہ ہی میں ایک خاص بات یہ پیش آئی کہ میں نے ایک روز نیچے اتر کر اس ڈول سے زمزم پیا جو ایک آدمی کھینچ رہا تھا، پھر اوپر آکر خانہ کعبہ کی طرف رخ کیا اور دعا کی کہ یا اللہ پیشاب کا قطرہ آنے کی جو شکایت مجھے برسوں سے ہے وہ دور ہو جائے اس لئے کہ اس سے نمازوں میں خلل آتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس دعا کے بعد سے آج تک مجھے یہ شکایت محسوس نہیں ہوئی، جبکہ یہ واقعہ ۱۹۷۰ء کا ہے اور اس وقت ۱۹۹۲ء ہے۔

چونکہ ۱۹۷۸ء سے اس وقت تک میرا قیام مکہ مکرمہ میں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہر سال حج کرتا رہا۔ صرف اس سال حج نہ کر سکا جب امریکہ گیا ہوا تھا۔ اس طرح الحمد للہ اس وقت تک سترہ (۱۷) حج کر چکا ہوں۔

اندر سے خانہ کعبہ کی زیارت

۲۹۔ رجب ۱۴۱۲ھ م فروری ۱۹۹۲ء

آج تہجد کے وقت صبح سوا پانچ بجے کے قریب محمد صدیق بھٹی صاحب کا فون آیا

کہ رابطہ عالم اسلامی کی مساجد کمیٹی کے مہمانوں کے لئے آج خانہ ۔ کعبہ کا دروازہ ساڑھے سات بجے کھلے گا، اس لئے پونے سات بجے تک حرم پہنچ جانا ہے ۔ چنانچہ بھئی صاحب کے ساتھ ہی وقت پر حرم پہنچ گیا ۔ بھئی صاحب کے طفیل میں ، اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے ، آج اللہ تعالیٰ نے تیرہ سالہ دیرینہ آرزو پوری فرما دی اور اپنے گھر کے اندر داخلہ کی سعادت عطا فرمائی ۔ چاروں سمت رخ کر کے بارہ رکعت نوافل پڑھے اور دعائیں کیں ۔

خانہ ۔ کعبہ کے وسط میں شمالاً جنوباً ایک قطار میں تین ستون ہیں ۔ داخل ہوتے ہی جو پہلے دو ستون ہیں ان کے درمیان میں دو صندوق رکھے ہیں اور ان پر بہت خوبصورت ہریالی مائل نیلے رنگ کے دو پتھر نچھے ہوئے ہیں ۔ دیواروں پر پتھروں پر کندہ کچھ کتبے بھی لگے ہیں ۔ دیواروں اور ستونوں پر سبز رنگ کا غلاف ہے جس پر " لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ " لکھا ہوا ہے ۔ پردے قد آدم تک اوپر کر دیئے گئے ہیں ۔

دائیں جانب چھت پر جانے کے لئے دروازہ ہے جو بند تھا ۔ خانہ ۔ کعبہ کی چھت دہری ہے اوپر والی چھت کے نیچے ایک اور چھت ہے غالباً لکڑی کی ۔ یہ بات مجھے وثوق کے ساتھ دوسروں کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے ۔ چھت کو دیکھنا اگرچہ ادب کے خلاف ہے لیکن میں نے سوچا تھا کہ چھت بھی دیکھوں گا، بے ادبی یا لاپروائی کی نیت سے نہیں صرف اس کی حالت دیکھنے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے ۔ لیکن اندر جا کر نوافل اور دعاؤں میں ایسا مشغول ہوا کہ چھت دیکھنا ہی بھول گیا ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس بے ادبی سے محفوظ رکھا ۔

میری اہلیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے دو بار خانہ ۔ کعبہ کے اندر داخلے کی سعادت عطا فرمائی ہے اور میرے چھوٹے لڑکے محمد اعظم بقا کو بھی ایک بار یہ سعادت نصیب ہوئی ہے ۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ۔ آمین ۔

میرے خواب

ذیل میں اپنے چند ایسے خواب کا ذکر کر رہا ہوں جنہیں میں اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں:

○ ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ میرے والد صاحب مرحوم ایک ندی کے کنارے کھڑے ہیں ان سے کچھ فاصلہ پر ان کے دوست عبدالشکور صاحب پٹواری مرحوم ہیں اور تھوڑے فاصلہ پر میں کھڑا ہوں۔ والد صاحب میری طرف اشارہ کر کے اپنے دوست سے فرماتے ہیں کہ جب یہ پیدا ہوا تھا تو ایک جوتشی نے کہا تھا کہ یہ بڑا آدمی بنے گا۔ دنیا کے اعتبار سے تو میں بلاشبہ بڑا آدمی بن گیا۔ کاش اللہ تعالیٰ دین کے اعتبار سے بھی بڑا بنا دے۔

○ کراچی یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ میں اور سلسلہ کے بعض دوسرے حضرات ایک بیل گاڑی میں صوفی محمد احمد صاحب مرحوم کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ سامنے ایک پہاڑی آگئی اور راستہ ختم ہو گیا۔ کچھ لوگ گاڑی سے اترے اور گاڑی پلٹالی گئی۔ لوگ واپسی کے لئے دوبارہ گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ میں ابھی نیچے ہی تھا کہ مجھے کسی نے پہاڑی پر سے مخاطب کیا اور کہا کہ جب یہاں تک آئے ہو تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت نہ کرو گے؟ پلٹ کر دیکھا تو حضرت فاطمہ الزہرا تھیں، علیہا السلام۔ میں نے جواباً عرض کیا: ضرور۔ حضرت سیدہ کھلے بالوں سفید لباس میں چوٹی پر کھڑی تھیں۔ میں جب قریب پہنچا تو انہوں نے اپنے دائیں جانب کے نشیب کی طرف اشارہ فرمایا۔ میں نے وہاں پہنچ کر حضورؐ کی قبر مبارک کی زیارت کی۔ یاد نہیں کہ صلاۃ وسلام بھی پڑھا تھا یا نہیں۔ واپس ہوا تو حضرت سیدہ کے بائیں جانب کے نشیب کی طرف سے اترنے کا ارادہ کیا۔ حضرت سیدہ

نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور فرمایا: "اس طرف نہیں جانے دوں گی۔ اس طرف میرے اہل بیت کے مزارات ہیں۔" میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے اپنے رفیق کار مولانا عابد الشہر صاحب سے اس خواب کا ذکر کیا۔ خیال تھا کہ یہ جواب دیں گے کہ تم چونکہ شیعہ نہیں، ہو اس لئے حضرت سیدہ نے اس طرف نہیں جانے دیا۔ لیکن مولانا نے صرف اتنا فرمایا کہ حضرت سیدہ کی زیارت بھی بڑی سعادت ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہے کہ ایک رات خواب میں آسمان پر ایک بہت روشن ستارہ دیکھا اور خیال ہوا کہ یہ اللہ کا نور ہے۔ پھر خواب ہی میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ اللہ کا نور کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں (کانہ کوکب دری) (گویا کہ وہ روشن ستارہ ہے) تو صرف ایک تمثیل ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ستارہ غائب ہو جاتا ہے اور دیکھتا ہوں کہ زمین پر ایک تخت بچھا ہے اور اس کے اوپر کورے لٹھے کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے اور خیال ہو رہا ہے کہ یہ عرش خداوندی ہے۔ تخت کی بلندی سینے تک ہے اور وہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ اس کا صرف ایک پایہ نظر آ رہا ہے باقی پائے کہاں ہیں، کچھ پتہ نہیں۔

تخت کے نیچے لمبا کرتہ پہنے ننگے سر اور ننگے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں اور آپؐ کے بائیں جانب ایک قدم پیچھے میں کھڑا ہوں۔ اور حضورؐ تخت کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے میرے لئے شفاعت فرما رہے ہیں۔

اس خواب کے بعد سے آج تک جبکہ ۱۹۹۴ء کا وسط ہے یہ بات پختگی کے ساتھ دل میں جمی ہوئی ہے کہ زندگی میں اعمال خواہ کیسے ہی ہوں، خاتمہ انشاءاللہ ایمان پر ہوگا اور اس خیال کو حقیقت بنا دینا اللہ کے لئے کچھ بعید نہیں۔

طالب علمی کے زمانہ میں خیال ہوتا ہے کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی خواب میں دیکھا ہے۔

○ ۲۵۔ محرم ۱۳۷۱ھ .... ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

آخر شب میں خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں آپ کے ساتھ دوسرے اصحاب بھی ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ ان میں حضرت صدیقؓ وحضرت فاروقؓ بھی ہیں، حضورؐ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرا دیں۔ چنانچہ مجھے روشنی کا ایک ہلکا سا عکس نظر آتا ہے جیسے دور کوئی ستارہ ہو، لیکن روشنی ستارے کے بجائے چراغ جیسی تھی۔ معاً میرے دل میں عالم خواب ہی میں یہ خیال گزرتا ہے کہ میں تو حالت جنابت میں ہوں، اس حالت میں خدا کو دیکھنا تو کجا میری نظریں تو حضورؐ کے چہرہ مبارک پر بھی نہیں پڑ سکتیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ روشنی غائب ہو گئی اور محسوس ہوا کہ میری دائیں جانب کاغذ یا کپڑے کا ایک پردہ پڑا ہے جس میں آیات لکھی ہوئی ہیں یا کچھ اور۔ پردہ کے پیچھے مجھ سے سوا یا ڈیڑھ ہاتھ کے فاصلہ پر حضورؐ تشریف فرما ہیں اور میں خواب ہی میں یہ کہے جا رہا ہوں کہ میں اس حالت میں حضورؐ کے چہرہ انور کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ یہی کہتے کہتے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

○ ۱۹۷۱ء کی پاک وہند جنگ کے دوران کسی رات خواب دیکھا کہ ایک مسجد ہے اوسط درجہ کی۔ اس کے جنوب کی جانب ایک بالکنی ہے اور بالکنی کے سامنے بہت وسیع میدان ہے۔ جس میں سے فوجیں جا رہی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکنی پر کھڑے انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضورؐ مسجد کے اندر تشریف لائے اور ایک ستون کے پاس کھڑے ہو گئے، میں سامنے کھڑا ہوں۔ حضورؐ کی عمر مبارک جیسے پچاس کے قریب ہو اور میری جیسے نو دس سال کے قریب۔ حضورؐ فوجی وردی میں ملبوس تھے اور پی کیپ لگائے ہوئے تھے۔ حضورؐ کی پشت مغرب کی طرف تھی اور میں حضورؐ کے مشرقی سمت میں تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مسجد میں بہت سے صحابہ قبلہ رخ بیٹھے تھے۔ حضورؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا "کہاں کے رہنے والے ہو؟" میں نے کہا حضورؐ ریاست

ٹونک کا آپؐ نے فرمایا: "اچھا اچھا ٹونک" اس کے بعد آپؐ مسجد کے شمالی دروازے کی طرف تشریف لے گئے۔ اس کے باہر ایک کافی اونچی منڈیر بنی ہوئی تھی اور اس پر کچھ آدمی یا بچے بیٹھے تھے۔

○ ۱۷/۱۱/۹۷ھ ... ۳۱/۱۰/۱۹۷۷ء بروز شنبہ

دوپہر کے کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد لیٹا اور عادت کے مطابق ٹیپ کھول لیا۔ شیخ شعبان مصری کا سورۃ مزمل و مدثر کا جو ٹیپ میرے پاس ہے اسے سن سن کر دہراتا رہا۔ پھر ٹیپ بند کر کے سورۃ مدثر پڑھتے ہوئے چار بجے کے بعد سو گیا۔ پانچ بجے کے قریب میں نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان تشریف فرما ہیں (اگرچہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا ہو) اور ایک صحابی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر یا تلوار نیام سے نکال کر حضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ یا رسول اللہ ہم بنو اسرائیل کی طرح نہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ آپؑ اور آپ کا پروردگار جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم تو آپ کے آگے بھی لڑیں گے، پیچھے بھی، دائیں بھی اور بائیں بھی۔ خواب ہی میں سوچ رہا ہوں کہ ان صحابی کا نام کیا ہے تو حضرت سعد بن معاذؓ کا نام یاد آ رہا ہے لیکن خواب ہی میں مجھے شک ہو رہا ہے کہ یہ ہیں یا کوئی اور۔ شاید پانچ بج کر دس منٹ پر آنکھ کھلی ہو گی، لیکن لیٹے لیٹے ہی حیرت میں ڈوبا ہوا سوچ رہا ہوں کہ میں نے یہ خواب دیکھا بھی ہے یا نہیں یا صرف میرا وہم ہے۔ میرے اوپر فرحت اور انبساط کی کیفیت طاری تھی۔ بالآخر میری زبان سے نکلا۔ لا شک انہا مبشرۃ (اس میں شک نہیں کہ یہ بشارت والا خواب ہے)۔ میں ابھی بستر سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ شیخ شعبان تشریف لے آئے اور بچے نے ان کی آمد کی خبر دی۔ گویا سونے سے پہلے ان کی آواز سن رہا تھا اور بیدار ہوا تو خود ان کو موجود پایا۔ شیخ شعبان بڑے ذاکر و شاغل آدمی ہیں، سلسلہ خلوتیہ سے وابستہ ہیں جو حضرت جنید کی طرف منسوب ہے۔ میں نے خواب

ان کو سنایا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مغرب کے بعد بخاری شریف کھولی کہ ان صحابی کا صحیح نام دیکھوں۔ معلوم ہوا کہ وہ حضرت مقداد بن الاسودؓ ہیں، جنہوں نے غزوہ بدر کے موقع پر حضور سے یہ بات کہی تھی، حضرت ابن مسعود اس کے راوی ہیں۔

مغرب کی نماز میں خیال آیا کہ اگر کوئی شخص سورۃ مدثر پڑھتا ہوا سو جایا کرے تو ممکن ہے اسے خواب میں حضور کی زیارت ہو جائے۔

○ ۲۰۔ محرم ۱۳۹۸ھ ... ۳۰۔ دسمبر ۱۹۷۷ء، بروز جمعہ

کل جمعرات کو جدہ سے تقریباً سوا نو بجے مکہ مکرمہ پہنچا۔ اکرم صاحب کے گھر جا رہا تھا کہ راستہ میں ہارون صاحب سے ملاقات ہو گئی جو میرے پیر بھائی ہیں۔ مجھ سے گھر چلنے کے لئے کہا، میں ساتھ ہو گیا۔ مدرسہ صولتیہ کے قریب ایک مکان میں سو ریال ماہوار کے حساب سے انہوں نے ایک بستر کی جگہ لے رکھی ہے۔ مجھ سے کہا کہ رات یہیں رہ جائیں۔ میں نے کہا کہ حرم شریف جا کر عشاء کی نماز پڑھوں گا پھر طواف کروں گا، پھر گھر جاؤں گا۔ اگر اکرم صاحب طائف سے نہ لوٹے ہوں گے تو آپ کے پاس آجاؤں گا، چنانچہ رات کو سونے کے لئے انہی کے پاس جانا پڑا، تقریباً ساڑھے گیارہ بجے۔

تہجد کی اذان سے آنکھ کھلی تو ایک دم ذہن سے دھندلا سا خاکہ ابھرا کہ میں تو ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا اور ذہن پر زور ڈالتا رہا کہ میں نے کیا دیکھا تھا، کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ خواب اگر واضح طور پر یاد نہ ہو تو آنکھ کھلنے کے فوراً بعد آنکھیں بند کر کے لیٹے لیٹے ذہن پر زور ڈالنے سے خواب یاد آجاتا ہے۔ چنانچہ جو یاد آیا وہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضورؐ اس مکان میں تشریف لائے ہیں یا اسی کے قریب کوئی اور مکان ہے جس میں آپؐ تشریف لے جا رہے ہیں، اس مکان میں آپ کی اولاد اطہار ہے۔ آپؐ اس مکان سے تشریف لائے ہیں جو

سوق الصاغہ میں حضرت خدیجہؓ کا ہے اور حضرت خدیجہؓ کا پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ آپؐ حضرت خدیجہؓ کے مکان سے روانہ ہو کر مسجد حرام میں سے ہوتے ہوئے تشریف لائے ہیں اور آپؐ کے دستِ مبارک میں دو یا تین سمولیاں یعنی گول اور لمبی روٹیاں ہیں جن کے اندر گوشت وغیرہ بھر کر سینڈوچ بنا دیا گیا ہے۔ یہ روٹیاں آپؐ اپنے عیال کے کھانے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ میں راستہ کی ایک جانب کھڑا ہوں۔ حضورؐ میرے پاس سے گزرے تو مجھ سے فرمایا کہ تمہارا کام ہو جائے گا۔ (کلیتہ الشریعہ میں ملازمت کی جانب اشارہ تھا) میں نے پوچھا حضورؐ میرے لڑکے (محمد اظہر بقا) کا؟ تو ذرا تامل کے بعد فرمایا اس کا بھی ہو جائے گا (اشارہ تھا کہ اسے بھی ملازمت مل جائے گی)۔

جمعہ کی نماز تک اس خواب کا میرے اوپر کوئی اثر نہ تھا جیسے کہ میں نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو بلکہ ذہن نے خود یہ کڑیاں ملائی ہوں۔ لیکن جمعہ سے پہلے کی سنتیں پڑھ رہا تھا کہ ایک دم اس خواب کا خیال آیا اور میری کیفیت بدل گئی، آنسو جاری ہو گئے اور دل میں آیا کہ یہ محض خیال نہیں بلکہ واقعتہً خواب تھا اور واقعتہً حضورؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے کہ "من رانی فقد رای الحق فان الشیطان لا یتمثل فی صورتی" (جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حق دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا)۔ میں نے دیکھا تھا کہ حضورؐ کا جسم بھرا ہوا اور گداز ہے اور گویا اس عمر کا جسم ہے جو ادھیڑ سے قریب ہو اور آپؐ سیاہی مائل جیکٹ پہنے ہوئے تھے جو سردی میں پہنی جاتی ہے اور واقعتہً رات کو کافی سرد ہوا چل رہی تھی۔ اگر یہ سرد ہوا نہ ہوتی تو شاید میں رات حرم شریف ہی میں گزار دیتا اور ہارون صاحب کے گھر نہ جاتا۔

○ ۱/۲/۹۸ھ ... ۱۰/۱/۱۹۷۸ء

خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ عربی کی ایک عبارت گویا اظہر کے لئے ہوئی ہے اور وہی عبارت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی زبان مبارک سے بھی فرما رہی ہیں اور اظہر سے کہہ رہی ہیں کہ مدینہ والوں کے لئے بخشش بھیجی گئی ہے اور لوگوں نے اپنے

حصے لے لئے ہیں، تم بھی لے لو۔ اس عبارت کا ابتدائی حصہ مجھے یاد ہے اس طرح تھا "اُرسل لأھل المدینہ نول" باقی عبارت یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ جن لوگوں کے لئے بخشش بھیجی گئی ان میں فقراء کا بھی ذکر تھا۔

بظاہر تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اظہر کو ملازمت مل جائے گی لیکن یہ عارضی ہو گی۔ (ہوا بھی یہی)

○ ۹،۱۰/۶/۱۳۹۸ھ ـــ ۱۶،۱۷/۵/۱۹۷۸ء، مکہ مکرمہ

منگل اور بدھ کی درمیانی شب میں خواب دیکھا کہ زمزم کنویں میں نہیں ہے بلکہ کسی ایک گڑھے میں ہے جیسے کہ جنگل میں ہوتے ہیں جن کی کوئی منڈیر بنی ہوئی نہیں ہوتی اور پانی زمین کی سطح تک آیا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف زمین کی جو قدرتی بلندی ہے اس پر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جن میں سے دو بخاریوں کو میں جانتا بھی ہوں۔ البتہ جس طرف سے پانی پر جانے کا رستہ ہے اس طرف کوئی نہیں۔ میں تنہا زمزم پر پہنچتا ہوں اور دونوں ہاتھوں سے چلو بنا کر آبِ زمزم پیتا ہوں اور جیسے ہی پی کر کھڑا ہوتا ہوں آبِ زمزم زمین میں بیٹھ جاتا ہے اور اس جگہ خانہ کعبہ کے پتھر کے رنگ کی کالی کالی چھوٹی بڑی چٹانیں رہ جاتی ہیں اور پانی چٹانوں کے نیچے غائب ہو جاتا ہے۔ ان چٹانوں کے نیچے میرے بازوؤں کی موٹائی کے برابر رسے پڑے ہیں جن کے سرے دونوں جانب نکلے ہوئے ہیں۔ لوگ ان میں سے ایک ایک رسے کے سرے کو پکڑ کر کھینچتے ہیں تاکہ چٹانیں سرکیں اور پانی ظاہر ہو جائے۔ انہوں نے ایک رسہ کھینچا تو چٹانین آڑڑ کی آواز سے کچھ سرکیں، پھر دوسرا سرا کھینچا جو اس سے نچلی تہہ میں پڑا ہوا تھا اور چٹانیں کچھ سرکیں، پھر تیسرا رسہ کھینچا جو اس سے بھی نچلی سطح میں تھا، چٹانیں کچھ سرکیں، لیکن پانی ظاہر نہ ہوا۔ اس کے بعد میں اس طرف کو چلا جس طرف سے چاہ زمزم سے واقعتہً خانہ کعبہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے جس میں نماز کے لئے صفیں بچھی ہوئی ہیں اور خال خال لوگ کہیں کہیں نماز پڑھ رہے ہیں۔

میں نے دائیں جانب کے بالکل آخری کونہ میں ایک صف پر نماز کے لئے نیت باندھ لی اور سب کی طرح میرا منہ بھی اسی سمت ہے جس طرف زمزم ہے، گویا قبلہ اسی سمت ہے۔اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

○ ۹/۸/۱۳۹۸ھ .... ۱۴/۷/۱۹۷۸ء مدینہ منورہ

آج بروز جمعہ بعد نماز فجر ریاض الجنتہ میں اشراق کے وقت تک بیٹھا رہا۔ مراقبہ کی حالت میں دیکھا کہ فروخت کرنے کے لئے کھجور یا کھانے کی کسی اور چیز کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔میں نے بھی وہ چیز نصف کلو یا ایک کلو خریدی اور غسان ہوٹل کی طرف چلا جس میں ہمارا قیام تھا۔ دوکاندار ایک عرب بدو تھا، وہ ڈھیر کو چھوڑ کر میرے پیچھے غسان ہوٹل آیا اور کہا: اس ڈھیر میں ایک پارس پتھر بھی ملا تھا اور جس خریدار کے حصہ میں بھی یہ آجاتا، یہ اسی کے لئے تھا۔آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ یہ آپ کے حصہ میں آگیا، مبارک ہو۔ پھر اس نے اس میں سے وہ پارس پتھر نکالا اور قریب پڑے ہوئے ایک چوڑے سے سفید سنگ مرمر کے ٹکڑے پر پھیر کر دکھایا تو اس پر ایک سنہری لکیر بن گئی۔

○ ۱۳۹۹ھ میں مدینہ منورہ میں یہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرہ میں تشریف فرما ہیں اور اس میں داخل ہونے والوں کی لائن لگی ہوئی ہے اور لوگ ایک ایک کرکے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ لائن میں میرا چودھواں نمبر ہے اور میرے بعد غالباً کوئی نہیں۔

○ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ذی الحجہ ۹۹ھ میں خیال ہوتا ہے کہ یہ خواب دیکھا کہ ایک کمرہ ہے میں اس کے باہر ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کمرہ میں لے گئے ہیں، میں آپؐ کے سامنے بیٹھا ہوں اور آپؐ مجھ سے باتیں فرما رہے ہیں۔

○ ۱۳ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ .... ۲۲۔اکتوبر ۱۹۸۰ء مکہ معظمہ

الحمدللہ اس سال بھی مع وعیال، جو مکہ مکرمہ اور جدہ میں ہیں، حج کی سعادت

حاصل ہوئی ۔ حج پر جانے سے غالباً ایک روز قبل خواب دیکھا کہ غالباً تین چار پائیاں یا تخت بچھے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر کئی کئی صحابہ کرامؓ سوئے سوئے ہیں ۔ اس طرح گڈمڈ کہ بعض کے جسم کے کچھ حصے بعض کے اوپر ہیں ۔ یہ صحابہ کرامؓ غالباً کسی جہاد سے واپس آئے ہیں اور تکان سے چور ہو کر سو رہے ہیں ۔ درمیان کی چارپائی پر بعض صحابہؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سوئے ہوئے ہیں لیکن میں پہچان نہ سکا کہ ان میں سے حضورؐ کون ہیں ۔

○ حج سے ابھی مکمل فراغت بھی نہ ہوئی تھی کہ ۱۱ اور ۱۲ ذی الحجہ کی درمیانی رات میں خواب دیکھا کہ میں منیٰ میں کسی طرف جارہا ہوں ۔ ایک دیوار پر دیکھا کہ " غارِ مرسلات " لکھا ہے اور ساتھ ہی تیر بھی بنا ہوا ہے کہ غارِ مرسلات اس طرف ہے ۔ (واضح رہے کہ منیٰ میں واقعتہً ایک غار ہے جو " غارِ مرسلات " کہلاتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس غار میں تشریف فرما تھے کہ وہیں پر سورۃ مرسلات نازل ہوئی) ۔ چنانچہ میں تیر کے اشارہ کے مطابق سڑک کے دوسری جانب جاتا ہوں اور وہاں دیکھتا ہوں کہ ایک نیلے رنگ کے بہت بڑے پتھر کی قدرتی شکل کسی جانور کی سی ہے ، اس کے نیچے ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی ہے ۔ میں پانی کے اوپر کے میل کیچڑ اور کائی کو ہاتھ سے ہٹاتا ہوں تاکہ اس میں سے پانی پی سکوں ۔ اتنے میں آنکھ کھل جاتی ہے ۔ خیال نہیں کہ پانی پیا یا نہیں ۔

○ ۷/۴/۱۴۰۱ھ ... ۱۱/۲/۱۹۸۱ء بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب

خواب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے چند احباب کے ساتھ جمعرات کو گیارہ بجے مدینہ منورہ کا پروگرام بنایا ہے ۔ خواب دیکھا جس کے ابتدائی حصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سے میری لڑائی ہوئی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ مسلمان سے لڑنا تو حرام ہے پھر اس حرام کا مرتکب ہونے کے بعد کیا پریشانی کے بغیر میں مدینہ منورہ پہنچ سکوں گا ؟ یہ سوچ کر میں اس سے گلے مل لیتا ہوں لیکن جس سے گلے ملا وہ کوئی اور

شخص تھا۔ خواب کا آخری حصہ یہ ہے کہ میرے ساتھ ایک شخص اور ہے۔ ہم دونوں ایک سبزہ زار میں پہنچے جو غالباً جنت کا باغ تھا اور گویا ہمارا ارادہ یہ ہے کہ جنت یا اعراف میں پہنچ کر کھانا کھائیں۔ جب ہم جنت کی حدود میں داخل ہوئے تو دو شیطان ہمارے پیچھے لگ گئے اور ہمیں وہاں جانے سے روکنا چاہا۔ ہم دونوں ان کی طرف ہتھیلی سے اس طرح اشارہ کرتے جاتے تھے جیسے کسی کو روکنے کے لئے اشارہ کرتے ہیں اور اشارہ کے ساتھ ہی "تبت یدا" اور زیادہ تر صرف "تبت" کہتے جاتے تھے اور شیطان ہمارے قریب نہ پہنچ پاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب اس ہوٹل کی حد شروع ہوئی جس کے بارے میں خیال ہے کہ "اعراف" ہے تو ان میں سے ایک شیطان ہاتھ میں بڑا سا کھانا پکانے کا چمچ لئے ہماری جانب بڑھا لیکن جب ہم دوسری منزل پر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگے تو اس نے چمچ ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیا جہاں اس طرح کے چمچوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہم اوپر پہنچ کر کرسیاں کھینچ کر ایک میز کے گرد کھانا کھانے لگے اور نیند کھل گئی۔

○ ۱۹۸۱/۴/۲۔ گذشتہ ہفتہ کسی روز خواب دیکھا کہ میں جنت کے دوسرے طبقہ میں کسی کو تلاش کر رہا ہوں۔ حدِ نظر تک سیمنٹ کا پختہ اور چکنا فرش ہے۔ دور دور گروپ کی شکل میں مسہریاں بچھی ہوئی ہیں۔ اس سے اوپر تیسرا طبقہ ہے اور اس پر اس طرح کے پل بنے ہوئے ہیں جیسے کہ منیٰ میں ہیں۔ اس تلاش کرنے میں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں۔

○ ۱۱/۵/۱۴۰۵ھ.....۱/۲/۱۹۸۵۔ مکہ مکرمہ، بروز جمعہ

آج فجر کی نماز حرم میں پڑھی اور گھر آکر سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ خانہ۔ کعبہ کے اندر داخل ہوا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ مدینہ۔ منورہ والے صوفی نور محمد صاحب بھی موجود ہیں اور وہ ایک کمرہ جیسی جگہ میں، جو خانہ۔ کعبہ کے اندر بنی ہوئی ہے، بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد اپنے کو روضہ اقدس کے پاس دیکھا۔

○ ۱۲۔شوال ۱۴۰۷ھ ....۸۔جون ۱۹۸۷ء

الحمدللہ اس سال رمضان کے آخری عشرہ میں مدینہ منورہ میں اعتکاف کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۲۰۔رمضان کو ڈاکٹر گاندھی صاحب، محمد حسین کاپڑیا صاحب اور یونس صاحب کو لے کر اپنی گاڑی سے مدینہ منورہ پہنچا۔سب نے سامان ہارون صاحب کے مکان پر رکھا اور مغرب سے قبل مسجد نبوی میں پہنچ گئے۔

الحمدللہ بہت اچھا وقت گزرا۔اس سے قبل اسی رمضان کے پہلے ہفتہ میں جب اکرم صاحب کے ساتھ مدینہ منورہ آیا تھا تو دو دعائیں کی تھیں۔ایک یہ کہ اس سال مسجد نبوی میں اعتکاف کی توفیق مل جائے، دوسرے یہ کہ عقد کی تجدید ہو جائے اللہ کا شکر ہے دونوں دعائیں قبول ہو گئیں۔

اعتکاف کے پہلے روز ہی عصر کے بعد لیٹا تھا، آنکھ لگ گئی۔دیکھا کہ میں اور مولانا اشرف علی تھانوی ایک کمرہ میں ہیں۔حضرت نے فرمایا تم اصول کے خلاف آئے ہو (یعنی پہلے سے اجازت وغیرہ کی تکمیل نہیں کی جیسا کہ حضرت کے یہاں دستور تھا) لیکن خیر۔پھر ایک فارم پر کیا اور اس پر میرے دستخط لئے اور فرمایا وہاں آجانا (یعنی جہاں حضرت کی خانقاہ ہے) لیکن ضوابط کی پابندی کرنا (اور وہ فارم گویا ضوابط کی پابندی ہی کے لئے بھروایا تھا)۔اس کے بعد فرمایا: میں تمہیں دو نصیحتیں کرتا ہوں۔چنانچہ نہایت جامع جملوں میں دو نصیحتیں فرمائیں جو یاد نہیں رہیں۔میں لیٹا ہوا تھا اور حضرت بیٹھے تھے۔مجھے حضرت نے نسبت دی جس کی قوت جسم میں محسوس ہوئی اور میں بہت قوت کے ساتھ پرواز کے لئے بلند ہوا گویا چھت پھاڑ کر نکل جاؤں گا لیکن فوراً ہی حضرت نے نزول کی نسبت دی اور میں بدستور زمین پر آگیا۔محسوس ہوا کہ وہ حضرت ام سلمہؓ کا کمرہ ہے۔بیدار ہونے پر فارم پر دستخط کرنے کی تعبیر یہ ذہن میں آئی کہ یہ تجدید عقد کی طرف اشارہ ہے۔الحمدللہ عقد کی تجدید ہو گئی۔

اسی اعتکاف میں میں نے تمباکو کے ساتھ پان کھانے کی عادت ترک کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ بدبو سے نفرت ہے اس لئے آپ ہی کے طفیل میں مجھے اس مکروہ عادت سے نجات ملی (افسوس کہ چار سال تک چھوڑے رکھنے کے بعد میں پھر سے پان کھانے لگا اور ترک کرنے اور پھر سے کھانے کا سلسلہ اب تک جاری ہے ان دنوں پھر ترک کر رکھا ہے)۔

○ ۲۳۔ رمضان ۱۴۰۷ھ بعد نماز جمعہ اعتکاف کی حالت میں مسجد نبوی میں سو رہا تھا کہ دیکھا افتخار صاحب پر غصہ ہوتا ہوا کسی کمرہ میں ہوں اور ایک بستر پر پہنچ کر اس پر بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہوں ۔ فوم کا گدہ تھا اور اس پر چادر تھی، محسوس ہوا کہ یہ بستر ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔

○ ۱۳۔ شوال ۱۴۰۷ھ ... ۹۔ جون ۱۹۸۷ء۔ بروز سہ شنبہ

رات کو خواب دیکھا کہ ایک وسیع مسجد میں صحابہ کرامؓ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں متفرق طور پر بیٹھے ہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے اور صحابہ کرامؓ آپؐ کے ایصال ثواب کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں۔

○ ۱۷۔ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ ... ۱۴۔۱۱ جولائی ۱۹۸۷ء۔

پیر اور منگل کی درمیانی شب میں خواب دیکھا کہ میں احرام کی حالت میں ہوں ایک دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھنا چاہتا ہوں کہ میرے پیچھے سے ایک صاحب اسی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے مڑ کر دیکھا تو وہ علامہ سعد الدین تفتازانی تھے، وہ بھی احرام میں تھے، بدن بھاری تھا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ شافعی ہیں یا حنفی؟ فرمایا شافعی ۔ اس کے بعد میں نے ان سے بعض فقہی مسائل بھی دریافت کئے یاد نہیں کہ جواب دیا یا نہیں ۔ وہ مسائل بھی یاد نہیں۔

○ ۲/۴/۱۴۰۹ھ ... ۱۷/۹/۱۹۸۸ء۔

جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ فلاں مقام کہاں ہے ۔ آپؐ نے فرمایا: قریب ہی مکہ کے اطراف میں

ہے۔عائشہ کو جب عذر ہوا تھا تو وہیں بھیجا تھا اور عذر دور ہو گیا تو بلا لیا۔

نیند کھلی تو دو بج رہے تھے۔ بڑی دیر تک خواب کا کیف رہا کیونکہ مدتوں بعد حضورؐ کی زیارت ہوئی۔

اس کے بعد پوری رات قبرستان اور قبروں کے کتبے ہی دیکھتا رہا۔

○ ۲۹۔جمادی الآخرہ ۱۴۱۰ھ ....۲۶۔جنوری ۱۹۹۰ء، بروز جمعہ، مدینہ منورہ

جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ کی موسم سرما کی پندرہ روزہ تعطیلات میں گذشتہ جمعہ سے مع اہلیہ کے مدینہ منورہ آیا ہوا تھا، مغرب کے بعد مواجہہ شریفہ میں حشمت علی صاحب کے بائیں جانب پہلی صف میں روضہ اقدس کی جانب منہ کئے مشارب میں سے لطیفۂ اخفیٰ کا مراقبہ کر رہا تھا (شان جامع کا)۔میں نے دیکھا کہ میرے گلے میں ایک ہار ڈالا گیا اور اس کے آخری سرے پر جو فم معدہ تک ہے، متوسط درجے کا لاکٹ ہے جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔اس کے بعد دیکھا کہ روضہ اقدس کی مبارک جالیوں سے دو ہتھیلیاں اس طرح ملی ہوئی برآمد ہوئیں جس طرح دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر کسی کو کوئی چیز پیش کرنے کے لئے ملی ہوتی ہیں اور ان کے درمیان ایک چھوٹا سا بٹوہ تھا، ایسا جیسا عورتیں ریز گاری کے لئے رکھتی ہیں اور جس کے دونوں لبوں کے درمیان میں گھنڈیاں ہوتی ہیں کہ بند کرنے پر ایک کھٹکے سے دونوں گھنڈیاں ایک دوسرے کے دائیں بائیں سے گزر جاتی ہیں اور بٹوہ بند ہو جاتا ہے۔بٹوہ کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی تہہ میں کچھ ریز گاری بھی تھی۔

خیال ہوا کہ یہ ہتھیلیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی ہیں۔میں نے بحیثیت مجموعی اتنی خوبصورت، اتنی سڈول اور اتنی پر گوشت ہتھیلیاں اور انگلیاں اپنی زندگی میں نہیں دیکھیں۔

اس کے بعد دائرہ ولایتِ صغریٰ کا مراقبہ کر رہا تھا تو محسوس ہوا کہ قلب میں گویا ایک چھوٹا سا گڑھا ہے اور اس میں ایک ایک کر کے ریال کے سکے گرتے جا رہے

ہیں ۔ پھر یہ بھی محسوس ہوا کہ ایک مونگیا رنگ کی قدرے بڑی تھیلی ریالوں سے بھر گئی ہے اور کافی وزنی ہے ۔

چونکہ اس سال مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں خدانخواستہ میری ملازمت ختم نہ ہو جائے اس لئے اس کی بقا کے لئے دعائیں کر رہا ہوں ۔ کیونکہ اس وقت تک میں نے کچھ پس انداز نہیں کیا حتیٰ کہ آج تک مجھ پر زکوۃ بھی واجب نہیں ہوئی ۔ مدینہ منورہ میں میں نے دعاؤں کے ساتھ ساتھ وہ نمازیں بھی پڑھی ہیں جو قضائے حاجت کے لئے احادیث میں وارد ہوئی ہیں اور جو "الترغیب والترھیب" (۱/ ۴۷۶ ۔ ۴۷۸) میں موجود ہیں ۔

شاید مراقبہ کی مذکورہ کیفیات ملازمت ہی سے متعلق ہوں اور شاید بٹوہ کا منہ کھلا ہونا اس طرف اشارہ ہو کہ ہنوز موجودہ رزق بند نہیں ہوا ۔ واللہ اعلم

عشاء کے بعد مسجد نبوی سے واپس ہوٹل آتے ہوئے میں نے حافظ ابن کثیر کی "شمائل الرسول" ۲۵ ریال میں خریدی ۔ اس میں ص ۳۸ پر دیکھا ۔ کان علیہ السلام "ششن الکفین" و فی روایۃ "ضخم الکفین والقدمین" کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں ہتھیلیاں اور دونوں قدم موٹے اور پر گوشت تھے ۔

میں نے بحمد اللہ حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ، خلفائے اربعہؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت کو خواب میں دیکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو مختلف حالتوں میں متعدد بار خواب میں دیکھا ہے ۔ لیکن مراقبہ میں دستِ مبارک کی زیارت کا یہ پہلا موقع ہے اور اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنے کے بارے میں یہ تو یقینی ہے کہ نہیں دیکھا، لیکن خواب میں جو صورت پیش آئی ہے اس کے مطابق یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ نہیں دیکھا ۔ ان تمام خوابوں کی تفصیلات اپنے اپنے مواقع پر تاریخ وار لکھی ہوئی ہیں ۔

بعض محدثین کے نزدیک جن میں ابن سیرین بھی شامل ہیں خواب میں رویت رسول ؐ کا اعتبار اس وقت ہے جبکہ آپ کو اسی صورت پر دیکھا جائے جو احادیث اور

شمائل کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔

میں اپنی اور روایتوں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن دستِ مبارک کی یہ رویت بالکل کتب شمائل و حدیث کے مطابق ہے۔ اسی لئے جب بھی اس کا تصور آتا ہے بدن میں جھرجھری اور طبیعت میں سرشاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فللہ الحمد

○ ۲۶۔ شعبان ۱۴۲۰ھ .... ۱۳۔ مارچ ۱۹۹۰ء

صبح تقریباً چار بجے نیند کھلی تو یہ خواب دیکھ رہا تھا۔

امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی۔ شاید مجھے ان سے کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے سوچا تھا کہ آپ کی زیارت ہو گی تو آپ کی پیشانی کا بوسہ لوں گا یا آپ سے معانقہ کروں گا۔ فرمایا: دونوں کر لو۔ چنانچہ میں نے پہلے پیشانی کا بوسہ لیا، پھر تین بار دائیں، بائیں معانقہ کیا اور معانقہ میں جب دل باہم مقابل ہوئے تو محسوس ہوا کہ گویا میں ان کے دل سے فیض لے رہا ہوں۔ امام محمد کرتہ اتارے ہوئے تھے اور میرے والد کی شکل میں تھے۔

○ ۶۔ شوال ۱۴۱۰ھ .... مطابق یکم مئی ۱۹۹۰ء۔ مکہ مکرمہ

اس مرتبہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ڈاکٹر گاندھی صاحب اور محمد حسین کاپڑیا صاحب کی معیت میں مدینہ منورہ میں اعتکاف کرنے کی دوبارہ سعادت نصیب ہوئی۔ تین سال قبل بھی انہی حضرات کے ساتھ یہ سعادت حاصل ہوئی تھی۔

مکہ مکرمہ میں میرے ایک پڑوسی ہیں ڈاکٹر اسرار صاحب جو کچھ روز افغان مجاہدین کے ہسپتال میں مفت خدمت انجام دے چکے ہیں۔ ان کی بیوی بھی ڈاکٹر ہیں اب ڈاکٹر صاحب سعودیہ کی ملازمت از خود ترک کر کے جا رہے ہیں۔ پشاور میں کرایہ پر مکان لے کر رہیں گے اور دونوں میاں بیوی افغانیوں کے علاج کے لئے اپنے کو وقف کر دیں گے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے آٹھ روز مدینہ منورہ میں گزارے اور ان میں سے رمضان کے دنوں میں اعتکاف بھی کیا۔ آج عصر کے بعد ڈاکٹر صاحب میرے پاس

تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے عید کی رات کو مدینہ منورہ میں خواب دیکھا کہ آپ سبز پگڑی باندھے ہوئے ہیں ۔ میں نے کہا کہ کیا آپ بھی نورانی میاں کے گروپ کے ہو گئے تو آپ نے جواب دیا کہ نہیں یہ پگڑی تو مجھے یہاں سے ملی ہے ۔ یہ سن کر میرے آنسو جاری ہو گئے ۔

○ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے ۔ اور تقریباً ایک ہاتھ اونچا ایک چبوترہ ہے جس پر چاروں طرف ریلنگ لگی ہوئی ہے ۔ اس چبوترہ پر رام اور کرشن ننگی تلواریں لئے خوشی میں رقص کر رہے ہیں ۔ میں خواب ہی میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسول ہیں اور رام اور کرشن بھی پیغمبر ہیں تو دونوں حضورؐ کے ان کے پاس پہنچنے پر خوشی منا رہے ہیں ۔

○ خواب دیکھا کہ دو وزیروں کا تقرر زیرِ غور ہے (غالباً پاکستان میں) ۔ ایک چھوٹے درجہ کا اور دوسرا بڑے درجہ کا وزیر جیسے صوبائی اور مرکزی وزیر یا مرکزی وزیر اور وزیر اعظم ۔ چھوٹی وزارت کے لئے دو تین نام ہیں جن میں میرا نام نہیں ہے ۔ حضرت شاہ زوار حسین صاحب مرحوم ان وزراء کے تقرر کی منظوری کے لئے ایک کمرہ میں جاتے ہیں جس میں غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور واپس آکر فرماتے ہیں کہ چھوٹی وزارت کے لئے محمد مظہر بقا کا تقرر ہوا ہے ۔ بڑی وزارت کا کوئی ذکر نہیں کیا

○ ۸ / ۴ / ۱۴۱۴ھ ... ۲۴ / ۹ / ۱۹۹۳ء جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب

رات بھر عجیب عجیب خواب ہی دیکھتا رہا ۔ دیکھا کہ کسی اہم شخص کا انتقال ہو گیا ہے ، جس کی دینی اہمیت تھی ۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی تالاب ہے ، یا کوئی پانی جو دریا کے کنارے دور تک سیلاب کی وجہ سے جمع ہو جایا کرتا ہے ۔ اس میں کنارے سے کافی فاصلہ پر پانی میں ایک تخت بچھا ہے جس پر بیٹھ کر میں لکھتا پڑھتا ہوں اور نماز کے لئے کنارے پر بنی ہوئی مسجد میں آتا ہوں ۔ دیکھا کہ نماز پڑھ کر واپس تخت پر جا رہا ہوں کہ

ایک نو دس سال کا بچہ مجھ سے دریافت کرتا ہے کہ آپ پانی پر چل کر تخت تک کیسے چلے جاتے ہیں ؟ میں جواب دیتا ہوں کہ یہ کیا مشکل کام ہے میں تمہیں اسم اعظم بتائے دیتا ہوں، تم بھی اسے پڑھ کر پانی پر چل سکتے ہو۔ پھر سوچتا ہوں کہ بچے کو اسم اعظم نہیں بتانا چاہیئے۔اس کے بعد خواب ہی میں اپنی والدہ کی قبر دیکھتا ہوں۔ دو قبریں ہیں اور دونوں والدہ مرحومہ ہی کی ہیں، ایک میں چہرہ کفن سے ڈھکا ہوا ہے، دوسری میں چہرہ کھلا ہے اور اتنا تازہ ہے کہ انگوٹھا گڑانے سے گال کا گوشت دب جاتا ہے۔

جمعہ کو فجر کی نماز پڑھ کر سو گیا تو پھر والدہ کو قبر میں اس طرح دیکھا کہ چہرہ کفن سے کھلا ہے اور جب میں قریب سے گزرنے لگا تو انہوں نے پلکیں اس طرح تھوڑی سی پٹپٹائیں جیسے مجھے دیکھنا چاہتی ہوں۔

○ ۲۴/ ۴/ ۱۴۱۳ھ ....۸/ ۱۰/ ۱۹۹۳ء جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب

خواب دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت اور قوی گھوڑے پر ایک سوار قدرے تیزی سے جا رہا تھا۔امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے اسے ٹوکا تو وہ فوراً گھوڑا روک کر اترا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔سوار لانبے قد کا ایک جوان تھا جو چہرے کی ساخت اور ڈاڑھی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چینی ترکستان کا ہو۔چونکہ میری نظر سامنے سوار اور گھوڑے پر تھی اس لئے میں امام مالک کو نہ دیکھ سکا جو میرے بائیں جانب تھے۔

○ ۲۸/ ۴/ ۱۴۱۴ھ .... ۱۴/ ۱۰/ ۱۹۹۳ء بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب

خواب میں امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا اور ان سے کسی حدیث کے بارے میں جو انہوں نے امام ابو حنفیہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کی ہے یا کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا تو امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ جب تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔میں نے عرض کیا کہ اس لئے کہ دوسرے مجھ سے دریافت کریں تو یہ کہہ سکوں کہ خود صاحب مذہب نے مجھے یہ بتایا ہے اور یہ کہتے ہوئے میرے آنسو نکل آئے۔

○ ۳۰۔ذی القعدہ ۱۴۰۳ھ ... ۱۴۔ مئی ۱۹۹۳ء بروز جمعہ

فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد سو گیا۔ شاید نو دس بجے دن کا وقت ہو گا کہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک گول دائرے میں لوگ کھڑے ہیں اور بیچ میں جگہ خالی ہے۔ اس سے متصل ہی دوسرے دائرے میں اس سے زیادہ لوگ کھڑے ہیں اور درمیان میں اس سے زیادہ جگہ خالی ہے جتنی پہلے دائرے کے درمیان تھی اور یہ جگہ پختہ سیمنٹ کی ہے بخلاف پہلے دائرہ کی درمیانی جگہ کے جو کچی تھی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہ سے پہلے دائرہ کے درمیان لیٹ جانے کے لئے کہا گیا، (غالباً وہ لیٹ گئیں) پھر دوسرے دائرہ کے وسط میں لیٹ جانے کے لئے کہا گیا، اور شاید یہ کسی سزا کے طور پر ہو رہا ہے۔ وہ اس میں لیٹنے جا رہی ہیں کہ اتنے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ مکرمہ کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور پھر کوئی حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے۔

ایک مرتبہ ایک قبر دیکھی، خیال ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے۔ قبر شریف کے پاس ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ العالیٰ کو دیکھا کہ وہ اس کے مجاور ہیں۔

میری مالی حالت

دسمبر ۱۹۴۲ء سے جب کہ میں نے ملازمت کی ابتداء کی اب تک (اگست ۱۹۹۴ء) جس میں سولہ سالہ سعودیہ کی ملازمت بھی شامل ہے، الحمدللہ میں نے لاکھوں روپئے کمائے۔ ان دنوں جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں (اگست ۱۹۹۴ء) میں سعودیہ میں جو کما رہا ہوں اسے پاکستانی سکہ میں تبدیل کیا جائے تو ایک لاکھ، تین ہزار روپے ماہوار سے زیادہ کا اوسط پڑ رہا ہے۔ آمدورفت کے سالانہ چار ٹکٹ اور مفت علاج اس کے علاوہ ہے لیکن جب میں ۱۹۹۱ء سے پہلے کسی سے کہتا تھا کہ مجھ پر زکوۃ واجب نہیں تو اپنی اولاد کے سوا ہر شخص کو تعجب ہوتا تھا۔

سب سے پہلے مجھ پر ۱۹۹۱ء میں زکوۃ واجب ہوئی، وہ بھی اس طرح کہ میں تنخواہ میں سے آٹھ ہزار ریال انڈیا بھیجنے والا تھا کہ ایک صاحب کو ناگہانی آفت پیش آگئی اور میں نے یہ رقم انہیں قرض دے دی۔ انہوں نے بالاقساط چھ ہزار ریال واپس کر دیئے اور مجھے یہ کہ پورا قرض ادا ہو گیا۔ جب ایک سال گذر گیا تو میں نے ان سے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں اب تک یہ اہتمام کیا تھا کہ مجھ پر زکوۃ واجب نہ ہو، آپ نے میرا یہ اصول تڑوا دیا۔ پوچھنے لگے کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ آپ پر دو ہزار ریال باقی ہیں اور سال پورا ہو جانے کی وجہ سے مجھ پر زکوۃ واجب ہو گئی۔ افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اس طرح زندگی میں پہلی بار مجھ پر زکوۃ واجب ہوئی۔ اس کے بعد ۹۲ء اور ۹۳ء میں بھی زکوۃ دی اور اب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ باقی ماندہ زندگی میں بھی مجھ پر زکوۃ واجب ہی رہے گی، اس لئے کہ اب تمنا یہ ہے کہ میرے پاس اتنا مال ہونا چاہیئے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں، اولاد کی معاونت کے بغیر، مکہ مکرمہ میں رہائش کے مصارف برداشت کر سکوں۔

قرض فنڈ اور امداد

قرض فنڈ

اپنی حیثیت سے زیادہ صرف کرنے کی دائمی عادت نے مجھے ہمیشہ مقروض رکھا، حتیٰ کہ ایک وقت یہ نوبت بھی آئی کہ دارالعلوم نانک واڑہ میں پہلی تاریخ کو تنخواہ ملی تو پوری تنخواہ قرض میں ادا کر دی (پھر بھی قرض ادا نہ ہوا) اور مفتی ولی حسن صاحب سے دس روپے قرض لے کر گھر آیا کہ بھنگی بھشتی کو تو تنخواہ دینی تھی۔

قرض لینے اور مجبوری کی وجہ سے وقت پر ادا نہ کرنے میں جو ذلت ہوتی ہے اس کا مجھے پوری طرح احساس ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جب مجھے صاحب حیثیت بنایا تو میں نے سرونج (انڈیا) میں قرض فنڈ کے نام سے اعزہ کے لئے ایک وقف قائم کیا کہ ضرورت کے وقت اعزہ اس سے قرض لیں اور بالاقساط ادا کرتے رہیں۔ قرض فنڈ سرونج میں اس لئے قائم کیا کہ میرے بیشتر اعزہ اب بھی وہیں ہیں۔ اس قرض کو میں نے پانچ ہزار روپے سے شروع کیا تھا جو اب ۵۰ ہزار روپے تک پہنچ چکا ہے اور میں ہر سال اس فنڈ میں دس ہزار روپے کا اضافہ کرتا رہتا ہوں۔

امداد

اللہ کا شکر ہے کہ میں اسی کی توفیق سے مساجد، مدارس اور غریبوں کی، جن میں بیشتر اعزہ ہیں، مستقل و غیر مستقل امداد بھی کرتا رہتا ہوں جس کا اوسط کئی ہزار روپے (پاکستانی) ماہوار ہے۔ اس کی تفصیل کا علم بیوی کے سوا کسی کو نہیں۔ اس کا ذکر میں اس کتاب میں محض آئندہ نسلوں کی ترغیب کے لئے کر رہا ہوں، کیونکہ عمر اور رزق میں برکت کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے اور میرا تجربہ بھی۔

جہادِ افغانستان

افغانستان کا اسلامی جہاد شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جہاد بالمال کی توفیق عطا فرمائی ۔ ایک مرتبہ خیال ہوا کہ اصل چیز تو جہاد بالنفس ہے کہ جنت میں جانے کا شہادت سے قریب تر اور کوئی راستہ نہیں ۔ لہذا کیوں نہ اس جہاد میں عملی طور پر شرکت کی جائے ۔

چنانچہ ۱۹۹۰ء میں موسم گرما کی دو ماہ کی تعطیلات میں جب کراچی پہنچا تو افغانستان جانے کا پروگرام بنالیا ۔

۱۶ ۔ جولائی ۱۹۹۰ء کو جامعہ فاروقیہ کراچی کے مولانا عادل خان صاحب کے ہمراہ جو حرکتہ الجہاد الاسلامی کے ناظم بھی ہیں، کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد کے لئے شام کے تقریباً چار بجے روانہ ہوا ۔ سوا چھ بجے کے قریب اسلام آباد پہنچے ۔ تنظیم کی گاڑی ایئرپورٹ سے تنظیم کے دفتر لے گئی جو اسلام آباد کے مضافات میں "بہارہ کہو" میں واقع ہے ۔ وہاں سے عشاء سے پہلے روانہ ہوئے ۔ کھانا راستہ میں کھایا ۔ تنظیم ہی کی گاڑی کے ذریعہ رات کو ساڑھے بارے بجے پشاور پہنچے اور مسجد درویش میں، جہاں تنظیم کا دفتر بھی ہے، صحن میں بستر بچھا کر سو گئے ۔

۱۷ ۔ جولائی ۔ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کیا اور آگے روانہ ہو گئے ۔ کوہاٹ اور مردان ہوتے ہوئے وزیرستان کے آخری شہر میران شاہ پہنچے ۔ ظہر کا وقت تھا ۔ وہاں نماز اور کھانے سے فراغت پا کر آگے روانہ ہو گئے اور عصر کے قریب اس جگہ پہنچے جہاں حرکتہ الجہاد الاسلامی کی دوسری دفاعی لائن ہے ۔ نئے لوگوں کو وہیں ٹھہرا کر مولانا عادل خان صاحب ایک صاحب کے ساتھ اگلے مورچوں کی طرف روانہ ہو گئے ۔

ہم نے رات کو یہ منظر دیکھا کہ افغان بمبار طیارے آتے اور بمباری کرتے

رہے ۔ مجاہدین کو کچھ دیکھنا ہوتا تو ٹارچ کی روشنی میں دیکھتے تھے ۔ بمبار طیاروں کی آمد کا صرف اتنا اثر ہوتا کہ ٹارچ نہ جلائی جاتی ۔ باقی کام حسبِ معمول ہوتے رہتے ، کیونکہ مجاہدین کے لئے یہ روزمرہ کا معمول تھا اور وہ اسے بچوں کے کھیل جیسا سمجھنے کے عادی ہو چکے تھے ۔

ہمارے اس دوسرے دفاعی کیمپ سے کچھ پہلے عربوں کا کیمپ تھا ۔ سعودیہ ، مصر ، کویت ، یمن ، سوڈان ، الجزائر وغیرہ تمام عرب ممالک کے مجاہدین ، زبان کے اشتراک کی وجہ سے ایک جگہ تھے ۔ اس محاذ (خوست) کے علاوہ دوسرے محاذوں پر بھی دوسری تنظیموں کے ساتھ عربوں کے کیمپ تھے اور جیسا کہ مشہور ہے کہ ، افغان مجاہدین کے بعد عرب مجاہدین جیسی شجاعت اور بے جگری سے لڑتے ہیں کسی دوسری جگہ کے مجاہدین نہیں لڑتے ۔ ان میں زیادہ تر تعداد سعودیوں کی تھی اور سعودیوں کے بعض بعض ارب پتی خاندانوں کے بیٹے بھی افغانستان کے مختلف محاذوں پر شہید ہو چکے ہیں ۔ خوست کے محاذ پر عربوں کے اگلے مورچے حرکتہ الجہاد کے اگلے مورچوں سے دو کلومیٹر کے فاصلہ پر دائیں جانب تھے ۔

ان عرب مجاہدین نے رات کو تقریباً ساڑھے بارے بجے ایک افغان چوکی پر حملہ کر دیا اور صبح تک فضا دونوں جانب کے گولوں اور بموں کی آواز سے گونجتی رہی ۔

۱۸ ۔ جولائی فجر کے بعد دو مہمان علماء نے جہاد کی فضیلت پر تقریریں کیں ۔ پھر دس منٹ کے لئے ہر ایک نے قرآن کریم کی تلاوت کی ۔ اس کے بعد ناشتہ ہوا (بغیر چائے کا) ۔

تھوڑی دیر میں اگلے مورچوں سے گاڑی آ گئی اور ہم اس کے ذریعہ تقریباً دو گھنٹے میں اس جگہ پہنچے جہاں تنظیم کی پہلی دفاعی لائن تھی ۔ یہ جگہ اگلے مورچوں سے تقریباً پندرہ سو گز کے فاصلہ پر تھی ۔ یہاں پہنچ کر کہا گیا کہ جن لوگوں کو رائفل چلانی نہیں آتی وہ کلاشنکوف (روسی رائفل جس سے بیک وقت تیس گولیوں کی باڑھ بھی ماری جا سکتی

ہے) چلانا سیکھ لیں۔ کیونکہ دشمن سے مڈبھیڑ کے اندیشہ کی وجہ سے اس مقام سے آگے بندوق کے بغیر نہیں جایا جاسکتا۔ میں نے اس کا طریقہ سیکھا اور تقریباً آٹھ دس فائر کئے۔ بندوق تو الحمد للہ مجھے بچپن سے چلانی آتی ہے اور حیدر آباد دکن کی فوجی ملازمت کے دوران رائفل چلانے کی مزید مشق ہو چکی ہے البتہ کلاشنکوف کا سسٹم یہاں سیکھا۔

اس کے بعد اگلے مورچوں کے لئے (مرغی قلعہ) روانہ ہوئے۔ دشمن کی گولیوں کی زد میں ہونے کی وجہ سے کھلے میدان میں سے جانا موت کو دعوت دینا تھا، اس لئے مجاہدین نے اس مقام سے اگلے مورچے تک ٹرنچ کھود رکھی تھی۔ اس پتلی سی ٹرنچ سے، جو قد آدم بھی نہ تھی، رائفل لٹکائے ہوئے جھکے جھکے روانہ ہوئے اور تقریباً بارہ سو گز کا فاصلہ اسی طرح طے کیا۔

عربوں کی جنگ اب تک جاری تھی۔ ہمارے کمانڈر نے کہا کہ کیا آپ لوگوں کو جنگ کا منظر دکھائیں؟ ہم نے جواب دیا کہ اور آئے کس لئے ہیں۔ غالباً کمانڈر یہ بھی چاہتا تھا کہ ہم بھی اس محاذ پر دشمن کو اپنی طرف متوجہ کر لیں تاکہ عربوں پر دباؤ کم ہو اور ان کی ہمت بھی بڑھے کہ ہم نے بھی محاذ کھول دیا ہے۔

سب لوگ مورچوں میں بیٹھ گئے اور کمانڈر کے حکم سے ایک مجاہد نے دشمن کی طرف کلاشنکوف سے کچھ فائر کر دیئے۔ اس کے جواب میں دشمن نے پورا فائر کھول دیا کلاشنکوف کی گولیاں ہمارے مورچوں پر اس طرح گرنے لگیں گویا ٹپاٹپ بیر ٹپک رہے ہوں۔ راکٹ لانچر، ٹینک اور مارٹر کے گولوں سے فضا گونج اٹھی۔ گرینائٹ اور ٹینک کے گولوں سے مورچہ لرز جاتا تھا، اور اس کی مٹی گرنے لگتی تھی۔ ایک بم ہمارے مورچہ کے دائیں جانب صرف اتنے سے فاصلہ پر گرا کہ دھول سے ہمارا مورچہ بھر گیا، تھوڑی دیر بعد اسی طرح کا بم بائیں جانب گرا اور مورچہ پھر دھول سے بھر گیا۔ اگر وہ ٹھیک ہمارے مورچہ پر گر جاتا تو یہ سطریں لکھنے کے لئے زندہ رہنے کے بجائے اس وقت میری روح جنت میں ہوتی۔

دشمن کے جواب میں ہماری پہلی دفاعی لائن سے بھی فائر کھول دیا گیا اور تقریباً سوا گھنٹے تک دونوں جانب سے دھواں دھار جنگ ہوتی رہی ۔ پھر ہمارے کمانڈر نے فائر بند کرنے کا حکم دے دیا اور اس کے تقریباً بیس منٹ بعد دشمن کا فائر بھی ہماری طرف بند ہو گیا۔ عربوں کے محاذ پر البتہ جنگ جاری رہی اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مورچہ عربوں نے فتح کر لیا۔ ان کے دو آدمی شہید اور سترہ زخمی ہوئے لیکن انہوں نے دشمن کے تقریباً پچاس آدمی مارے، سترہ زندہ گرفتار کئے، ایک ہیلی کو پٹر گرایا، اور مورچہ فتح ہونے پر بہت سا گولہ بارود اور اسلحہ ان کے ہاتھ آیا۔

ہمارے محاذ پر خاموشی ہو جانے کے بعد کمانڈر نے واپس چلنے کا حکم دیا، چنانچہ اسی ٹرنچ میں سے ہوتے ہوئے پہلی دفاعی لائن پر اور وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر دوسری دفاعی لائن واپس آگئے۔

پہلی اور دوسری دفاعی لائن کے درمیان گاڑی سے اوسطاً دو گھنٹے کا راستہ تھا لیکن راستہ نہ ہونے اور پتھروں پر سے جانے کی وجہ سے گاڑی آہستہ چلتی تھی ۔ یہاں آمدورفت کے لئے بنے ہوئے راستے نہ تھے ۔ ندی کے بہاؤ نے جو خاصا چوڑا کٹاؤ پیدا کر دیا ہے اور جس میں چشموں کا تھوڑا تھوڑا پانی بہتا رہتا ہے ۔ گاڑیاں اسی میں سے کیچڑ، پتھر اور ناہموار گزرگاہوں سے گزرتی ہیں ۔ یہ راستہ پیدل سے کم از کم چار گھنٹہ کا ہو گا۔

دوسری دفاعی لائن پر واپس آکر میں نے سوچا کہ ٹرنچ میں جھکے جھکے چلنا یہ تو معمولی مشقت تھی، جہاد میں تو دشمن پر حملہ کرنے کے لئے لیٹ کر کہنیوں کے بل گھسٹنا بھی پڑتا ہے اور دشمن حملہ کرے تو بھاگتے ہوئے پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے ۔ یہ کام میں کیسے کر سکوں گا۔ پھر اس مرتبہ تو محاذ پر جانے کے لئے گاڑی تھی، روزانہ تو گاڑی نہیں ملے گی، سارے مجاہدین پیدل ہی آتے جاتے ہیں تو میں روزانہ (صرف ایک طرف سے چار گھنٹے کیسے مارچ کر سکوں گا۔ پھر اگر میں یہاں، جیسا کہ ارادہ تھا، پندرہ روز یا زیادہ ٹھہرتا ہوں تو اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ دوسری دفاعی لائن پر پڑا پڑا مجاہدین کے ہاتھوں

کی روٹیاں توڑ تا رہوں۔ یہ سوچ کر میں نے اسی روز مولانا عادل خان صاحب کے ساتھ واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے مولانا عادل صاحب سے دریافت کیا کہ ایک مجاہد کو کراچی سے یہاں بھیجنے میں کتنا صرف ہوتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا، اتنا۔ میں نے انہیں پیسے دیئے اور کہا کہ پانچ مجاہدین کو آپ میری طرف سے یہاں جہاد کے لئے بھیج دیں۔ یہ رقم اس رقم کے علاوہ تھی جو میں نے پہلے سے امداد میں دینے کے لئے سوچ رکھی تھی۔

میرے چھوٹے لڑکے محمد اعظم بقانے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کیوں جہاد کے لئے جاتے ہیں۔ آپ سعودیہ میں کماتے ہوئے مجاہدین کی جتنی خدمت مال سے کر سکتے ہیں اپنی جان سے اتنی خدمت نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھے تو جہاد بالمال کے ساتھ ساتھ جہاد بالنفس بھی کرنا تھا۔ بہر حال میں اسی روز شام کو مولانا عادل صاحب کے ساتھ واپس آ گیا۔

۱۹۔ جولائی جس راستے گئے تھے اسی سے واپس ہوتے ہوئے رات کے پچھلے حصہ میں پشاور پہنچے۔ کوشش کی کہ یہیں سے ہوائی جہاز پر کراچی کے لئے سیٹ مل جائے لیکن ناکامی ہوئی۔ چنانچہ اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ میری واپسی کی سیٹ ریزرو نہ تھی کیونکہ میں وہاں غیر معین مدت کے لئے (کم از کم پندرہ روز) قیام کی نیت سے گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے بھی آج کوئی سیٹ نہیں، البتہ ایک صاحب کی سیٹ ریزرو ہے اور وہ نہیں جا رہے اگر دوسرا ٹکٹ خرید کر ان کے نام پر سفر کرو تو جا سکتے ہو، چنانچہ میں نے دوسرا ٹکٹ خریدا اور اسی روز رات کو کراچی پہنچ گیا۔ کراچی میں، میں نے اپنے پہلے ٹکٹ کے پیسے واپس لے لئے۔

بہر حال یہ سفر تمام ہوا اور اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے جہاد میں جسمانی طور پر شرکت کی سعادت سے بہرہ ور فرما دیا۔ فللہ الحمد۔

میرا افغانستان کا یہ سفر ایک یادگار سفر تھا، جو ایمان افروز مناظر یہاں مشاہدہ

میں آئے ہیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس نے مجاہدین کے ساتھ عملی طور پر جہاد میں شرکت نہیں کی وہ ان مناظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ٹیموں کی زندگی، روکھا سوکھا، وقت بے وقت کھانا، کاندھے پر بھری ہوئی رائفل، جسم پر وردی، وردی کی اوپری دونوں جیبوں میں دو میگزین (کل نوے کارتوس)، تپتی ہوئی دھوپ اور جان لیوا سردی اور برف میں پہاڑی راستوں پر میلوں کا پیدل سفر، سر اور ڈاڑھی کے بال مجذوبوں کی طرح بڑھے ہوئے کہ نہ کٹانے کی فرصت نہ سنوارنے کی، جہاد میں اس درجہ مشغولیت کہ ایک جماعت محاذ پر گئی تو دوسری واپس آئی، ستا کر دوسری گئی تو پہلی واپس آئی، اس طرح محاذ پر جانے آنے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، نمازوں کا اس درجہ اہتمام کہ جنگ کے دوران بھی ان کی جماعت فوت نہیں ہوتی۔ مسلسل جنگ ہو رہی ہو تو ۳۶،۳۶ گھنٹے تک جہاد میں مشغول رہنا، کہاں کا کھانا اور کیسا آرام، چنے چبا کر ہی چشمے کا پانی پی لیا۔ اور پھر بلا استثنا ہر شخص کے دل میں صرف ایک تمنا کہ کاش میں شہید ہو جاؤں۔

جس گاڑی میں ہم نے افغانستان کا سفر کیا تھا اس کے ڈرائیور نے واپسی پر بڑی حسرت سے کہا: کاش میرے ایک چھرا ہی لگ جاتا۔

افغانستان میں اس وقت افغان حکومت صرف شہروں تک محدود تھی۔ اوسطاً ۸۲ فیصد پہاڑی حصہ پر مجاہدین کا قبضہ تھا اور تمام شہروں کے اردگرد پہاڑوں پر سے مجاہدین نے اس طرح گھیرا ڈال رکھا تھا کہ بعض شہروں کا سڑک کے ذریعہ دوسرے شہروں سے رابطہ مجاہدین نے ختم کر دیا تھا اور انہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعہ ہتھیار اور غلہ وغیرہ پہنچایا جاتا تھا۔ انہی میں سے ایک "خوست" کا شہر بھی ہے۔ اسی محاذ پر میں گیا تھا اس شہر کا تقریباً بیس کلومیٹر مربع علاقہ حکومت کے پاس تھا اور چاروں طرف پہاڑوں پر مورچے تھے۔

شہروں میں حکومت کے پاس ہوائی اڈے بھی تھے، ہوائی جہاز بھی اور ٹینک

بھی اور روس کی طرف سے سامان جنگ کی وافر سپلائی بھی۔ مجاہدین کے پاس نہ ہوائی جہاز تھے اور نہ ٹینک اور نہ اتنے ہتھیار۔ امریکہ نے بھی امداد بند کر دی تھی۔ اس کے باوجود ان کے حوصلوں میں کمی نہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ زندہ رہنے کے لیے روکھا سوکھا کھانا ہمیں مل ہی جاتا ہے باقی رہے ہتھیار تو وہ ہمارے لیے روس کی فیکٹریوں میں تیار ہو رہے ہیں، ہم انہیں سے چھینتے اور انہی کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ وہ انتہائی پر امید تھے کہ ایک روز انشاء اللہ ان کا پورے افغانستان پر قبضہ ہو گا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس کا مقصود شہادت ہو اس کے حوصلے پست کیسے ہو سکتے ہیں۔

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اس وقت جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، اللہ کا شکر ہے کہ افغانستان کا جہاد کامیابی کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ مجاہدین کی باہمی جنگ اندرونی معاملہ ہے، انشاء اللہ ایک روز یہ کشمکش بھی ختم ہو جائے گی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔

باب ششتم

اولاد

اولاد

نجمہ خاتون:

(تاریخ پیدائش: ۱۵۔ مئی، ۱۹۴۵ء ... بمقام سرونج، (انڈیا)

نجمہ میری سب سے پہلی بچی ہے۔ جوانی میں مزاج تند ہوتا ہی ہے چنانچہ اپنی دوسری بہنوں کے مقابلے میں میرے مزاج کی سب سے زیادہ تیزی اسی نے برداشت کی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ کسی فیشن پر میں نے اس کی کسی دوسری بہن کو کچھ نہ کہا تو مجھے سنانے کے لئے اپنی ماں کو مخاطب کر کے کہتی بھی ہے: "وہ تو ساری سختی میرے ہی لئے رہ گئی تھی۔"

بیوی کے برعکس مجھے بچوں کے مقابلے میں بچیوں سے زیادہ محبت ہے۔ لیکن کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ محبت کے مقابلے میں اس بچی کی قدر میرے دل میں زیادہ ہے بڑی سمجھ دار ہے اور بڑے اچھے مشورے دیتی ہے۔ ماں پر اس کا اتنا اثر ہے کہ اگر وہ کوئی بات کہہ دے تو ان کے لئے پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے اور جب دونوں ماں بیٹیاں کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میرے لئے اس کے خلاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس نے اسلامیات میں ایم۔اے کیا اور گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کے لئے وظیفہ بھی ملا لیکن تکمیل نہ کر سکی۔

اس کی شادی ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔ شوہر کا نام عبدالرزاق ہے۔ نجمہ تین لڑکوں اور ایک لڑکی کی ماں ہے۔ فاروق احمد، صدیق احمد، زبیر احمد اور سعدیہ؛ جن کی پیدائش کی تاریخیں بالترتیب یہ ہیں:

۳۰/۱/۱۹۷۵ء، ۱۹/۷/۱۹۷۶ء، ۱۱/۴/۱۹۷۹ء، ۳/۹/۱۹۸۴ء۔

محمد اظہر بقا:

(تاریخ پیدائش: ۲۴۔دسمبر، ۱۹۴۹... بمقام حیدر آباد (دکن)، (انڈیا)

یوں تو میں نے تھوڑا بہت اپنے تمام لڑکوں کو مارا ہے لیکن سب سے بڑا لڑکا محمد اظہر بقا (مون) سب سے زیادہ زدوکوب کا نشانہ بنا۔ اپنے والد کی مار کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح مجھے نوازا ہے اسے بھی نوازے اور اسی کو کیا، اللہ تعالیٰ ساری اولاد کو دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے۔

اولاد کی عمر اور تعداد بڑھتی گئی اور میری قوت گھٹتی گئی تو زدوکوب میں بھی کمی آتی گئی۔ غالباً سب سے چھوٹے لڑکے محمد اعظم بقا نے ایک مرتبہ کوئی شرارت کی، بیوی کے خیال میں اسے سزا ملنی چاہیئے تھی لیکن میرا ہاتھ نہ اٹھا تو بولیں مار کے لئے بڑا بیٹا ہی رہ گیا تھا! میں نے جواب دیا: میرے والد نے جو مجھے مارا تھا اس کا پورا انتقام میں نے ایک بیٹے سے لے لیا، اوروں کو کیوں ماروں! پھر یہ کہ مارنے کا مزہ اس وقت ہے جب چوٹ اسے لگے جسے مارا جائے اور اب میرا یہ حال ہے کہ جسے ماروں اسے کم اور میرے ہاتھ میں زیادہ چوٹ لگتی ہے تو اپنے آپ کو کس جرم کی سزا دوں۔

اظہر بچپن میں مجھ سے بہت مانوس تھا۔ جب میں سب کو ہندوستان چھوڑ کر کراچی آگیا تو یہ اتنا مرجھایا کہ دیکھنے والے ترس کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ بیوی نے سنجیدگی سے یہ ارادہ کر لیا کہ اسے میرے پاس کراچی بھیج دیں تو بزرگوں نے سمجھایا کہ وہ ملازمت کرے گا یا اسے سنبھالے گا۔

اظہر بچپن میں شریر بھی بہت تھا۔ نوجوانی تک اس کا یہ عالم رہا کہ ایک مرتبہ کراچی یونیورسٹی میں امتحانات ہو رہے تھے۔ اس نے امتحان گاہ کی طرف جانا چاہا، چپراسی نے روکا تو اس کو اس زور سے پنچ مارا کہ اس کی مصنوعی بتیسی نکل پڑی۔ بھٹو صاحب کا دور تھا، شور مچ گیا کہ تدریسی عملے کے ایک لڑکے نے غیر تدریسی عملے کے

ایک چپراسی کو مار دیا۔ اس حادثے نے سیاسی نوعیت اختیار کر لی۔ دوسرے روز اظہر کو لے کر میں یونیورسٹی گیا، ڈاکٹر منظور الدین احمد کے کمرے میں کچھ اساتذہ کی موجودگی میں چپراسی کو بلایا اور کہا کہ یہ لڑکا موجود ہے، چاہو تو تم بھی اسے اسی طرح مارو چاہو تو معاف کر دو اور اگر اسے طبقہ واری مسئلہ بنانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ چپراسی نے جواب دیا: صاحب یہ بھی میرے بیٹے کے برابر ہے، میں نے معاف کیا۔ میں نے کہا اتنی آسانی سے معافی نہ ہو گی۔ جوتا اتارا اور ایک ہی رسید کیا تھا کہ دوسرے اساتذہ نے پکڑ لیا۔ اظہر واپس آ گیا۔

پروفیسر کے جوان بیٹے کی چپراسی تک کے سامنے یہ ذلت! میں نے سوچ لیا کہ شاید اب یہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا لیکن اس نے اتنا تو کیا کہ تین روز تک کھانا نہیں کھایا (گھر میں) لیکن گھر سے نہ گیا۔ اور اس کے بعد سے اس کی میرے دل میں وقعت بہت بڑھ گئی۔

تعلیم کی طرف سے لاپروائی کی وجہ سے ایک روز میں نے اس سے کہا: دیکھو، مشرقی دستور کے مطابق والدین اس وقت تک لڑکوں کا بار برداشت کرتے ہیں جب تک وہ پڑھتے رہیں۔ اگر تم پڑھنا نہیں چاہتے تو بہتر ہے کہ ملازمت کرو تاکہ تمہارے کھیل کود پر میرا جو پیسہ صرف ہوتا ہے وہ دوسروں کی تعلیم پر صرف ہو۔

میری یہ بات اس کے دل پر ایسی لگی کہ اس نے ملازمت کی ٹھان لی اور جب اس کی والدہ نے مجھے بتایا کہ وہ ملازمت کی تلاش کر رہا ہے تو میں نے اسے سمجھایا کہ جو کچھ کہا تھا اس کا مقصد ملازمت کی طرف نہیں بلکہ تعلیم کی طرف توجہ دلانا تھا۔ یہ تمہارا بی۔ کام۔ کا آخری سال ہے اسے مکمل کر لو، پھر چاہو تو ملازمت کر لینا۔ لیکن چوٹ زیادہ سخت لگی تھی اس لئے اس نے پھر بھی ملازمت کی کوشش کم نہ کی اور جب میں نے دیکھا کہ یہ باز آنے والا نہیں تو میں نے بھی اپنے وسائل سے اس کی کوشش کا ساتھ دیا، اس خیال سے کہ یہ آئندہ زندگی میں کہیں یہ نہ کہے کہ باپ نے تو کفالت

اسے جواب دے دیا تھا اس لئے مجھے از خود ملازمت کرنی پڑی ۔ فٹ بال کا چونکہ اچھا کھلاڑی تھا اس لئے اس ہنر کی بدولت نیشنل بنک میں ملازمت مل گئی ۔ ملازمت کے بعد اس نے بی ۔کام ۔کی تکمیل کی ۔

جب ہم پہلا حج کر کے واپس گئے تو بیوی نے کہا کہ ایک لڑکے کو سعودی عربیہ بھیج دیا جائے تاکہ ہمارے دوبارہ وہاں جانے کا سہارا ہو سکے ۔ اپنا تجربہ بھی یہی ہے اور دوسروں سے بھی یہی سنا ہے کہ یہاں کی اصل لگن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک با انسان حج یا عمرہ کر جائے ۔ چنانچہ اظہر کو ۸ ۔جولائی ۱۹۷۷ء کو عمرے کے ویزہ پر بھیج دیا گیا ۔ عمرے کے ویزے پر آنے والوں کے لئے ملازمت قانوناً منع ہو چکی تھی اس لئے اسے وقتاً فوقتاً عارضی کام ملتا رہا اور زیادہ عرصہ بے کار ہی گزرا ۔ میں جب ۱۹۷۸ء میں کانفرنس اور حج کے بعد واپس جانے لگا تو اظہر نے کہا: آپ چلئے میں بھی واپس آتا ہوں ، اب یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ حسن اتفاق سے مجھے سعودیہ میں ملازمت مل گئی ۔ جب میں ملازم ہو کر آگیا تو اظہر نے کہا کہ اب میں ملازمت کے بجائے کمپیوٹر کے کورس کے لئے امریکہ چلا جاؤں ۔ میں نے جواب دیا کہ جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے میں تمہیں امریکہ نہیں بھیج سکتا اور شادی کے بعد بھی اس شرط پر بھیج سکتا ہوں کہ تمہاری بیوی بھی تمہارے ساتھ جائے ۔ وہ خاموش ہو گیا اور پاکستان سے دوبارہ ویزا لے کر جدہ آیا اور ملازم ہو گیا ۔ اپنے خوابوں میں میں نے ذکر کیا ہے کہ جب میں نے حضور صلعم سے اظہر کی ملازمت کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ اسے بھی مل جائے گی ۔ اس توقف کا اثر یہ دیکھا کہ جب تک وہ پاکستان سے دوبارہ ویزا لے کر نہ آیا اسے ملازمت نہ ملی اور جب دوبارہ ویزا لے کر آیا تو میں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خواب میں دیکھا کہ اظہر کو مخاطب کر کے فرما رہی ہیں کہ "اس بستی والوں کے لئے کچھ عطیات آئے ہوئے ہیں ، کیا تم ان میں سے اپنا حصہ نہ لو گے ؟" اظہر کو یہاں دوبارہ پہنچنے کے چوتھے روز ہی ملازمت

مل گئی۔ اس نے یہاں تقریباً چار سال ملازمت کی۔ اتفاق سے جس کمپنی میں ملازم تھا وہ ختم ہو گئی۔ ام المومنین کے بقول وہ عطیہ ہی تو تھا جسے دوام نہیں ہوتا۔

اسی زمانے (۱۹۸۰ء) میں اس کی شادی اس کی ماموں زاد نصرت جہاں سے ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی بھی وزٹ ویزا کی معیاد ختم ہو جانے کی وجہ سے غیر قانونی طور پر جدہ میں مقیم تھی۔ اس کے اقامہ کے لئے اظہر نے اپنی سی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تو جانتا تھا کہ اسے یہاں رہنا ہی نہیں، اقامہ کی کیا ضرورت ہے۔

کمپنی سے ملازمت ختم ہو جانے کے بعد دوسری ملازمت تلاش کرنے لگا تو میں نے سوچا کہ کہیں اسے یہ خیال نہ آئے کہ جب میں نے پہلے امریکہ جانے کو کہا تھا تو والد نے شادی کی قید لگائی تھی۔ اب تو شادی بھی ہو چکی اور ان دنوں ملازمت بھی نہیں۔ اب والد کی زبان پر نہ آیا کہ امریکہ چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ اب اگر تم امریکہ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ اس نے تیاری شروع کر دی اور اگست ۱۹۸۲ء میں امریکہ چلا گیا۔ بعد میں اس کی بیوی بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ ان دنوں دونوں وہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کے بعد اس جنت نما جہنم سے جلد واپس لائے۔

ملازمت کے بعد، خصوصاً جدہ آنے کے بعد سے اظہر اتنا سعادت مند ہو گیا ہے کہ دوسرے دیکھیں تو انہیں مشکل سے یقین آئے کہ کبھی یہ شریر اور نافرمان بھی رہا ہو گا۔ اسی لئے مجھے بہت یاد آتا ہے۔

میں نے مون (اظہر) کو کمپیوٹر کے ڈگری کورس کے لئے امریکہ بھیجا تھا۔ پہلا سال تو اس نے تعلیم میں صرف کیا لیکن دوسرے سال سے پارٹ ٹائم ملازمت بھی کر لی اور اب تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے صرف ملازمت کر رہا ہے۔

ہر جگہ کی طرح یہاں بھی اس کے دوستوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ہم ۱۹۸۶ء میں امریکہ گئے اور تقریباً ڈھائی ماہ اس کے پاس قیام کیا۔

ہم نے تو اظہر کو اس خیال سے امریکہ بھیجا تھا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد

پاکستان واپس آجائے لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسے امریکہ میں پہلے گرین کارڈ ملا پھر ۱۹۹۲ء میں نیشنلٹی مل گئی اور اب اس نے میرے اور اپنی ماں کے لئے بھی امیگریشن ویزا بھیج دیا ہے۔ ۲۴۔ اگست ۱۹۹۴ء کو ریاض میں انٹرویو ہے۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہم امریکہ میں نہ رہنا چاہتے نہ مرنا، پھر وہاں آکر کیا کریں گے؟ اس نے جواب دیا کہ مقصد صرف یہ ہے کہ امی یہاں آکر دوسرے بھائیوں کے لئے امیگریشن کی درخواست دے دیں اس لئے آپ صرف تین روز کے لئے آجائیں۔

ہماری بہو نصرت اتنی خوش مزاج لڑکی ہے کہ جہاں بھی رہی اس کی سہیلیوں کی تعداد بڑی طویل رہی۔ شادی سے قبل اس کے ماں باپ اس کی سہیلیوں کی کثرت سے تنگ رہتے تھے، شادی کے بعد بھی اس کا یہی حال ہے۔ جدہ میں بھی اس کا یہی حال رہا۔ وہ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہے تو لوگ اسے ہمیشہ یاد کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ انتہائی غمگین ہو تب بھی کسی سے بات کرے تو معلوم ہوتا ہے اسے کوئی غم ہی نہیں، اس کا چہرہ ہمیشہ شگفتہ رہتا ہے۔ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات خوشگوار ہیں۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ مون کو کبھی غصہ بھی آتا ہے یا نہیں تو جواب دیا: میں نے تو ان کا غصہ کبھی نہیں دیکھا (مون کی عادت یہ ہے کہ اسے جب غصہ آتا ہے تو بالکل خاموش ہو جاتا ہے)۔

امریکہ میں قیام کے دوران اللہ تعالیٰ نے ۱۹۔ دسمبر ۱۹۸۵ء کو اسے ایک لڑکا بھی دیا جس کا نام میرے مشورے سے شاذان رکھا گیا۔ شاذان بڑا ہنس مکھ بچہ ہے۔ جس کے باپ کو کبھی غصہ نہ آتا ہو اور جس کی ماں اتنی خوش اخلاق ہو اسے ہنس مکھ ہونا ہی چاہیے۔ اس کا دوسرا بچہ ۱۸۔ مئی ۱۹۸۷ء کو کراچی میں پیدا ہوا اور حسان نام رکھا گیا۔

محمد اختر بقا:

(تاریخ پیدائش: ۳۰-دسمبر، ۱۹۵۲... بمقام سرونج، (انڈیا)

میرے والد اور ان کے بھائی بہن سرخ و سفید اور وجیہ و شکیل انسان تھے۔ یہ لڑکا شکل وصورت کے اعتبار سے کسی حد تک اپنے دادا کی عکاسی کرتا ہے اور مزاج کا اعتدال اس نے اپنی ماں سے وارثت میں پایا ہے۔

الیکٹرونکس میں ڈپلومہ کرنے کے بعد ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھوڑی سی مایوسی ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ حدیث میں ایک عمل آتا ہے اور بہت سے محدثین نے قضائے حاجت کے لئے اسے مجرب پایا ہے، اگر چاہو تو تم بھی یہ عمل کر لو چنانچہ اس نے وہ عمل کیا اور جلد ہی پاکستان ٹیلی وژن میں جگہ مل گئی۔ کہنے لگا کہ لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہے تو مایوسیوں کا سامنا کرپڑا اور اللہ میاں کا دروازہ کھٹکھٹایا تو فوراً ملازمت مل گئی۔

عمل یہ تھا:

تازہ وضو کے ساتھ دو رکعت نفل قضائے حاجت کی نیت سے پڑھے۔ سلام کے بعد اس طرح دعا مانگے: اَللّٰھُمَّ إِنِّی أَسْئَلُکَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ. یَامُحَمَّدُ إِنِّی أَتَوَجَّهُ إِلٰی رَبِّی بِکَ فَیَقْضِیَ حَاجَتِیْ (یہاں اپنی حاجت کا ذکر کرے) اَللّٰھُمَّ شَفِّعْهُ فِیَّ وَشَفِّعْنِیْ فِیْ نَفْسِیْ۔

بہتر ہے کہ اول وآخر درود شریف پڑھ لے۔ یہ عمل ترمذی شریف میں موجود ہے۔

ملازمت کے دوران ہی اس نے بی۔ایس سی۔آنرز کیا۔ پہلے اس کا تقرر کوئٹہ ٹی۔وی ہوا، پھر کراچی ٹی۔وی میں آگیا اور وہاں ترقی کر کے ٹی۔وی انجنیئر ہو گیا۔

میں جب سعودی عربیہ میں ملازم ہوا تو میں نے چاہا کہ رفتہ رفتہ اپنے سارے

بچوں کو یہاں بلالوں ۔ اختر سے میں نے یہ نہیں کہا کہ تم ملازمت ترک کر کے یہاں آ جاؤ، یہ سوچا کہ اگر خدانخواستہ یہاں پریشان ہوا تو کہیں یہ نہ کہے کہ اباجی نے میری اچھی خاصی ملازمت چھڑوادی ۔ اس لیے میں نے اسے پہلے حج پر بلایا کہ یہاں آکر خود جائزہ لے اور خود ہی فیصلہ کرے ۔ چنانچہ وہ حج پر آیا اور جائزہ لینے کے بعد خود ہی یہ فیصلہ کیا کہ مجھے یہاں ملازمت مل جائے گی ۔ چنانچہ اس کے بعد وہ یہاں آیا اور اللہ کا شکر ہے کہ معقول تنخواہ پر شہری ہوا بازی (Civil Aviation Authority) میں اپنی فیلڈ کا کام کر رہا ہے ۔

اس لڑکے کی طبیعت میں بڑی سلامت روی اور بہت سعادت مندی ہے ۔ اللہ تعالیٰ دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے ۔

اختر کی یہ حالت ہے کہ وہ ہم سے کوئی بات چھپاتا نہیں ۔ چھپاتے تو دوسرے بچے بھی نہیں لیکن اس میں اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ دوسرے پوچھنے پر بتاتے ہیں اور اختر خود بخود بتاتا ہے ۔ سارے لڑکوں میں یہ عادت ہے اور اختر میں یہ عادت سب سے زیادہ ہے کہ انہیں اگر یہ معلوم ہو کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے تو خود پیش کش کرتے ہیں، اپنے منہ سے کہنے کی ضرورت کم پیش آتی ہے، اور اگر میرے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو امکان کی حد تک وہ ان کے لیے پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے ۔

اختر کی شادی پیلی بھیت کے ایک نقوی سنی سید خاندان میں ۱۹۸۲ء میں ہوئی ۔ اس کی بیوی کا نام الماس ہے ۔

الماس بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ کم گو اور کم آمیز ہے ۔ شوہر کا بہت خیال رکھتی ہے اور ہمارے ساتھ بھی اس کا رویہ بہت اچھا ہے ۔ غیر خاندان کی بعض لڑکیاں شوہروں کو اس کے خاندان والوں سے کاٹنے کی کوشش کرتی ہیں، الماس کی طبیعت اس طرح کی نہیں ۔ اس کی طبیعت میں نہ سازش ہے اور نہ فتنہ پردازی ۔

ہماری بڑی بہو نصرت اور الماس کا مزاج ایک دوسرے سے اس اعتبار سے

بالکل مختلف ہے کہ نصرت کا حلقہ احباب طویل ہے تو الماس کا مختصر۔ الماس کمانے کی بہت چور ہے، اسے ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں موٹی نہ ہو جائے۔ طبیعت میں نفاست ہے اس لئے ہر کام سلیقے سے کرتی ہے۔ بیوی کو اس کی صفائی اور عمدگی کی وجہ سے اس کا باورچی خانے کا کام سب سے زیادہ پسند ہے۔

اختر کا بڑا بیٹا عمر بڑا خوبصورت اور ذہین بچہ ہے۔ اسی وقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور حافظہ اچھا ہو گا۔ کھانے کے نام سے چڑتا ہے۔ بڑی مشکل اور انتہائی خوشامد سے اسے کچھ کھلایا جاتا ہے اور یہ ماں کا اثر ہے۔ اس کے دوسرے بیٹے کا نام یاسر ہے اور سب سے چھوٹی بچی کا نام حاجرہ ہے۔ عمر ۲۲۔ اگست ۱۹۸۳ء، یاسر ۱۸۔ مئی ۱۹۸۷ء اور حاجرہ ۱۸۔ مئی ۱۹۹۴ء مطابق ۷۔ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ کو پیدا ہوئی اور اسی مناسبت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ مکرمہ حضرت حاجرہ کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔

محمد اسلم بقا:

(تاریخ پیدائش: ۱۲۔ ستمبر، ۱۹۵۵ء، ۱۳۷۵ھ بمقام ..... کراچی

"مرتضیٰ ارشد" اور "محمد انظار اسلم" تاریخی نام ہیں جن سے بالترتیب عیسوی اور ہجری سنہ نکلتے ہیں۔

اسلم نے کراچی یونیورسٹی سے بی۔اے کیا، اس کے بعد مکہ مکرمہ کی ام القریٰ یونیورسٹی میں تین سال کا عربی زبان کا کورس کر کے ڈپلومہ حاصل کیا۔ مزید تعلیم کے لئے وہ انگلینڈ جانا چاہتا تھا لیکن میرے مشورے سے کراچی آکر ایم۔اے۔ معاشیات کی تیاری کی اور پہلے سال کے کچھ پرچوں کا امتحان بھی دیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ایم۔اے۔ کر لینے کے بعد اسے پی ایچ۔ڈی کے لئے اس کے بھائی اظہر کے پاس امریکہ بھیج دوں لیکن اس کے رشتے کے ایک ماموں نے اسے تجارت میں مشغول کر کے اس کی زندگی برباد کر دی اور وہ اس کا مصداق ہو کر رہ گیا کہ:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اس کا تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہوا اور تجارت میں بھی ساڑھے تین لاکھ روپے ڈوب گئے۔ ایگرو فارم کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اسی میں یہ نقصان ہوا۔ پھر اسلم نے مکھن کا کاروبار شروع کیا، وہ بھی نہ چلا۔ اس کے بعد اسٹیٹ ایجنسی کا کام کیا لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اس عرصے میں میرے چھوٹے داماد عبدالرب خان نے کئی بار کہا کہ آپ میرے ساتھ کام کریں۔ سرمایہ میرا ہوگا، محنت آپ کی۔ لیکن اس نے کبھی قبول نہ کیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ اس طرح کے کام میں بدمزگی بھی ہو جاتی ہے اور رشتے کی نزاکت اس کی متحمل نہیں کہ ادنیٰ سی خلش بھی ہو۔ بالآخر وہ سعودیہ چلا آیا اور یہاں وہ تجارت میں مشغول ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا کام چل پڑا اور وہ مطمئن ہے۔

اسلم کے مزاج میں بڑی سنجیدگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوانی کے مرحلے سے گزرے بغیر بچپن سے سیدھا بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ سارے اعزاء کا خیال رکھنے اور انہیں نباہنے کا مادہ جتنا اسلم میں ہے اس کے کسی اور بھائی میں نہیں۔

اسلم کی شادی ۱۹۸۷ء میں میرے تایازاد بھائی محمد ناصر انصاری مرحوم کی نواسی (جو میری بھی نواسی ہوئی) سیما سے ہوئی ہے۔ گھر کی لڑکی ہے اس لئے سسرال کو بھی مائیکہ سمجھتی ہے اور اسی طرح سب کے ساتھ پیش آتی ہے۔ گھر والے بھی جتنی محبت اس بہو سے کرتے ہیں کسی اور بہو سے نہیں کرتے۔ خوش دلی کے ساتھ ہر ایک کی خدمت کرنا اس نے اپنی ماں سے وراثت میں پایا ہے۔

۲۸۔ جولائی ۱۹۸۸ء کو اللہ نے اسے ایک لڑکا دیا۔ "انس اسلم بقا" نام رکھا گیا اس کے دوسرے بیٹے کا نام "علی" رکھا گیا، جو ۲۔ فروری ۱۹۹۲ء کو پیدا ہوا۔

عابدہ خاتون:

(تاریخ پیدائش: ۷۔اکتوبر، ۱۹۵۸ء ... بمقام سندھ مدرسہ، کراچی بوقت عشاء)

بہنوں میں سب سے زیادہ شوخ اور باذوق ہے۔ اپنی لڑکیوں میں سب سے زیادہ محبت مجھے اسی سے ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ زاہدہ کے انتقال کے بعد اس کی محبت بھی اس کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ مکہ معظمہ میں بھی رہی اور کچھ ماہ مدرسہ صولتیہ کے بچوں کے اسکول میں پڑھایا بھی۔ شادی کے بعد سے کراچی میں ہے اس نے حالانکہ ہمدرد طبیہ کالج سے باقاعدہ طبیبہ کا کورس کیا ہے، لیکن دوسروں کا علاج کیا کرتی اپنے مرض بلکہ امراض کے لئے بھی ڈاکٹروں کے پاس بھاگتی ہے۔ (حال ہی میں اس نے "دارالبقا" کے نام سے اپنا کلینک قائم کیا ہے)۔ اس کی شادی حفیظ اللہ خان سے ہوئی۔ چار بچیوں کی ماں ہے؛ حنا، افشاں، ندا اور ہدیٰ جن کی پیدائش کی تاریخیں بالترتیب یہ ہیں: ۷۔فروری ۱۹۸۳ء، ۱۵۔اپریل ۱۹۸۴ء، ۲۵۔مئی ۱۹۸۵ء اور ۲۴۔جنوری ۱۹۹۴ء۔

زاہدہ خاتون:

ساڑھے چار ماہ کی تھی کہ انتقال ہو گیا۔ بڑی خوبصورت بچی تھی۔ دو سال کے عرصے میں ماں کی جتنی محبت بچے لیا کرتے ہیں اتنی محبت اس نے ساڑھے چار ماہ میں وصول کر لی۔

افسانوں میں عاشق کے دل کی گہرائیوں سے آہ نکلنا بارہا نظر سے گزرا لیکن چونکہ عشق و محبت کے کوچہ سے نابلد رہا اس لئے عملی تجربے سے محروم رہا۔ اس بچی کے انتقال پر معلوم ہوا کہ دل کی گہرائیوں سے آہ اس طرح نکلتی ہے۔

ساجدہ خاتون:

(تاریخ پیدائش: ۲۶۔دسمبر، ۱۹۶۲ء ... بمقام ہیر آباد، (حیدر آباد، سندھ)

اختر کی طرح یہ بچی بھی اپنی ماں پر پڑی ہے اور وہ ساری خوبیاں لے کر پیدا ہوئی ہے جو اس کی ماں میں موجود ہیں۔ سب بہنوں سے زیادہ ذہین ہے۔ میرے سعودیہ آجانے کی وجہ سے اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، تاہم اس نے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے اپنے شوق سے انٹر کیا اور بی۔اے۔ بھی کر لیا۔ بڑی پیاری بچی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے مجھے سب سے زیادہ محبت اس کی بڑی بہن سے کیوں ہے، اس کی شادی حیدرآباد دکن کے عبدالرب خان سے ہوئی۔ اس کے اس وقت دو بچے ہیں؛ سعد (جو سات ماہ میں پیدا ہوا) اور اسعد۔ تاریخ پیدائش ۲۰۔۱۰۔۱۹۸۶ء اور ۱۴۔۱۔۱۹۹۲ء (بالترتیب)۔

محمد اعظم بقا:

(تاریخ پیدائش: ۱۶۔ مئی، ۱۹۶۵ء... کراچی)

اعظم نے چونکہ شروع ہی سے ہرا ہرا دیکھا ہے اس لئے اس کا دماغ سب سے زیادہ خراب ہے اور میرا خاندانی موروثی غصہ میرے تمام لڑکوں میں سے صرف اسی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس نے جدہ کے پاکستانی اسکول / کالج سے انٹر سائنس کیا پھر کراچی میں ایس۔ایم کالج میں بی۔ایس سی میں داخلہ لیا اور ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کمپیوٹر کا کورس کرنے کے لئے قبرص (Cyprus) گیا لیکن وہاں سے دو سال کا ڈپلومہ کرنے کے بجائے ایک سال ہی میں لوٹ آیا۔ اب جبکہ ۱۹۹۴ء ہے اس کے مزاج میں خاصا اعتدال آگیا ہے، وہ ہر کام طویل غور و فکر کے بعد کرتا ہے اور اس کی گفتگو خاصی معقول ہوتی ہے۔

اعظم نے اردو بازار میں "بقا کمپوزنگ سروسز" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ اس میں کمپیوٹر کے ذریعے (مختلف زبانوں میں) کمپوزنگ اور ڈیزائننگ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے۔ اس کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت کی دیگر

تیاریاں بھی اسی ادارہ میں، ہوئی ہیں۔

اعظم کی شادی میرٹھ کے معراج الدین صاحب کی لڑکی حمیرا سے ۴۔ اگست ۱۹۹۱ء کو ہوئی اور ولیمہ ۵۔ اگست کو ہوا۔ اللہ تعالیٰ ازدواجی زندگیاں خوشگوار فرمائے۔ آمین۔

حمیرا جسے "ہما" کہا جاتا ہے بڑی سادہ مزاج کی لڑکی ہے۔ اس کے مزاج کو فتنہ و شر سے کوئی مناسبت نہیں۔ غیر خاندان کی لڑکی ہونے کے باوجود سسرال والوں سے اس بے تکلفی سے پیش آتی ہے جیسے وہ اس گھر کی بہو نہ ہو، بیٹی ہو۔

۷۔ نومبر ۱۹۹۴ء مطابق ۲۔ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ کو اللہ نے اسے ایک لڑکی دی جس کا نام میرے مشورے سے رُمیثہ رکھا گیا۔

باب ہفتم

وصیت واختتامیہ

وصیت

ہر شخص کو ایک روز دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف کوچ کرنا ہے۔ اس لئے میں نہایت دردمندی سے اپنی آئندہ نسلوں کو اس کی وصیت کرتا ہوں کہ اپنی چند روزہ زندگی میں اس کا اہتمام رکھیں کہ آخرت کی دائمی زندگی تباہ نہ ہونے پائے۔

افراط و تفریط کے بغیر اہل سنت والجماعت کے عقائد پر قائم رہیں اور اپنی عملی زندگی میں سنت کی اتباع کی کوشش کریں۔ کم از کم اس کا ضرور لحاظ رکھیں کہ فرائض کی پابندی اور حرام سے اجتناب میں کوتاہی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کو ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ایمان ہی پر خاتمہ فرمائے۔ آمین

میرا معمول ہے کہ ہر نماز کے بعد اپنے والدین کو فاتحہ پڑھ کر بخشتا ہوں۔ (درود شریف، سورۃ فاتحہ، آیت الکرسی، سورۃ اخلاص (تین بار) معوذتین، درود شریف)۔ میری آئندہ نسلیں بھی میرے لئے اور اپنے والدین کے لئے اسی طرزِ عمل کو اختیار کریں۔ ورنہ کم از کم سونے سے پہلے تین بار سورۃ اخلاص (اول و آخر درود شریف) پڑھ کر بخش دیا کریں۔

اختتامیہ

اس کتاب کی ترتیب برسوں پر محیط ہے۔ اس طرح کہ جب بھی فرصت ملی اور طبیعت آمادہ ہوئی کچھ لکھ لیا۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو نافع اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائیں۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

محمد مظہر بقا

۱۹۹۴/۱۲/۳ء

کچھ یادیں

محمد مظہر بقا
فاضلِ دیوبند، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دنیا میں ایک ہوشمند انسان بھی ایسا نہیں مل سکتا جس کے سینے میں کچھ قابلِ ذکر یادیں محفوظ نہ ہوں ۔ لیکن عام طور پر یہ یادیں اسکے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہیں اور زمانے کا امتداد ان کی زبانی روایات کو بھی طاقِ نسیاں کی نذر کر دیتا ہے ۔

میرے سینے میں بھی کچھ یادیں محفوظ ہیں ۔ میں نے سوچا کہ انہیں سینے سے سفینے میں منتقل کر دوں ۔

اس کتاب میں علماء ، صوفیا ، شعراء اور مجذوبوں کے تذکرے بھی ہیں ، حق گوئی ، بلند اخلاقی ، رواداری اور بے نفسی کے واقعات بھی ، کچھ حیرت افزا اور عبرت انگیز قصے بھی ، بعض مجرب نسخے اور عملیات بھی اور دوسری مفید اور دلچسپ باتیں بھی ۔

امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی کا باعث ہوگی اور نفع بخش بھی ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ اس کتاب کو میرے لئے "علم ینتفع بہ" میں سے شمار فرمالے ۔

عفا اللہ عنہ
محمد شفیع

۱۲/۳/۱۴۱۷ھ
۲۷/۷/۱۹۹۶ء

کچھ ناشر کے بارے میں...

یہ کتاب "بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز" سے شائع ہو رہی ہے۔ یہ ادارہ میرے سب سے چھوٹے بیٹے محمد اعظم بقا کی ملکیت ہے۔ اعظم کے بارے میں، میں نے اپنے کچھ تاثرات اپنی کتاب "حیاتِ بقا" میں قلمبند کئے ہیں۔ اب چند سال بعد اندازہ ہوا کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے شعور میں خاصی پختگی آچکی ہے۔ حالات کا تجزیہ کرنے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے میں اس کی صلاحیت قابلِ رشک ہے۔

"حیاتِ بقا" کی اشاعت میں بھی اعظم نے کافی محنت کی تھی، خاص طور پر سرورق کی تزئین اور کتاب کی تبویب اسی کی فکر کا نتیجہ تھی۔

موجودہ کتاب "کچھ یادیں" میں اس نے "حیاتِ بقا" سے بھی زیادہ محنت کی ہے۔ بعض جگہ ایک لفظ کے بجائے زیادہ موزوں لفظ کے انتخاب اور کہیں کہیں عبارت کا ابہام دور کرنے میں بھی اس نے بہت مفید مشورے دیے ہیں، خاص طور پر کتاب کی تصحیح میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔

اگر اپنے ادارے سے شائع کردہ ہر کتاب کے سلسلے میں وہ اسی محنت اور دقتِ نظر کا اہتمام کرتا رہے تو امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا شمار ممتاز ناشرین میں سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اسے دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے، آمین۔

حضرت شیخ الہند

مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مجھ سے میرے استاد مولانا منتخب الحق صاحب نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ مولانا معین الدین صاحب اجمیری (مولانا کے استاد) دلی آئے تو حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لئے دیوبند بھی پہنچے۔ گھر پہنچ کر زنجیر کھٹکھٹائی تو ایک صاحب باہر آئے۔ ان سے مولانا معین الدین مرحوم نے کہا کہ حضرت شیخ الہند سے کہہ دو کہ اجمیر سے معین الدین آیا ہے۔ ان صاحب نے مولانا معین الدین کو اندر بلا کر ڈیوڑھی میں پڑے ہوئے پلنگ پر بٹھایا، پھر اندر سے گڑ اور پانی لائے اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کی تواضع کرنے لگے۔ تھوڑی دیر ہوئی تو مولانا معین الدین نے کہا: میاں ہم نے تم سے کہا کہ حضرت شیخ الہند کو ہماری آمد کی اطلاع کر دو، اور تم اب تک ہمارے پاس بیٹھے ہو۔ ان صاحب نے جواب دیا: اگر شیخ الہند سے آپ کی مراد محمود حسن ہے تو یہ نام تو اسی خاکسار کا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام
مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

اپنے اساتذہ کی فہرست میں اگر میں نے کسی شخصیت کو مذکورہ شعر کا حقیقی مصداق پایا تو وہ صرف شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت تھی۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ تقریریں بکثرت کرتے تھے۔ ان کا کوئی ہفتہ بھی سیاسی تقریروں سے خالی نہ جاتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں تقریر کا فن نہ آتا تھا۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتے تھے۔

لیکن خلوص پر مبنی ان کی تقریریں "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق ہوتی تھیں۔ ان کی تقریروں میں ان کے غیر معمولی حافظے کا بڑا دخل تھا۔ انگریز مصنفین کی کتابوں کے حوالے بقید صفحات دیتے جاتے تھے۔

یوں تو سب ہی اساتذہ اور طلبہ ان کا احترام کرتے تھے لیکن چند اساتذہ اور ان کے زیر اثر طلبہ کو چھوڑ کر، جو سیاسی طور پر مسلم لیگی تھے، باقی تمام اساتذہ و طلبہ ان سے فداکارانہ محبت کرتے تھے۔ میں نے بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہی صورت حال خود پر بھی گذری ہے کہ حضرت مدنی درس کے لئے آتے ہوئے دار جدید کے دروازے میں داخل ہوئے اور جن طلبہ کی ان پر سب سے پہلے نظر پڑی ان کے منہ سے نکلا: "مولانا" اور یہ لفظ ایک منہ سے دوسرے منہ تک منتقل ہوتے ہوئے دار جدید کے

پورے وسیع و عریض احاطہ میں گونج گیا۔اب یہ کیفیت ہے کہ مولانا چند طلبہ کے جلو میں، دار جدید کے دروازے سے دارالحدیث تک کا طویل فاصلہ طے کر رہے ہیں اور جو طالب علم جہاں کھڑا ہے وہیں کھڑا رہ گیا ہے اور نظریں مولانا پر گڑی ہوئی ہیں تاآنکہ مولانا دارالحدیث کی سیڑھیاں چڑھ کر نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔

اس نالائق نے بخاری اور ترمذی حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ ہی سے پڑھیں اور دارالعلوم کی سند کے علاوہ حضرت سے خصوصی سند بھی حاصل کی۔فراغت کے بعد حضرت کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔حضرت نے پاس انفاس کا عمل بتایا، لیکن شومیٔ قسمت کہ میں اس پر پابندی نہ کر سکا۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیوبند کے اکابر اساتذہ میں تھے۔ انہیں مشکل ہی سے کسی نے مسکراتے دیکھا ہوگا۔ ان کی سلام میں سبقت ضرب المثل تھی۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص سلام میں ان سے سبقت کرسکے۔ وقت کے انتہائی پابند تھے۔ گھنٹہ پر موگری پڑتے ہی سبق شروع کرادیتے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ختم کردیتے، خواہ بات ادھوری ہی کیوں نہ ہو۔ عربی عبارت کا ترجمہ اس طرح کرتے تھے کہ پوری ترکیب نحوی سمجھ میں آتی جاتی تھی، اس میں ایک لفظ بھی بھرتی کا نہ ہوتا تھا۔ اسی لئے بعض طلبہ کی کوشش یہ ہوتی تھی، خاص طور پر ادب کی کتابوں میں کہ ترجے کے جو الفاظ ان کے منہ سے نکلیں انہیں بعینہٖ قلمبند کرلیں۔ طلبہ پر بے انتہا شفیق تھے، لیکن کسی طالب علم سے ان کی خوشی یا ناخوشی کا مدار اس پر ہوتا تھا کہ کون کس حد تک محنتی یا بدشوق ہے۔ بعض طلبہ یہ کرتے تھے کہ ان کے درسگاہ جانے اور آنے کے اوقات میں ان کی گذرگاہ پر کتاب کھول کر کھڑے ہو جاتے تھے اور کتاب میں اس درجہ مصنوعی انہماک بیدار کرتے کہ گویا انہیں حضرت کے گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔

میں نے حضرت شیخ الادب سے حسب ذیل کتابیں پڑھی ہیں:

ہدایہ اخیرین، دیوان متنبی، دیوان حماسہ، شمائل ترمذی اور خارج میں عروض المفتاح۔

حضرت کے بعض حالات میں نے اپنی کتاب "حیات بقا" میں وہاں درج کئے ہیں جہاں دیوبند میں اپنے طالب علم کے دور کا ذکر ہے اور وہیں پر راقم کے نام حضرت کے دو خطوط کے فوٹو بھی دیئے ہیں۔

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ

دارالعلوم دیو بند کے مہتمم قاری طیب صاحب مرحوم نہایت خوبصورت انسان تھے۔ سردیوں کے زمانے میں جب ہری شال اوڑھ کر نکلتے تو چہرے کی یہ کیفیت ہوتی جیسے ہری پتیوں کے درمیان گلاب کا پھول کھلا ہو۔ میں نے ان سے خارج میں حجۃ اللہ البالغہ کے کچھ اسباق پڑھے ہیں۔

ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لائے۔ ان کے صاحبزادے مولوی سالم صاحب بھی ہمراہ تھے۔ دیو بند کے منتسبین کو جمع کیا گیا، میں بھی حاضر ہوا۔ فارغ التحصیل طلبہ کی ایک مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا اور سرپرست کی حیثیت سے مولوی سالم صاحب نے قاری طیب صاحب کا نام پیش کیا۔ فرمایا: یہ سرپرستی اگر صرف دعا گوئی کی حد تک ہے تو مجھے منظور ہے اور اگر کام بھی مطلوب ہو تو میری عمر اس کی متحمل نہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ

ہندوستان ترک کرکے جب کراچی پہنچا تو استادِ گرامی حضرت مولانا منتخب الحق صاحب کے ہمراہ ملازمت کے لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے دارالعلوم دیوبند میں حضرت کی شاگردی کی سعادت نصیب ہو چکی تھی، لیکن مجھ جیسے نالائق شاگرد اس استاد کو کس طرح یاد رہ سکتے ہیں جس کے سامنے ہر درس میں سینکڑوں طلبہ بیٹھتے ہوں۔ مولانا منتخب الحق صاحب نے تعارف کے بعد آمد کا مقصد بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا: آپ دو تین روز افتاء کا کام کیجئے تاکہ طرفین کام کی نوعیت کو دیکھ سکیں۔

حضرت کے اس جواب پر مجھے خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی۔ خوشی اس لئے کہ جواب مایوس کن نہ تھا اور تعجب اس لئے کہ جس ہیئت کے ساتھ میں حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا وہ اس طرح کے جواب کی مستحق ہرگز نہ تھی۔ اگر حضرت مفتی صاحب کی جگہ میں اور میری جگہ مجھ جیسا کوئی اور ہوتا، جس کو مجھ سے شاگردی کا تعلق بھی رہا ہو، تو اگر مولانا منتخب الحق صاحب کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے میں اپنے جذبات پر قابو پاکر مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی کرتا تو بھی معذرت کے سوا میرا اور کوئی جواب نہ ہوتا۔

چہرے پر سکھوں جیسی چڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھیں، سردار عبدالرّب نشتر جیسا عمامہ اور اس کے ساتھ پتلون اور قمیص (جو مولوی امتیاز احمد مرحوم سے مستعار لئے تھے، کیونکہ میرے کپڑوں اور سامان کا بکس تو کراچی کے سفر میں گم ہو چکا تھا)۔ اس وضع کے ساتھ افتاء کے مقدس کام کی طلب، مسور کی دال کی تمنا نہیں تو اور کیا ہے، اور کیا ایسا شخص معذرت کے سوا کسی اور جواب کا مستحق ہو سکتا ہے؟

لیکن حضرت مفتی صاحب نے، اللہ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے، ظاہر کو نظر انداز فرما دیا اور دیکھنا یہ چاہا کہ اس شخص میں صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ بعد کے دور میں حضرت کی فراست ایمانی کے جو واقعات میرے سامنے آئے ان کی روشنی میں، اپنی تمام تر نالائقی کے باوجود، مجھے تو یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ حضرت نے پہلی نظر ہی میں یہ اندازہ فرمالیا کہ "آدمی ہے کام کا"۔

چونکہ اس سے قبل ٹونک کے محکمہ شرعیہ میں مفتی کی حیثیت سے کام کر چکا تھا، اس لئے فتویٰ نویسی کی تکنیک سے واقف تھا۔ تیسرے روز ہی حضرت نے فرمایا کہ آپ چاہیں تو کام جاری رکھیں، ہم فی الحال صرف ۱۲۵ روپے ماہوار دے سکیں گے (حالانکہ مجھ سے پہلے جو صاحب یہ کام کرتے تھے انہیں صرف ۶۵ روپے ماہوار ملتے تھے اور اس پر بھی میرے تقرر سے چند روز قبل انہیں جواب دیا جا چکا تھا)۔

بہرحال افتاء کا کام شروع کر دیا اور اس مقدس کام سے پاکستان میں میری ملازمت کی ابتداء ہوئی۔ اور اس وقت جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں مکہ مکرمہ کی جامعہ ام القریٰ میں اپنی موجودہ ملازمت اور کام کی نوعیت کو دیکھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی تناور درخت ہے جس کا بیج حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کراچی میں بویا گیا (کیونکہ جمالی صاحب نے، جیسا کہ میں نے ان کے حالات میں لکھا ہے، میری نوجوانی میں یہ پیشن گوئی کی تھی کہ تم کسی ایسے بڑے شہر میں سکونت اختیار کرو گے جو سمندر کے کنارے ہوگا اور وہیں سے تمہاری قسمت کھلے گی)۔

فتویٰ نویسی میں عام طور پر تو یہی ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب "الجواب صحیح" لکھ کر دستخط فرما دیتے تھے لیکن اگر جواب میں خامی ہوتی تو فرماتے فلاں فلاں کتابیں دیکھو اور جب وہ کتابیں دیکھتا تو واقعۃً اپنے جواب میں ترمیم کرنی پڑتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فرماتے: "اس جواب میں مجھے غلطی تو نظر نہیں آتی لیکن دل اسے قبول نہیں کرتا، مزید غور کرو"۔ بیشتر تو یہی ہوتا کہ مزید غور وفکر کے نتیجے

میں مجھے اپنے جواب میں ترمیم کرنی پڑتی، بصورتِ دیگر حضرت فرماتے کہ اچھا اسے اس طرح لکھ دو۔ اور اسی طرح کے مواقع پر احساس ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نرے فقیہ نہ تھے بلکہ فقیہ النفس تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔

ناظم الدین وزارت کے زمانے میں جبکہ دولتانہ پنجاب کے وزیر اعظم تھے، قادیانی تحریک برپا ہوئی۔ اس زمانے میں ایک استفتاء آیا کہ قادیانیوں کے خلاف اس تحریک میں شریک ہونے اور اس میں مرجانے کا شرعی حکم کیا ہے۔ میں نے وہ استفتاء حضرت کے سامنے پیش کر دیا۔ فرمایا اس کا جواب نہ دو اور وجہ یہ بتائی کہ بعض مرتبہ اس طرح کے استفتاء کا اصل مقصد واقعۃً شرعی مسئلہ دریافت کرنے کے بجائے یہ ہوتا ہے کہ مفتی کو فتنہ میں مبتلا کیا جائے۔ لیکن اس سے قطع نظر شرعی صورت حال یہ ہے کہ دارالاسلام کی ادنیٰ تعریف یہ ہے کہ وہاں مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ اگر اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہیں تو کوئی دوسری داخلی قوت انہیں اس سے روک نہ سکے۔ اس اعتبار سے پاکستان دارالاسلام ہے اور دارالاسلام کے خلاف اس طرح کی تحریک جائز نہیں۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ قادیانی کافر ہیں اور ان کے خلاف تحریک میں حصہ لینا باعثِ اجر و شہادت ہے۔ اور جب دو اصول ٹکرا رہے ہوں اور ذہن صاف نہ ہو تو ایسی صورت میں فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔

ایک مرتبہ میں نے فتویٰ میں **الفقہ علی المذاهب الاُربعہ** کا حوالہ دے دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے دیکھا تو فرمایا، میں نے آج تک اس کتاب میں کوئی مسئلہ غلط تو نہیں دیکھا لیکن اس کتاب کا علماء کے درمیان ہنوز تداول نہیں ہوا اور فتویٰ متداول کتاب سے دیا جاتا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب سے

فرمائش کی کہ فقہ پر کوئی ایسی کتاب مرتب فرمادیں جو ائمہ مساجد کے لئے نصاب کا کام دے۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک روز فرمایا کہ پورا خاکہ ذہن میں نہیں آرہا۔ کہیں کراچی سے باہر چلیں، جگہ کی تبدیلی سے بھی ذہن فعال بن جاتا ہے۔ چنانچہ کراچی کے مضافات میں میمن گوٹ چلے گئے اور مسجد میں قیام کیا۔ تقی میاں (جسٹس محمد تقی عثمانی) بھی ہمراہ تھے۔

اتفاق سے حضرت مفتی صاحب کو عرق النساء کا درد اٹھا اور اتنا شدید کہ وہاں مزید قیام ممکن نہ رہا۔ چنانچہ دوسرے روز ہی واپس آنا پڑا۔

ایک روز حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ فی الحال بہشتی زیور سامنے رکھ کر مسائل تو لکھنا شروع کرو۔ میں نے کام شروع کر دیا لیکن اپنی پرانی منحوس عادت کے مطابق بے دلی اور سست رفتاری سے۔ ایک دن مفتی صاحب نے مدت اور کام کا جائزہ لیا تو مایوس کن تھا۔ فرمایا: جس زمانے میں مجھے دارالعلوم میں افتاء کا کام سپرد کیا گیا میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے یومیہ کام کرتا تھا۔ عمل اور ذمہ داری کے احساس ہی سے آدمی کی قدر ہوتی ہے۔ اب دیکھو! مولانا منتخب الحق صاحب کو میں بعض علوم میں اپنے سے فائق پاتا ہوں لیکن ذمہ داری کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی قدر کھو دی ہے۔ (میں جانتا ہوں کہ مولانا منتخب الحق صاحب جنہیں تمام درسی علوم میں کمال کے ساتھ ساتھ خاص طور پر اصول فقہ میں امامت کا درجہ حاصل تھا، ان کی کیفیت یہ تھی کہ موڈ ہوا تو ایک ایک دن میں اٹھارہ اٹھارہ سبق پڑھا دیئے، موڈ نہ ہوا تو اٹھارہ دن میں ایک سبق بھی نہ پڑھایا۔ جو با کمال حضرات اپنے موڈ کے اس طرح تابع ہوتے ہیں اپنا کمال اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو جاتے ہیں، ان کی کوئی قابلِ ذکر علمی یادگار باقی نہیں رہتی اور یہی حال مولانا منتخب الحق صاحب کا تھا) ۔ فرمایا: دارالعلوم میں اور بھی اساتذہ ہیں، آخر یہ کام میں نے تمہارے ہی سپرد کیوں کیا؟ اس لئے کہ تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت پاتا ہوں، لیکن تم ہو کہ کام کر کے ہی نہیں دیتے۔ مفتی صاحب

نے مزید فرمایا کہ: عالم کے تین کام ہوتے ہیں: پہلا امامت، دوسرا تدریس جو امامت سے افضل ہے اور تیسرا تصنیف و تالیف جو سب سے افضل ہے، کیونکہ اس کا نفع پائیدار ہوتا ہے۔

میرا کام اگرچہ فتویٰ نویسی تھا لیکن ملازم میں دار العلوم کا تھا۔

ناظم دار العلوم مولانا نور احمد مرحوم کی کسی بات پر ناراض ہو کر ایک مرتبہ میں نے تحریری استعفاء پیش کر دیا۔ یہ رمضان کا آخری عشرہ تھا اور حضرت مفتی صاحب آرام باغ کی مسجد میں معتکف تھے۔ ناظم صاحب مجھے لے کر حضرت کے پاس مسجد میں پہنچے اور میری تحریر پیش کی۔ فرمایا: ابھی رکھو رمضان کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔

حضرت مفتی صاحب دراصل حکیمانہ اسلوب سے اس وقت بات کو ٹالنا چاہتے تھے، یہ جان کر کہ یہ غصے کا اثر ہے اور رمضان میں بات بات پر غصہ آ ہی جاتا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب غصہ فرو ہو گا تو بات خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ نہ میں نے وہ تحریر واپس لی اور نہ وہ منظور ہوئی۔

دار العلوم میں جب تک رہا یہ وضع رہی: ڈاڑھی اور مونچھیں سکھوں کی طرح چڑھی ہوئیں اور بدن پر شلوار اور کالر دار قمیص۔ ظاہر ہے کہ یہ مولویوں کی وضع نہیں اور اسی وضع سے ناظم صاحب بجا طور پر چڑھتے اور ٹوکتے رہتے تھے، اور میں ہمیشہ انہیں یہ جواب دیتا تھا کہ یہ وضع تو اس وقت چھوڑوں گا جب اللہ کا خوف دل میں پیدا ہو گا، آپ کے کہنے سے تو چھوڑنے سے رہا۔

لیکن اللہ عزّ و جلّ رحمت فرمائے حضرت مفتی صاحب کو کہ فتاویٰ کے سلسلے میں روزانہ حاضرِ خدمت ہونے کے باوجود دو سال کے عرصہ میں میری اس وضع کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔

جب میرا تقرر ایس۔ ایم۔ کالج کراچی میں ہوا تو میری موجودگی میں ناظم

صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے کہا: حضرت اب تو یہ کالج کے مولوی ہو گئے۔ مقصد تھا... کریلا اور نیم چڑھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ایسی بات فرمائی کہ جب بھی خیال آتا ہے بعض مرتبہ آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ اور اس وقت بھی یہی کیفیت ہے جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ فرمایا: دیکھو مولوی نور احمد، جہاں تک ان کے ظاہر کا تعلق ہے یہ ہمیشہ سے کالج کے مولوی ہیں، مدرسے کے کبھی نہیں رہے۔ لیکن جہاں تک باطن کا تعلق ہے یہ ہمیشہ مدرسے کے مولوی رہیں گے، کالج کے کبھی نہ ہوں گے۔ حضرت مفتی صاحب کی اس رائے کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہوں اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله، "مومن کی فراست سے ہوشیار رہو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ حضرت مفتی صاحبؒ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کرتے تھے کہ وہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ مجھے کشف نہیں ہوتا، لیکن اگر ہم قسم کھا کر یہ کہیں کہ ان کے معاملات کشفی ہوتے تھے تو حانث نہیں ہوں گے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اگر میں یہی بات حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہہ دوں تو انشاءاللہ میں بھی حانث نہ ہوں گا۔

جب تک مدرسے میں تھا انفرادیت اور فیشن اس وضع میں تھی جو میں نے بنا رکھی تھی۔ کالج پہنچا تو وہاں ایک سے ایک فیشن ایبل موجود تھے۔ سوچا کہ اب اپنی انفرادیت اسی میں ہے کہ پرانی وضع کی طرف لوٹ جاؤں۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں کرتہ پاجامہ اور شیروانی اختیار کر لی۔ لیکن ڈاڑھی اور مونچھوں کی وضع قائم رہی، تاآنکہ قسمت مجھے ایک مرتبہ حضرت شاہ زوار حسین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس خیرپور ٹامے والی لے گئی اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ ایک روز بال بنانے بیٹھا، آئینہ سامنے کیا تو خیال ہوا جس علم کی طرف میری نسبت ہے، برائے نام ہی سہی، یہ وضع اس کے

مناسب نہیں۔ اس وقت سے آج تک مونچھ نیچی اور ڈاڑھی سیدھی ہے اگرچہ خود آج تک سیدھا نہ ہو سکا۔

دارالعلوم کی ملازمت کے دوران مجھے ۱۲۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس قلیل تنخواہ میں ایک بیوی اور تین بچوں کے ساتھ کیا گذر ہوتا اور بیوی بھی ایسی کشادہ دست کہ ماشاء اللہ۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کو جب میری پریشان حالی معلوم ہوئی تو میرے لئے پچاس روپے ماہوار کا مزید انتظام فرمادیا اس طرح کہ جدید طرز پر راست طریقہ (Direct Method) سے بالغوں کو پڑھانے کے لئے دارالعلوم اور "الطریقۃ الجدیدۃ" کے مؤلف استاد امین المصری کے تعاون سے جو مدارس قائم کئے گئے تھے ان میں مدرس لگا دیا۔ لیکن آمدنی کے تناسب سے مصارف بھی بڑھ گئے اور نتیجہ وہی رہا کہ نہ پریشانی میں کمی ہوئی اور نہ قرض لینے کی قبیح عادت سے چھٹکارا نصیب ہوا۔

کبھی کبھی تو مجھے خیال آتا ہے کہ میری سابقہ تنگ دستی اور پریشانی شاید قرض لینے ہی کی وجہ سے تھیں، کیونکہ حدیث میں ہے **من فتح باب مسالۃ فتح اللہ علیہ باب فقر** (جو سوال کا دروزاہ کھول لیتا ہے اللہ اس پر فقر کا دروازہ کھول دیتا ہے)۔

بہرحال جب مفتی صاحب کے علم میں آیا کہ میری پریشانی بدستور ہے تو ایک روز فرمانے لگے: معلوم ہوتا ہے تم اور تمہاری بیوی دونوں پھوہڑ ہو۔ مجھے دیکھتے ہو کتنا بڑا کنبہ لئے بیٹھا ہوں اور خرچ جانتے ہو کیا ہے؟ تین سو روپے ماہوار۔

جب میں نے ایس۔ ایم۔ کالج میں ملازمت کا ارادہ کیا تو حضرت مفتی صاحب نے ایک کاغذ پر اپنی انگلی سے تین جگہ اوپر، درمیان میں اور نیچے کچھ لکھا اور فرمایا کہ اس پر لکھ کر درخواست دے دو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ ملازمت دلا دی۔ گویا دارالعلوم سے کالج کی طرف منتقل ہونا بھی حضرت ہی کی مرضی اور تصرف سے ہوا۔

دارالعلوم سے ایس۔ ایم۔ کالج منتقل ہوئے شاید ایک سال ہی ہوا ہو گا کہ

ایک صاحب کے لئے حضرت مفتی صاحب سے سفارش کے طور پر خط لکھوانے گیا۔ فرمایا! آپ انہیں جانتے ہیں؟ میں نے جواب دیا: بہت اچھی طرح۔ قلم اور پیڈ اٹھایا اور میرے حوالے سے ان کے لئے سفارشی خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن دیکھا کہ قلم ہاتھ میں ہے اور حضرت کچھ سوچ رہے ہیں۔ پھر نظریں اٹھائیں اور مجھ سے دریافت فرمایا: آپ کا نام؟ میں نے نام تو بتا دیا لیکن ایک دھچکا سا لگا کہ دو سال تک مفتی صاحب کی خدمت میں رہا ہوں اور اتنا نالائق اور ناقابل التفات ہوں کہ اس قلیل عرصے میں حضرت میرا نام بھی بھول گئے۔ نام سن کر خط لکھنے کے لئے گردن جھکائی لیکن ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا کہ دوبارہ نظریں اٹھائیں اور فرمایا: اب دیکھئے آپ کا نام بھول رہا ہوں، یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنا نام بھول جائے۔ حضرت کی زبان سے یہ سن کر سارا غبار دھل گیا۔

حضرت مفتی صاحب اور ان جیسے بعض دوسرے بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ ان پر خلوت در انجمن کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ نظر کسی طرف ہے، باتیں کسی سے کر رہے ہیں۔ کسی بھی کام میں مصروف ہیں مگر دھیان دل کی طرف ہے، اس پنھیاری کی طرح جس کے سر پر نیچے اوپر پانی کے بڑے چھوٹے تین تین برتن رکھے ہوں۔ وہ راستے کے نشیب و فراز دیکھ کر بھی چلتی ہے اور سہیلیوں سے باتیں بھی کرتی جاتی ہے لیکن چت برتنوں کی طرف رہتا ہے۔ گرنا تو کجا، مجال ہے کہ برتن چھلک بھی جائے۔

اس کیفیت کا اندازہ بعض مرتبہ اس سے بھی ہوتا تھا کہ کبھی کبھی مفتی صاحب ہماری طرف اس طرح مخاطب ہوتے تھے جیسے کوئی اندر سے باہر آ رہا ہے، جیسے آٹے میں سے آہستہ آہستہ بال کھینچا جا رہا ہے۔

ایک روز حضرت کے مکان پر حاضر تھا۔ فون آیا، میں نے پوچھا کون؟ جواب ملا: سلیمان۔ میں نے حضرت سے کہا سلیمان نامی کسی صاحب کا فون ہے۔ گھبرا کر فرمایا: سید صاحب کا فون ہے (سید سلیمان ندوی مرحوم) اور اس طرح مؤدب ہو کر فون پر

باتیں کرنے لگے جیسے سید صاحب مرحوم سامنے بیٹھے ہوں۔

ایک مرتبہ دارالعلوم نانک واڑہ کے دفتر میں سید سلیمان ندوی صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے کچھ حضرات تشریف فرما تھے، میں بھی موجود تھا۔ سید صاحب نے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں غرق ہو گئے۔ ہوش بھی نہ رہا کہ کہیں اور بھی جانا ہے۔ حضرت مفتی صاحب ان کے قریب ہی دوزانو بیٹھے تھے جیسے کوئی شاگرد (پرانے زمانے کا) اپنے استاد کے سامنے بیٹھا ہو۔ کسی نے مفتی صاحب سے چلنے کا اشارہ کیا، مفتی صاحب نے اشارے ہی سے جواب دیا کہ سید صاحب تو کتاب میں مہنمک ہیں، ایسی حالت میں کون یہ کہنے کی جرأت کرے کہ چلئے۔

حضرت مفتی صاحب دل کے دورے سے (غالباً) ابھی پوری طرح سنبھلے بھی نہ تھے کہ ان کے بڑے صاحبزادے ذکی میاں کے انتقال کی روح فرسا خبر پہنچی۔ بڑا بیٹا وہ بھی اتنا سعادت مند کہ باید وشاید۔ میں بھی تعزیت کے لئے حاضر ہوا، اندر بلا لیا۔ فرمایا: طبعی عمر کے مطابق لوگوں کو میری تعزیت کے لئے اس کے پاس جانا چاہیے تھا، لیکن اللہ کی مصلحت کہ اس کی تعزیت کے لئے میرے پاس آرہے ہیں۔ فرمایا: اس کمرے میں جب تنہا ہوتا ہوں تو ذہن میں لوگوں کی یاد اس طرح آتی ہے جیسے پردہ فلم پر تصویریں۔ میری عادت یہ ہے کہ جب بھی کسی کی یاد آتی ہے اسی وقت اس کے لئے دعا کر دیتا ہوں، کبھی کبھی آپ کی یاد بھی آتی ہے اور عادت کے مطابق آپ کے لئے بھی اسی وقت دعا کر دیتا ہوں۔

یہ سن کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں اس زمانے میں ایم۔اے کر چکا تھا اور یونیورسٹی میں ملازم تھا۔ سوچا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا تیر مارا، حالانکہ جو کچھ ہو رہا ہے نہ معلوم کن کن حضرات کی دعاؤں سے ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ اساتذہ میں مفت تقسیم کرنے کے لئے کچھ کتابیں دارالعلوم میں آئیں۔ جو کتابیں میرے حصہ میں آئیں ان میں ایک کتاب علم رمل سے متعلق بھی تھی

ناظم صاحب نے فرمایا: آپ اس کتاب کا کیا کریں گے؟ حضرت نے فرمایا: کسی عالم سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ وہ کسی کتاب کا کیا کرے گا۔ عالم کو نہ معلوم کس کتاب کی کس وقت ضرورت پیش آجائے۔

ایک روز فرمایا: جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا جو ڈھنگ مولانا مودودی کو آتا ہے ہمیں نہیں آتا۔ لیکن جب وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں تو ان کی صحیح اسلامی تربیت کا جو ڈھنگ ہمیں آتا ہے انہیں نہیں آتا۔

ایک روز فرمایا: دیو بند کے دو حضرات جب حج سے واپس آئے تو ہم ملنے گئے۔ مزاج پرسی پر ایک صاحب حج کی کلفتوں اور بدوؤں کی طرف سے پہنچی ہوئی تکلیفوں کا دکھڑا سنانے لگے۔ دوسرے صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے تمام تر اللہ کی رحمتوں اور نوازشوں کا ذکر کیا۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو بدوؤں سے تکلیفیں نہیں پہنچیں؟ جواب دیا: جب محبوب کے دروازے پر جاتے ہیں تو دربانوں کی جھڑکیاں تو سننی پڑتی ہیں، ان کا کیا ذکر۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کے انتقال پر میں بھی دارالعلوم پہنچا۔ آخری دیدار کے لئے لائن بڑی لمبی اور سخت گرمی تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے مسجد میں جا کر حضرت کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے تلاوت میں مشغول ہو گیا۔ تلاوت کے بعد مراقبے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ربودگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ دیکھا کہ کوئی صاحب مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ کیا تم نے "سورۃ النورین" دیکھی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ کہا کہ یہ ہے۔ انہوں نے کتاب کھولی۔ کتاب ایسی تھی جیسے مہاجنوں کی بہی، کہ لمبی زیادہ چوڑی کم۔ میں نے کہا، لاؤ میں پڑھوں۔ انہوں نے کہا کہ تم کیسے پڑھو گے یہ تو مرہٹی زبان میں لکھی ہوئی ہے، میں سناتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ وہ سورۃ ایک صفحے کے نصف سے شروع ہو کر سامنے کے صفحے کے نصف سے کچھ زیادہ پر ختم ہوتی تھی۔

اس کے بعد یہ منظر دیکھا کہ ایک وسیع خوبصورت کمرہ ہے اس میں کافی اونچی ایک مسہری بچھی ہے۔ سرہانے اونچا سا ایک گاؤ تکیہ ہے اور حضرت مفتی صاحب سبز عمامہ باندھے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز ہیں اور پیروں پر ایک ریشمی لحاف (غالباً سبز رنگ کا) پڑا ہے۔ اور اسی حال میں یہ الفاظ (بعینہٖ) میری زبان پر آئے " **علی سرر متکئین** "۔

مراقبے سے فارغ ہو کر جس میں زیادہ دیر نہ لگی تھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا آخری دیدار کیا۔ وہ نورانی صورت آج بھی نظروں میں بسی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا منتخب الحق صاحب مرحوم

استاد گرامی حضرت مولانا منتخب الحق صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے تعارف کی ابتدا ٹونک میں ہوئی جب کہ مولانا مدرسہ خلیلیہ میں صدر مدرس تھے اور میں فراغت کے بعد معاش کی تلاش میں ٹونک پہنچا تھا اور محکمہ۔ شرعیہ میں مفتی کی حیثیت سے ملازمت کا امیدوار تھا۔

مولانا کی شاگردی کی باقاعدہ سعادت تو اس وقت حاصل ہوئی جب میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ لیکن ٹونک کے قیام کے دوران بھی مولانا کے مسلم الثبوت کے درس میں چند روز شریک ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو قوی حافظہ اور اس سے زیادہ ثاقب ذہن عطا فرمایا تھا۔ عالمانہ فضل و کمال کے ساتھ شعر و ادب کا ذوق بھی بہت بلند تھا۔ اسی لئے ٹونک کے شعراء اور خاص طور پر بسمل صاحب اور صولت صاحب عرف کلّو میاں، جو ٹونک کے معروف شعراء میں سے تھے، مستقلاً مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ دونوں کے درمیان دوستی کے ساتھ ساتھ معاصرانہ چشمک بھی تھی۔

ایک مرتبہ بسمل صاحب نے مولانا کو اپنا یہ قطعہ سنایا:

ساقی وہ تیرے میکدے والے کہاں گئے
وہ شال وہ ردا وہ دوشالے کہاں گئے

رکھا ہے آبخوروں میں پانی بھرا ہوا
جن میں شراب تھی وہ پیالے کہاں گئے

کلّو میاں کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ برجستہ کہا:

ساقی وہ تیرے - - - - - - - - - - -

وہ شال - - - - - - - - - - -

بہنوئی بننے والا مصیبت میں اب نہیں

وہ عیش کے زمانے کے سالے کہاں گئے

مولانا کی علمی نسبت خیر آبادی خاندان سے تھی اور اسی مناسبت سے ان پر منطق، قدیم فلسفہ، علم کلام اور اصول فقہ کا غلبہ تھا۔ اصول فقہ کی حد تک میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے زمانے میں اس فن کے امام تھے، ویسے تفسیر، حدیث، نحو وصرف، معانی وبیان، جس فن پر بھی گفتگو کرتے تھے اس رسوخ اور بصیرت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے گویا یہی ان کا خاص فن ہے۔

گفتگو کے دوران ان کی آنکھوں کی حرکت بتاتی تھی کہ مولانا اپنی زبان سے نہیں دماغ سے بول رہے ہیں۔ ہر گفتگو، خواہ وہ نجی مجلس میں ہو یا حلقہ درس میں یا کسی پبلک جلسہ میں، انتہائی مربوط اور بلیغ ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تقریر نہیں تحریر ہے اور تحریر بھی ایسی جس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں۔ اسی لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے سامنے ایک مرتبہ فرمایا "مولانا منتخب الحق تو متن بولتے ہیں۔"

تقشف کو ان سے کوئی مناسبت نہ تھی، بہت زندہ دل اور بے تکلف انسان تھے۔ طلبہ سے بھی اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے دوستوں سے باتیں کر رہے ہوں۔

مولانا کو مطالعے کا بے انتہا شوق تھا اور مطالعہ کرتے تھے تو کتاب میں غرق ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ میں نے اتنی کتابیں پڑھیں ہیں کہ تم نے سنی بھی نہ ہوں گی۔ اور یہ بات بالکل درست ہے۔

کراچی پہنچنے کے بعد مولانا ہی مجھے لے کر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے

پاس پہنچے اور ان ہی کے توسط سے پاکستان میں پہلی ملازمت کا آغاز ہوا۔ ان دنوں مولانا اردو کالج میں پروفیسر تھے، پھر کراچی یونیورسٹی میں لے لئے گئے۔

میں دار العلوم سے ایس۔ ایم۔ کالج منتقل ہوا اور اسی دوران ایم۔ اے کر لینے کے بعد میرا تقرر سندھ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ سندھ یونیورسٹی میں ایک سال ہی گذرا تھا کہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں، جس کے صدر مولانا خود تھے، لکچرر شپ کی آسامی خالی ہوئی۔ میں نے درخواست دی اور انٹرویو کے لئے کراچی پہنچا۔ غرۃ یہ تھا کہ صدر شعبہ تو میرے استاد ہیں، میرے تقرر کو کون روک سکتا ہے۔ انٹرویو سے قبل مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمایا: مولانا رشید ارشد صاحب شعبہ عربی میں پریشان ہیں اور تم سندھ یونیورسٹی میں مطمئن ہو۔ لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس مرتبہ مولانا ارشد کو لیں گے، پھر کسی اور موقع پر تمہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا: "جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"۔ میں نے عرض کیا: پھر آپ فرمائیں تو میں انٹرویو میں شرکت نہ کروں۔ فرمایا: جب آئے ہو تو انٹرویو میں شریک ہو جاؤ۔ میں واپس چلا آیا لیکن پریشان تھا کہ میرے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ میں جب بھی ملازمت لے لئے کسی انٹرویو میں شریک ہوا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ناکامی کا منہ دیکھا ہو۔ بہر حال انٹرویو ہوا اور انٹرویو ختم کر کے باہر نکلتے ہی مولانا نے فرمایا کہ تمہیں لے لیا گیا اور ارشد صاحب رہ گئے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اگر مولانا یہ فرما دیتے کہ تم انٹرویو میں شرکت نہ کرو تو میں یقیناً شرکت نہ کرتا اس لئے کہ مولانا ارشد صاحب میرے استاد تھے اور میرے علم میں تھا کہ وہ شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم کے طرز عمل سے پریشان بھی تھے۔

بہر حال شاگردی کے بعد ایک ہی شعبہ میں مولانا کے ساتھ کام کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ شعبہ اسلامیات میں میرے تقرر کے بعد مولانا کے اور خود میرے دماغ پر بھی مولانا ارشد صاحب کی پریشانی مسلسل چھائی رہی۔ شعبہ میں کام

کرتے ہوئے شاید دو سال ہی گذرے ہوں گے کہ ایک روز میں نے مولانا سے عرض کیا کہ اگر آپ فرمائیں تو میں ڈاکٹر یوسف صاحب سے بات کروں کہ وہ ارشد صاحب کے شعبہ اسلامیات میں منتقل ہونے پر آمادہ ہو جائیں۔ مولانا کے علم میں تھا کہ ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم مجھ پر بہت شفیق تھے اور میرا شمار ان کے چہیتے شاگردوں میں تھا، اجازت دے دی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ مجھے شعبہ عربی میں لے لیں اور ارشد صاحب کو میری جگہ شعبہ اسلامیات میں جانے کی اجازت دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب آمادہ ہو گئے۔ میں یہ خوشخبری سنانے مولانا کے مکان پر پہنچا۔ مولانا سے عرض کیا تو فرمایا: میں تمہاری قیمت پر ارشد صاحب کو لینے کے لئے کسی صورت تیار نہیں۔ تمہارے رہتے ہوئے اگر وہ شعبہ میں آسکتے ہیں تو آجائیں اور اگر تمہیں جانا ہی ہے تو استعفاء دے کر چلے جاؤ۔ ارشد صاحب کے لئے بہتری کی جو صورت پیدا ہوئی تھی اس کے ختم ہونے، اپنی بات جانے اور ڈاکٹر یوسف صاحب کے سامنے شرمندہ ہونے کے خیال سے مجھے اتنا غم ہوا کہ آنسو نکل آئے۔ میں نے کہا: مولانا! جب تک باپ زندہ تھے اتنی بات میرے استعفاء دینے کے لئے کافی ہوتی تھی، اب جا کر بچوں سے پوچھتا ہوں کہ کتنے دن فاقہ برداشت کر سکتے ہو، اس کے بعد جواب دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھی بلند ہو گئی۔ مولانا نے فوراً اٹھ کر دروازے بند کئے اور فرمایا: جو کچھ کہنا چاہتے ہوں دل کھول کر کہہ لو۔ میں نے بھی جی بھر کر بھڑاس نکالی۔

بالآخر نتیجہ وہی "ڈھاک کے تین پات" ہوا۔ کہ میں اور مولانا ارشد صاحب دونوں اپنی اپنی جگہ رہے۔ مولانا ارشد صاحب کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ مولانا سے کبیدہ خاطر ہو گئے، اور میری طرف سے ان کے دل میں ایم۔اے کی فیرویل پارٹی کے بعد سے جو تکدّر تھا وہ بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے مولانا ارشد صاحب مجھے اپنے لائق ترین شاگردوں میں سے شمار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

شعبہ اسلامیات میں ملازمت کے دوران میں نے پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا اور

ڈائریکٹر مولانا کو بنایا۔ حکیم ترمذی کی "کتاب شان الصلوۃ" کو ایڈٹ کرنا طے پایا، جس کی ضخامت شاید سو صفحات سے بھی کم تھی۔ ایک روز مولانا نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں تمہارے چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میں نے کہا: مولانا! ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیا میں مرنے کے بعد اللہ کو دکھانے کے لئے لینا چاہتا ہوں۔ فرمایا: اچھا آپ جلد از جلد پروفیسر بننا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: پروفیسر بنوں یا نہ بنوں، لیکن جلد از جلد ڈاکٹر ضرور بننا چاہتا ہوں۔ خاموش ہو گئے۔ مولانا کو ڈائریکٹر بنانا دراصل اتمامِ حجت کے لئے تھا، ورنہ میں جانتا تھا کہ مولانا کو صرف مطالعے سے دلچسپی ہے، تصنیف و تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو لوگ مجھ سے پہلے سے مولانا کے زیر نگرانی پی ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھ رہے تھے انہیں اپنی تحریریں دکھانے کے لئے مولانا بڑی مشکل سے اور بڑی خوشامدوں کے بعد وقت دیا کرتے تھے۔

اقبالیات کے ماہر مولانا یوسف سلیم چشتی مرحوم نے خود مجھ سے فرمایا کہ مجھ جیسا شخص ہی تھا جو مولانا منتخب الحق صاحب سے اگلوا سکا۔ مولانا چشتی ایک زمانے میں مولانا سے اقبال کے اشعار کا مطلب سمجھا کرتے تھے اور کئی کئی چکر کاٹنے کے بعد مولانا انہیں مشکل ہی سے وقت دیتے تھے، وہ بھی اس طرح کہ ایک گھنٹے کی نشست میں کام کی باتوں پر صرف پندرہ منٹ صرف ہوں۔

بہر حال میں نے اتمامِ حجت کے بعد ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب مرحوم کو اپنا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ موضوع وہ تھا جو بعد میں "اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم باتوں کے بجائے کام کے دھنی تھے۔ تصنیف و تالیف سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ چونکہ خود پی ایچ۔ ڈی اور کئی کتابوں اور مضامین کے مؤلف تھے، اس لئے تحقیق کی تکنیک تو جانتے تھے لیکن اصولِ فقہ سے انہیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اصولِ فقہ کے مسائل میں جہاں مجھے دشواری پیش آتی تھی، مولانا منتخب الحق صاحب کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ مولانا اور ڈاکٹر صاحب کے

درمیان عداوت کی حد تک تنافر تھا۔ لیکن مولانا کی عالی ظرفی دیکھی کہ جب بھی ان کی طرف رجوع کیا، کبھی پیشانی پر بل بھی نہ آیا، نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے مسئلے پر تقریر کی اور گتھیوں کو سلجھایا۔ پی ایچ۔ ڈی کا طالب علم جو دیوبند کا فارغ التحصیل بھی ہو اور خود مدرس بھی، وہ دقیق مسائل کے سوا کسی پیش پا افتادہ مسئلے میں نہیں الجھ سکتا۔ لیکن حیرت ہوتی تھی کہ جب بھی کسی دقیق مسئلے میں مولانا کی طرف رجوع کیا موصوف نے فوری طور پر اسے حل کر دیا، جیسے ابھی اسی مسئلے کو دیکھ کر آئے ہوں۔ ہر مسئلے میں ان کے ذہن کو بالکل صاف پایا اور تفہیم میں مولانا کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ اصول فقہ کا دقیق سے دقیق مسئلہ ہو، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کا جواب دینے میں کچھ سوچنا پڑا ہو۔ صرف ایک بار "مناسبت" کے مسئلے میں فرمایا کہ اس میں ہمارا ذہن صاف نہیں، جو کچھ ہماری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے۔ مجھے مولانا کے اس جواب پر کوئی تعجب نہ ہوا، اس لئے کہ "مسلم الثبوت" کے مصنف تک کو اس موقع پر یہ لکھنا پڑا کہ "قوم کا کلام اس مسئلہ میں واضح نہیں، جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے۔"

ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم ڈائریکٹر تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر مولانا کی رہنمائی مجھے میسر نہ آتی تو مقالے کی تکمیل میرے لئے آسان نہ تھی اور اسی لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے مقالے کے ڈائریکٹر بظاہر ایک تھے اور حقیقتہً دو۔

مولانا کو اصولِ فقہ میں اتنا کمال حاصل تھا اور اس فن کا انہیں اتنا استحضار تھا کہ اگر زبانی بول دیں تو اصول فقہ کی ایک بہترین کتاب تیار ہو جائے۔ لیکن قلم پکڑنا تو کجا، مولانا کو شاید اس سے بھی بیر تھا کہ کوئی شخص ان کی تقریر کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔

حکیم نصیر الدین صاحب جو مولانا سے عمر میں بڑے اور مولانا کے استاد مولانا معین الدین صاحب اجمیری کے بھتیجے ہیں اور اسی تعلق سے مولانا سے محبت بھی بہت کرتے تھے اور مولانا کی لاپروائی پر محبت بھری گالیاں بھی بہت دیتے تھے۔ انہوں نے کئی

بار اپنے گھر پر مولانا کے اصولِ فقہ کے درس کا اہتمام کیا۔ مولانا ماہر القادری مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مرحوم بھی شریکِ درس ہوتے تھے۔ ایک بار حکیم صاحب نے ٹیپ ریکارڈر بھی خرید لیا کہ مولانا کی تقریریں ریکارڈ ہو جائیں، لیکن ہمیشہ یہی ہوا کہ دو چار درس بڑے زور شور سے ہوئے اور اس کے بعد سامعین منتظر ہیں اور مولانا کا کہیں پتہ نہیں۔

ایک مرتبہ جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشید احمد صاحب نے مولانا سراج احمد صاحب کو ڈھائی سو روپے ماہوار پر اس کام کے لئے مقرر کیا کہ مولانا کے گھر جایا کریں اور اصولِ فقہ کے سلسلے میں جو کچھ وہ فرمائیں اسے ضبط کر لیا کریں۔ لیکن مولانا نے انہیں کبھی وقت نہ دیا۔

پی ایچ۔ ڈی ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ میں نے بڑی دردمندی سے کہا کہ مولانا میں اس خدمت کے لئے تیار ہوں کہ آپ جو کچھ زبانی فرمائیں میں اسے قلمبند کرتا جاؤں۔ حوالے میں بعد میں دے دوں گا اور اس طرح اصولِ فقہ کی ایک اچھی اور مستند کتاب تیار ہو جائے گی۔ فرمایا: آپ کو کیا تکلیف دوں، میں انشاء اللہ رشیدہ (ان کی بیٹی) کو بٹھا کر لکھوانا شروع کرتا ہوں۔ چنانچہ واقعتہً رشیدہ سے لکھوانا شروع کر دیا اور استحسان پر تقریباً پندرہ صفحات لکھوائے۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ جو کچھ میں نے لکھوایا ہے اسے آکر سنو۔ میں حاضر ہوا تو خود ہی پڑھ کر سنایا۔ یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں کہ مولانا نے کیا کچھ لکھوایا ہوگا البتہ پورا مضمون سن کر میں نے عرض کیا کہ مولانا! اتنی تفصیل سے کام نہ لیجئے ورنہ کتاب پوری نہ ہو گی۔ فرمایا: نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ کتاب پوری کریں گے۔ نہ معلوم یہ میری کالی زبان تھی یا مولانا کی قدیم عادت کہ وہ مضمون وہیں تک محدود رہا، ایک لفظ بھی آگے نہ لکھوایا گیا۔

تدریس میں مولانا کی توجہ کتاب کی طرف کم اور فن کی طرف زیادہ ہوتی تھی۔ فن بھی اس تفصیل سے سمجھاتے تھے کہ جو کچھ ان کے حافظے میں ہے پورا کا پورا طالب

علم کے ذہن میں انڈیل دینا چاہتے تھے۔ نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کورس کبھی ختم نہ ہوتا تھا، الا ماشاء اللہ۔

مولانا نے ایم۔اے فائنل کے کورس میں اصولِ فقہ کا ایک مستقل پرچہ رکھا ہوا تھا، جس کی تدریس مولانا کی صدارت سے سبکدوشی اور میرے صدر شعبہ ہو جانے کے بعد میرے حصہ میں آئی تھی۔ میں نے ایک دن مولانا سے عرض کیا کہ میرے خیال میں اصولِ فقہ ایک بیکار فن ہے کہ غیر مجتہد کو مجتہد نہیں بناتا اور مجتہد کو اس کی ضرورت نہیں، بلکہ مجتہدین کے طرق استنباط ہی کی روشنی میں یہ فن مرتب ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کی مثال فن عروض کی طرح ہے کہ غیر شاعر کو شاعر نہیں بناتا اور شاعر کو اس کی ضرورت نہیں۔

من ندا نم فاعلاتن فاعلات

شعر میگویم بہ از آبِ حیات

میری بات سن کر مولانا خاموش ہو گئے۔

کراچی یونیورسٹی میں جب شعبوں کی صدارت کے لئے روٹیشن (ROTATION) کا نظام نافذ ہوا تو مولانا کے بعد چونکہ میں سب سے سینیئر تھا اس لئے دو سال کی بچہ سقائی میرے حصہ میں آئی۔ مولانا کو یہ اندیشہ ہوا (اور یہ اندیشہ ان کے ایک اشارے سے ظاہر بھی ہوا) کہ کہیں یہ اصولِ فقہ کے پرچے کو نصاب سے خارج نہ کر دے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا آپ مطمئن رہیں، میرا خیال اپنی جگہ ہے لیکن جو نظام آپ کے زمانے سے چلا آرہا ہے، میں اس میں کوئی تبدیلی نہ کروں گا۔

جب سعودی عربیہ کی جامعہ ملک عبدالعزیز شاخ مکہ میں میرا تقرر ہوا (جو اب جامعہ ام القریٰ ہے) تو اصولِ فقہ کے مخطوطات ایڈٹ کرنے کی خدمت ہی میرے نصیب میں آئی۔ پہلے سال ہی تعطیلات میں جب میں کراچی پہنچا تو مولانا نے فرمایا: دیکھئے آپ تو اصولِ فقہ کو ایک بیکار فن سمجھتے تھے اور اللہ نے آپ کی روزی ہی اس فن

کی خدمت میں مقرر کی ہے۔

میں جس زمانے میں ایس۔ ایم۔ کالج میں ملازم تھا ایک مرتبہ بس میں مولانا کے ساتھ ان کے گھر، بہار کالونی جمشید روڈ جا رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ لے لیا۔ فرمایا کہ میں ایک بار اپنے چچا کے ساتھ بس ہی میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ لیا تو چچا نے فرمایا: بڑے جب ساتھ ہوں تو چھوٹے ٹکٹ نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد مولانا کے ساتھ سفر کرتے ہوئے میں نے کبھی ٹکٹ نہیں لیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ تمہیں مجلس میں بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ انکساری نہیں، سو فیصد حقیقت ہے کہ مولانا کی یہ رائے بالکل درست ہے۔ آج تک یہ کیفیت ہے کہ بسا اوقات مجلس ختم ہونے کے بعد پچھتاتا ہوں کہ میں نے مجلس میں یہ بات کیوں کہی۔

بس کے اسی سفر میں، میں نے گرومندر کے قریب مولانا سے کہا: مولانا! اللہ شاہد ہے کہ میں نے آپ کے لئے بارہا نمازوں کے بعد دعا کی ہے کہ اللہ نے آپ کو جیسا علم عطا فرمایا ہے، ویسا ہی عمل بھی عطا فرمائے۔ مولانا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ بات ہی ایسی تھی اور یہ خود علامت ہے اس بات کی کہ مجھے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد فرمایا: آپ کس سے بیعت ہیں؟ میں نے جواب دیا: شاہ زوار حسین صاحب سے۔ فرمایا: اس مرتبہ جب وہ تشریف لائیں تو مجھ سے ملاقات کرائیے۔

حضرت شاہ صاحب جب کراچی تشریف لائے تو میں نے سوچا کہ ایک استاد ہیں دوسرے پیر، کس کو کس کے پاس لے جاؤں پھر یہ صورت اختیار کی کہ دونوں کو سندھ مدرسے میں اپنے مکان پر ناشتے پر مدعو کر لیا۔ ناشتے کے بعد میں انوجیلیشن کے لئے چلا گیا۔ ان دنوں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ دوپہر کو واپس آیا تو دونوں حضرات تشریف فرما تھے۔ بیوی نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں پھر دوسری شفٹ کے انوجیلیشن کے لئے چلا گیا۔ عصر کے وقت واپس آیا تو دیکھا دونوں حضرات

اب بھی محو گفتگو ہیں۔ چائے پی، اس کے بعد دونوں حضرات رخصت ہوئے۔

بعد میں حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے بتایا کہ اسی مجلس میں مولانا منتخب الحق صاحب نے حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ لیکن شاید یہ بیعت وقتی تاثر کا نتیجہ تھا، کیونکہ شاہ صاحب سے مولانا کا تعلق استوار نہ رہا۔

مولانا مشکل ہی سے کسی دوسرے کے علم کا لوہا مانتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان جیسے صاحبِ فضل و کمال مجھے کم ہی نظر آئے۔ البتہ مولانا عبدالعزیز میمن مرحوم کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میں نے خود مولانا کی زبان سے سنا ہے کہ مولانا میمن تو سلطان العلماء ہیں۔

یہ بات مجھ سے خود مولانا نے بیان کی کہ ان سے مولانا میمن نے فرمایا: دیکھو منتخب الحق، تم میرے بڑے بیٹے کی عمر کے ہو۔ میرے دماغ میں بہت کچرا بھرا ہے۔ اگر تم اس کچرے ہی کو سمیٹ لو تو اچھا خاصا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ تیار ہو جائے۔ میں تمہیں دمشق سے یا کسی اور عرب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلا دوں گا۔ لیکن مولانا کو تو تصنیف و تالیف سے گویا چڑ سی تھی۔ بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ میمن صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف تو ایک طرف لیکن مولانا اس عمر میں خود اپنے فضل و کمال کے ساتھ ان کی شاگردی اختیار کر لیں، یہ بھی مولانا کو گوارا نہ ہو گا، کیونکہ جہاں تک عربی ادب کا تعلق ہے برصغیر پاک و ہند میں میمن صاحب کا کوئی ثانی نہ تھا، لیکن دوسرے علوم میں مولانا ان سے کہیں فائق تھے۔

مولانا منتخب الحق صاحب کا خط بھی بڑا پاکیزہ تھا۔ میں نے انہی کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان کے خطِ شکست کی کافی عرصہ تک مشق کی ہے پھر بھی ان جیسی بات پیدا نہ کر سکا۔

مولانا نے فرمایا کہ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت ابراہیم نخعی کو خواب میں

دیکھا۔ حضرت نخعی نے ان کے استاد مولانا معین الدین صاحب سے فرمایا: میں نے اس لڑکے کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ فرمایا: صحابہ میں سے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو خواب میں دیکھا ہے، ان کے سوا کسی صحابی کو خواب میں نہیں دیکھا اور نہ کبھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ایک مرتبہ مولانا نے گم شدہ چیز کے لئے ایک دستک کا عمل بتایا۔ عمل حسب ذیل ہے:

شیخ محمود پشمینہ پوش کشکینہ خوار
دستک شصت پیادہ و ہفتاد سوار

فلاں چیز گم شدہ راز ود بیار زود بیار زود بیار

تیسری بار جب "زود بیار" کہا جائے تو دونوں ہاتھوں سے تین بار تالی بجائی جائے۔ پہلی بار زور سے تالی بجی تو جلد، دوسری بار زور سے بجی تو تاخیر سے، اور تیسری بار زور سے بجی تو زیادہ تاخیر سے چیز ملے گی۔

ایک مرتبہ سانپ بچھو سے حفاظت کے لئے حسب ذیل دستک بتائی:

شلی شل پائی شل دستی شل دم
از اول شب بخسپ تا صبح بجب
بستم دہن مار و نیش کژدم
درود بر روح نبی گفتم رستم

دستک دے کر سو جائے، صبح تک حفاظت رہے گی۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ کسی بزرگ نے امام محمد کو خواب میں دیکھا اور ان سے ان کی نزع کی کیفیت دریافت کی۔ فرمایا کہ مجھے تو پتہ بھی نہ چلا، کیونکہ میں اس وقت "رمی جمار" کے مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ (یہ بھی خوب ہے کہ موت کا وقت اور شیطان کو کنکریاں مارنے کے مسئلے پر غور و فکر)۔

میں نے دریافت کیا کہ امام محمد کی تو یہ کیفیت اور حضورؒ کو نزع کے وقت تکلیف ہوئی۔ فرمایا کہ حضورؒ تمام مقامات طے کر چکے تھے اور امام محمد درمیان میں تھے ایک دائرہ فرض کرو، تو ایک شخص جس نقطے سے چلا تھا اگر پورا دائرہ طے کر کے اسی نقطے پر پہنچ گیا تو اس کی تمام کیفیات وہی ہوں گی جو مبتدی کی ہوتی ہیں اور جو درمیان میں ہو اس کی کیفیات مختلف ہوں گی۔

فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ میرے استاد مولانا معین الدین آگے ہیں اور میں اور مولانا یونس (مولانا کے پرانے شاگرد) ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ راستہ نہ تھا لیکن چلے تو راستہ بن گیا۔ وہ راستہ سمندر پر جا کر ختم ہوا۔ مولانا نے فرمایا کہ چلو، اور یہ کہہ کر سمندر میں پیر رکھا۔ ہم نے بھی پیروی کی۔ دیکھا تو دوسرا قدم دوسرے کنارے پر تھا۔ راستہ وہاں بھی نہ تھا، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کسی نے بنا بنایا راستہ زمین پر رکھ دیا۔ اب صرف میں اور مولانا تھے۔ ایک مکان کے قریب پہنچے، باہر جوتے تھے اور اندر سے آوازیں آرہی تھیں۔ مولانا نے مجھے باہر بٹھایا اور خود اندر گئے۔ اندر کسی نے مولانا سے پوچھا کہ وہ لڑکا کہاں ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ حضور وہ باہر ہے، میں اسی لئے اندر آیا ہوں کہ اگر اجازت ہو تو اسے اندر لے آؤں۔ چنانچہ اجازت ہو گئی۔ اور یہ باتیں میں باہر سے سن رہا تھا۔ مولانا باہر آکر مجھے اندر لے گئے۔ دیکھا کہ وہاں حضرت ابراھیم نخعی تشریف فرما ہیں۔ میں بیٹھا تو حضرت نخعی نے مولانا کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے اس لڑکے کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ میں نے مولانا کے اشارے پر سلام کیا اور حضرت نخعی کی دست بوسی کی۔ جب یہ خواب میں نے مولانا سے ذکر کیا تو انہوں نے میری پیشانی چومی اور فرمایا کہ تمہارے طفیل میری بھی اس دربار تک رسائی ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ حضور یہ سب آپ ہی کا طفیل ہے۔

فرمایا کہ گورکھپور کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو وعظ ہوتا تھا۔ میں نے خواب

میں دیکھا کہ یہ اعلان کیا گیا کہ آج بعد نماز جمعہ بہت بڑے عالم وعظ فرمائیں گے۔ ہم بھی ٹھیرے۔ دیکھا کہ بہت اونچا منبر لگایا ہے۔ مولانا جمیل احمد صاحب اس کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ منبر پر چڑھو۔ چنانچہ میں حکم کے مطابق بالکل اوپر تک چڑھ گیا اور نہایت بہترین وعظ کیا۔ اس کے بعد مولانا نے مجھے ایک چھتری دی۔ اس خواب کے بعد مجھے تعین ہو گیا کہ میں اپنی تدریسی زندگی میں عروج پر ضرور پہنچوں گا۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ واقعتہً اللہ نے آپ کو عروج بخشا کہ قدیم اور جدید دونوں قسم کی درسگاہوں میں اعلیٰ مدارج تک پہنچے (قدیم عربی مدارس میں صدر مدرس رہے اور کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر اور ڈین)۔

فرمایا کہ مولانا معین الدین کے وصال کے بعد خواب دیکھا کہ نہایت عالی شان مکان ہے اور اس کے گرد نہایت خوبصورت باغ ہے۔ میں باغ میں ہوں کہ ایک کمرے سے مولانا نکل کر آئے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کا ہے، اسی لئے تو مجھے یہاں یگانگت محسوس ہوئی۔ مجھے باغ کی سیر کرائی اور رخصت کرتے وقت کمر بند سے کھول کر دو چابیاں دیں۔ شاہد علی صاحب نے اس خواب کی تعبیر یہ دی کہ دونوں چابیاں علم منقول اور علم معقول ہیں۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ علم معقول میں تو مولانا منتخب الحق صاحب اپنے وقت کے امام تھے ہی، علم منقول میں بھی مولانا کو یہ مقام حاصل تھا کہ تمام منقول علوم کے ساتھ ساتھ بخاری اور ترمذی کا برسوں درس دیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو آخرت میں بھی اپنی رحمتوں سے نوازے اور جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب

میرے استاد حضرت مولانا محمود الحسن صاحب گیاوی، رحمتہ اللہ علیہ، سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس میں پچاس روپے ماہوار پر صدر مدرس مقرر ہوئے تھے۔ باذوق انسان تھے، مٹھائی اور پان کا بہت شوق تھا۔ عمامہ بہت اچھا باندھتے تھے۔ میں نے عمامہ باندھنا ان سے اور ان کے بھائیوں سے ہی سیکھا۔

موصوف کو تقریر کا اچھا سلیقہ تھا۔ ایک مرتبہ ربیع الاول میں سرونج کی جامع مسجد میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر جو تقریر کی اس کا مرکزی مضمون مجھے اب تک یاد ہے۔ فرمایا تھا کہ کھلے میدان میں جب کوئی بڑا جلسہ کیا جاتا ہے تو پنڈال بنایا جاتا ہے، فرش اور کرسیاں بچھائی جاتی ہیں، ڈائس تیار کیا جاتا ہے، جلسہ گاہ کو سجایا جاتا ہے، کام کرنے والے کام کرتے ہیں اور منتظمین ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ آخر میں اونچے درجے کے منتظمین آکر معائنہ کرتے ہیں کہ تمام کام اطمینان بخش ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر لوگ جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور سب سے آخر میں جلسے کے مہمان خصوصی کو لایا جاتا ہے۔

اس کائنات کے مہمان خصوصی کے ساتھ بھی یہی اہتمام کیا گیا کہ زمین کا فرش بچھایا گیا، آسمان کا پنڈال بنایا گیا، پھر اسے ممکن حد تک آراستہ کیا گیا، مختلف انبیاء علیہم السلام آئے اور مناسب انتظامات کرتے گئے اور مہمان خصوصی سید البشر اشرف الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء کے آخر میں مبعوث فرمایا گیا اور آپ کے بعد اس جلسے کو برخاست ہی ہونا ہے۔ جس کی مدت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

حضرت قاری سید فصیح احمد صاحب

میرے استاد حضرت قاری سید فصیح احمد صاحب مونگری، رحمتہ اللہ علیہ، سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس میں پچاس روپے ماہوار پر نائب صدر مدرس بن کر تشریف لائے تھے۔ باذوق اور خوش اخلاق بزرگ تھے، لیکن تدریس اور دین کے معاملات میں ان کے مزاج میں بڑا تشدد تھا۔ کبڈی کھیلتے ہوئے یا شکار یا دوسرے تفریحی مواقع پر وہ طلبہ کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو جاتے تھے کہ استاد اور شاگرد کا فرق مٹ سا جاتا تھا، لیکن تدریس کے وقت بالکل شیر اور بکریوں کی مثال صادق آتی تھی۔ دین کے خلاف ادنیٰ سی بات بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی اور تہجد کے وقت ذکر جہر کی آواز ہم نیچے سنا کرتے تھے (قاری صاحب کی رہائش پہلی منزل پر تھی)۔

میرے اساتذہ کی طویل فہرست میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد یہی ایک استاد ہیں جو بڑی حد تک اس شعر کا مصداق تھے:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا (شیشے کا) جام ہے اور دوسرے میں عشق کی سندان، ہر ہوسناک (بیک وقت) جام اور سندان سے کھیلنا نہیں جانتا)۔ (سندان زمین میں گڑے ہوئے اس لوہے کو کہتے ہیں جس پر رکھ کر لوہار گرم لوہے کو کوٹتا ہے)۔

ان کی تدریس کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں یا حکیم محمد صدیق (دو ہی ہم جماعت تھے) عبارت پڑھتے اور اعراب کی کوئی غلطی ہو جاتی تو ہمیں یہ کہہ کر اٹھا دیا کرتے تھے کہ مطالعہ کر کے آؤ۔ دوبارہ غلطی ہوتی تو دوبارہ اٹھا دیتے، اور اگر تیسری بار بھی غلطی ہوتی تو چھڑی کو کام میں لاتے ہوئے غلطی پر متنبہ فرماتے۔ قاری صاحب کی

اس سختی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں عربی کی عبارت صحیح پڑھنا آ گئی اور اس کی وجہ سے ہم دونوں دارالعلوم دیو بند میں بھی نیک نام رہے۔

فقہ کی پہلی کتاب "نور الایضاح" شروع ہوئی تو اس وقت ہم دونوں جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔ جب حیض کا بیان آیا تو ہم دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، قاری صاحب نے کتاب بند کی، چاقو نکال کر مجھے دیا کہ کھجور کی دو چھڑیاں کاٹ کر لاؤ۔ (مدرسے کے باغیچے میں کھجور کے متعدد درخت تھے) ایک ایک چھڑی ہم دونوں پر توڑی اور فرمایا کہ میرا اور تمہارا مذاق کا رشتہ تو نہیں، اور اس طرح کی باتیں تو فقہ کی ہر کتاب میں آئیں گی۔ تمہیں دین سیکھنا ہے یا لذت لینا ہے؟

قاری صاحب کی اس تنبیہ نے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، ہمیشہ کے لئے عبرت دلا دی جس نے مجھے خود اپنی تدریسی زندگی میں بھی بڑا کام دیا۔

قاری صاحب نے طلبہ کی دینی تربیت کس طرح فرمائی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ایک مرتبہ مدرسے کی مسجد میں، جس میں مولانا محمود الحسن صاحب امامت فرماتے تھے، عصر کی نماز ہنوز ختم نہ ہوئی تھی کہ قاری صاحب کنگران کی مسجد سے، جس کے وہ امام تھے، عصر کی نماز پڑھ کر مدرسہ آ گئے۔ دیکھا کہ چند طلبہ سلام پھیرے جانے کے بعد اپنی باقی ماندہ رکعات پوری کر رہے ہیں، جن میں راقم الحروف بھی تھا۔ جب ہم باہر نکلے تو ایسے تمام طلبہ کو جمع کیا، کھجور کی چھڑیاں کٹوا کر منگوائیں اور سب کو سزا دی۔ فرمایا کہ نماز سے پندرہ منٹ پہلے مدرسے کی چھٹی ہو جاتی ہے اس عرصہ میں تم کیا کرتے رہے، تمہاری تکبیر تحریمہ کیسے فوت ہوئی؟

ایک مرتبہ جمعہ کے روز میں اور چند طلبہ جُواری ندی پر مچھلیوں کے شکار کے لئے چلے گئے۔ جمعہ کی نماز فوت ہو گئی، شام کو واپس آئے۔ قاری صاحب کو معلوم ہوا تو کھجور کی چھڑیوں سے خوب تواضع کی اور فرمایا کہ جمعہ کا روز بلاشبہ تعطیل کا دن ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جمعہ کی نماز فوت ہو جائے۔

حیدرآباد آرمی میں ملازمت کے دوران جب میں پہلی بار رخصت پر سرونج آیا اور قاری صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو اوپر ہی سے کہلوا دیا کہ میں کسی اللہ کے نافرمان سے ملنا نہیں چاہتا۔ میں حیران ہو کر واپس آگیا۔ کنگران کی مسجد سے عصر کی نماز پڑھا کر جب قاری صاحب واپس مدرسہ تشریف لا رہے تھے تو میں سامنے آگیا، میں نے سلام کے بعد دریافت کیا کہ آپ نے میری کون سی اللہ کی نافرمانی دیکھی؟ فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ فوج میں ملازمت کے بعد تم نے ڈاڑھی کٹالی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میری ڈاڑھی جتنی اس وقت ہے، اس سے کم تو کبھی نہیں ہوئی۔ بس ناراضگی دور ہو گئی۔

یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں "مؤناتھ بھنجن" نام کی ایک بستی ہے۔ اس میں چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ حافظ محمود الحسن صاحب کی رہائش تھی۔ ان کے متعدد خلفا میں سے ایک صاحب تھے مولوی عبدالسمیع صاحب۔ قاری صاحب اور مولوی صاحب (مولانا محمود الحسن صاحب) دونوں انہی عبدالسمیع صاحب سے بیعت تھے۔

قاری صاحب کے نزدیک تصوف کا اصل معیار کیا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک روز معمول کے مطابق مغرب کے بعد سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی شریک تھا۔ قاری صاحب نے مولوی صاحب سے کھانے کے دوران کہا کہ ہمیں بیعت ہوئے اتنے دن ہو گئے لیکن اب تک کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: واہ! فائدہ کیوں محسوس نہیں ہوا۔ قلب میں ذکر اور نور محسوس ہوتا ہے، کیا یہ فائدہ نہیں؟ اس پر قاری صاحب کو جلال آگیا، فرمایا: اچھائیاں پیدا ہونا تو درکنار، جو اخلاقی برائیاں ہمارے اندر موجود تھیں وہ بدستور موجود ہیں، تو قلب کے اس نور اور ذکر کو لے کر کیا انسان چاٹے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب کے انتقال کے بعد قاری صاحب کو دادا پیر حافظ محمود الحسن صاحب سے خلافت ملی اور قاری صاحب کے بھی متعدد خلفاء ہوئے جن میں سے ایک حافظ عتیق اللہ خان صاحب مرحوم بھی تھے۔

مدرسہ ریاض المدارس اور بنو بھیا کے مکان کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی اور قاری صاحب مدرسے کی پہلی منزل کے جس حصہ میں رہتے تھے اس کے مقابل کے کمرے میں حبیب شاہ کی رہائش تھی۔ ایک مرتبہ رات کے بارہ بجے کے قریب قاری صاحب نے اپنے مکان سے اتر کر بنو بھیا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بنو بھیا نکلے تو پوچھا حبیب شاہ کے کمرے میں لے چلو۔ اوپر گئے تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ جب کھٹکھٹانے پر دروازہ نہ کھلا تو قاری صاحب نے کہا کہ دروازہ توڑ دو۔ اندر دیکھا تو حبیب شاہ بے ہوش پڑے تھے۔ قاری صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، وہ ہوش میں آگئے۔ قاری صاحب انہیں لے کر مدرسے میں آئے اور انہیں سمجھایا کہ اس طرح کے عمل کسی ماہر عامل کی اجازت اور اس کی نگرانی کے بغیر نہیں کرنے چاہییں۔

جب مجھے اس واقعہ کی اطلاع ملی تو میں نے حبیب شاہ سے اصل صورتِ حال دریافت کی۔ حبیب شاہ نے بتایا کہ میں ایک مقصد سے ایک جلالی عمل کر رہا تھا۔ حصار میں بیٹھ کر عمل پڑھتا تھا۔ انتالیس روز تو مختلف مناظر دیکھتے گذر گئے اور میں نے خوف نہ محسوس کیا، لیکن چالیسویں روز جو عمل کا آخری دن تھا، میں نے ایک دیو قامت وجود کو دیکھا جس کے ہاتھوں میں ایک بچہ تھا، اس نے دونوں ٹانگیں پکڑ کر بچے کو چیر دیا اور اس کی آلائش اور خون کے چھینٹے مجھے اپنے اوپر پڑتے ہوئے محسوس ہوئے اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے اس وقت ہوش آیا جب قاری صاحب نے آکر میرا ہاتھ پکڑا۔

قاری صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا معظم حسین کا بیان ہے کہ مرض الموت میں جب ڈاکٹروں نے خون چڑھانے کا مشورہ دیا تو قاری صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کوئی ایسا خون اپنے جسم میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ کسی نیک آدمی کا خون ہے یا کسی فاسق و فاجر کا۔ چنانچہ خون نہ لیا اور جان، جہاں آفریں کے سپرد کر دی، اللہ تعالیٰ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

خواجہ فضل علی صاحب مسکین پوری

اپنے دادا پیر حضرت فضل علی صاحب قریشی مسکین پوری کی زیارت مجھے نصیب نہیں ہوئی، لیکن اپنے بزرگوں سے ان کا ذکر اس کثرت سے سنا ہے کہ "شنیدہ" گویا "دیدہ" کی طرح معلوم ہوتا ہے، اسی لئے ذیل میں ان کے کچھ واقعات ذکر کر رہا ہوں۔

میں اکتوبر ۱۹۷۱ء میں حضرت فضل علی صاحب کے سالانہ عرس میں شرکت کے لئے مسکین پور گیا۔ مقصود صرف یہ دیکھنا تھا کہ اس عرس میں ہوتا کیا ہے۔ وہاں دیکھا کہ قرآن خوانی اور تقریروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس عرس کی تاریخیں بھی موسم اور تعطیلات کی رعایت سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

۳۔ اکتوبر کو ظہر کے بعد تقریر کرتے ہوئے چکوال والے حافظ غلام حبیب صاحب مرحوم نے، جو حضرت فضل علی صاحب کے خلیفہ عبدالمالک صاحب احمد پوری کے خلیفہ تھے، فرمایا کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں اشراق کے بعد شاہ فضل علی صاحب مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حسب معمول مسجد میں لوگوں کا مجمع تھا۔ ایک خوبصورت سرخ و سفید مسافر آکر حضرت کے قریب بیٹھ گیا اور کہا کہ میں بھوکا ہوں، کچھ کھانے کے لئے منگوائیے۔ حضرت نے اپنے خادم سے فرمایا کہ گھر سے کھانے کے لئے کچھ لے آئے، کیونکہ یہ مسافر ہیں اور مسافر پر روزہ فرض نہیں۔ کھانا آیا تو مسافر نے کہا کہ حضرت مہمان کی خاطر داری اسلامی شعار ہے۔ میری خاطر آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری یہ بات میں اس شرط پر مانتا ہوں کہ بعد میں تم بھی میری بات مانو۔ اس نے منظور کر لیا۔ حضرت بسم اللہ کہہ کر اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔

حاضرین میں کچھ تو پرانے وابستگان تھے، کچھ بالکل نئے اور کچھ متوسط لوگ، جن کی وابستگی پختہ نہ تھی۔آخری دونوں گروہ لاحول پڑھتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے مسجد سے نکل گئے کہ کیسا پیر ہے، رمضان کا روزہ توڑ دیا۔ پرانے وابستگان بیٹھے رہے۔ نئے لوگ تو بالکل ہی چلے گئے۔ متوسط لوگوں میں سے کچھ حضرات مسجد کے باہر کھڑے رہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر حضرت نے فرمایا کہ اب میری بات مانو کہ تمہارے گلے میں جو صلیب ہے اسے توڑ ڈالو اور اسلام لے آؤ۔ مسافر نے کہا۔ میری یہ کیفیت ہے کہ اردو مادری زبان کی طرح بولتا ہوں اور قرآن اتنی نفاست سے پڑھتا ہوں کہ کئی بار میں نے امامت کی ہے اور آج تک کوئی شخص تمیز نہیں کر سکا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔آپ نے کیسے جان لیا کہ میرے گلے میں صلیب چھپی ہوئی ہے اور میں عیسائی ہوں؟ فرمایا: اس بات کو چھوڑو اور وعدے کے مطابق میری بات مان لو۔ وہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اسلام لے آیا۔

یہ دیکھ کر مسجد کے باہر جو لوگ کھڑے تھے اور دیوار کے اوپر سے سر نکال نکال کر دیکھ رہے تھے آہستہ آہستہ مسجد میں واپس آگئے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت نے فرمایا۔ دیکھو بھائی یہ میں بھی جانتا ہوں کہ رمضان کا روزہ اضطرار کے بغیر قصداً توڑ دینے سے گناہ بھی ہوتا ہے اور کفارہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کفارہ غلام آزاد کرنا ہے یا ساٹھ روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

غلام میرے پاس نہیں کہ آزاد کر دوں۔ اور میں فقیر آدمی ہوں، بکثرت روزے رکھنے کی عادت ہے اس لئے ساٹھ روزے رکھنا میرے لئے کوئی دشوار نہیں، اور اگر یہ دشوار ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا میرے لئے کیا مشکل ہے جبکہ سیکڑوں آدمی میرے لنگر سے کھانا کھاتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر مجھے ہر روز ایسا شکار ملے تو رمضان کا ہر روزہ توڑ دوں اور ہر روزے کا کفارہ ادا کروں۔

مزید فرمایا کہ جب خواجہ فضل علی قریشی صاحب کے زمانے میں سالانہ جلسہ ہوتا تھا تو جلسے کے بعد عام آدمی واپس ہو جاتے تھے اور حضرت اپنے خلفا اور مخصوص لوگوں کو مزید ایک دو روز کے لئے روک لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خلفاء کی مجلس میں فرمایا کہ میں آپ لوگوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، لیکن خیال ہوتا ہے کہ آپ لوگ یہ نہ سوچیں کہ اب فضل علی بھی ڈینگیں مارنے لگا۔ پھر قبل اس کے کہ اصل بات بیان کرتے۔ فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے ریاحی تکلیف ہوئی۔ شدید تکلیف میں تڑپتا رہا۔ یہاں تک کہ ریح خارج ہوئی تب سکون آیا۔ تو جو شخص اتنا مجبور اور حقیر ہو کہ ذرا سی ہوا اسے تڑپا دے، پھر اس کے خارج ہونے کے بعد اسے سکون آئے، وہ کیا ڈینگیں مارے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص اصحاب کے ساتھ تشریف لائے اور میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "واہ قریشی واہ، تم نے خوب جماعت تیار کی ہے، آج مجموعی حیثیت سے روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی جماعت نہیں۔" اس وقت حضرت کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

مزید فرمایا کہ جن دانوں پر ختم ہوتا تھا ان میں سے ایک دانہ خراب ہو گیا تو حضرت فضل علی صاحب نے اسے علیحدہ کر دیا۔ اس دانے نے فریاد کی کہ مجھ پر اللہ کا نام لیا جاتا تھا، آپ نے مجھے اس سے محروم کر دیا۔ حضرت نے اسے پھر ان دانوں میں شامل کر لیا۔ وہ دانہ آج تک ان دانوں میں موجود ہے۔

مزید فرمایا کہ میلے کپڑے اتار کر لاپروائی سے ادھر ادھر پھینک دینے سے حضرت فضل علی صاحب منع فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ انہوں نے تو تمہارے جسم کو زینت بخشی اور تم ان کی یوں ناقدری کرتے ہو۔

مزید فرمایا کہ حضرت فضل علی صاحب کی طبیعت میں اس درجہ احتیاط تھا کہ درخت کے نیچے پڑا پھل بھی مالک کی اجازت کے بغیر کھانا پسند نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب نے جو عالم تھے، حضرت کی بیری کا ایک بیر جو نیچے پڑا تھا، کھا لیا۔ حضرت اس

وقت مراقبے میں تھے۔ بعد میں حضرت نے دریافت کیا کہ آپ نے میری اجازت کے بغیر بیر کیوں کھایا؟ جواب دیا کہ تبرک سمجھ کر۔ فرمایا کہ پھر تبرک سمجھ کر میری سب چیزیں اجازت کے بغیر لے جاؤ۔

عبدالمالک صاحب مرحوم (بکر والے) حضرت فضل علی صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ میں نے بھی ان کی زیارت کی ہے۔ وہ حضرت کی بکریاں چرانے پر مامور تھے۔ بکریاں جس کوٹھری میں بند کی جاتی تھیں، اس پر پھوس کا چھپر تھا۔ ایک مرتبہ دروازے کے قریب، چھپر سے نزدیک بھڑوں نے چھتہ بنالیا، عبدالمالک صاحب نے مشعل بنا کر چھتہ جلانا چاہا تو چھپر نے آگ پکڑ لی اور سارا چھپر جل گیا۔ عبدالمالک صاحب خوف کی وجہ سے روپوش ہوگئے۔ حضرت خاموش رہے۔ اس عرصے میں ایک روز کوئی شخص کھجوریں تقسیم کرنے کے لئے لایا۔ کھجوریں تقسیم ہوئیں تو حضرت نے فرمایا: عبدالمالک کہاں ہے، اس کے حصے کی کھجوریں مجھے دے دو، چنانچہ کھجوریں لے کر چادر کے پلّے میں باندھ لیں۔ دوسرے روز عبدالمالک صاحب سامنے آئے تو حضرت نے فرمایا: ارے عبدالمالک کہاں تھا، دیکھ تیرے حصے کی کھجوریں میں نے پلّے میں باندھ رکھی ہیں۔ چھپر کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہ آیا۔

ایک مرتبہ عبدالمالک صاحب نے خط بنوایا۔ ڈاڑھی کچھ زیادہ کٹ گئی۔ عصر کی نماز سے نکلتے ہوئے حضرت کی نظر عبدالمالک صاحب پر پڑی۔ فرمایا: ارے عبدالمالک میرے پاس تو آ، میری نظریں کمزور ہوگئی ہیں یا تو نے ڈاڑھی چھوٹی کرالی ہے۔ عبدالمالک صاحب قریب آئے تو ناپ کر دیکھا، ڈاڑھی واقعتہً چھوٹی تھی۔ آگ بگولہ ہوگئے اور فرمایا اسی وقت میرے گھر سے نکل جا، لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے فضل علی کا خادمِ خاص اور شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

چھپر جل گیا تو کچھ نہ کہا، ڈاڑھی کم ہوگئی تو گھر سے نکال دیا۔

عبدالمالک صاحب بکر والے نے میرے سامنے فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی شخص

نے فضل علی قریشی صاحب کو چینی کا ایک نہایت خوبصورت چائے کا سیٹ لا کر دیا۔ اہلیہ صاحبہ نے اسے اوپر تختے پر سجا دیا۔ مرغی چڑھی اور اس میں کی کچھ چیزیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو نہایت اطمینان سے فرمایا: "خوب شد سامان خود بینی شکست"۔

یہ دراصل زیب النساء کے ایک شعر کا آخری مصرعہ ہے۔ خادمہ نے زیب النساء کو چینی آئینہ کے ٹوٹ جانے کی اطلاع ان الفاظ میں دی "از قضا آئینہ چینی شکست" اس پر ناراض ہونے کے بجائے زیب النساء نے جواب دیا "خوب شد سامان خود بینی شکست"۔

شاہ زوّار حسین صاحب نے فرمایا کہ میں نے دیو بندی اور بریلوی گروہ کے بارے میں بہت غور کیا۔ میں نے یہ پایا کہ دونوں گروہوں میں اولیاء اللہ گذرے ہیں، لہٰذا ان دونوں میں سے کسی کو بر سر باطل کہنا صحیح نہیں۔ پھر فرمایا کہ دونوں گروہوں کا فرق ایک مرتبہ حضرت خواجہ فضل علی کی مجلس میں سمجھ میں آیا۔ ایک مرتبہ خواجہ فضل علی صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں پیر دبا رہا تھا۔ بہت لوگ بیٹھے تھے اور ان میں سے بعض پر وجد و حال کی کیفیت طاری تھی، اور حضرت کی مجلس میں یہی ہوتا تھا کہ وہ گفتگو فرما رہے ہیں اور لوگوں پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہے، وہ سفر میں چل رہے ہیں اور لوگ وجد و حال میں ہیں۔ اسی لئے مسکین پور کے اطراف میں لوگوں میں آپ جذبہ والا سائیں کے نام سے مشہور تھے۔ بہر حال میں نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ ان میں سے ایک جوان ہے دوسرا بوڑھا۔ دونوں فاصلے پر بیٹھے تھے۔ وقفہ وقفہ سے ایک اٹھ کر دوسرے کے پاس جاتا اور زور سے اس کی پیٹھ پر مکہ مار کر اپنی جگہ آ کر بیٹھ جاتا۔ پھر دوسرا یہی کرتا تھا۔ اسی مجلس میں دوسرے دو آدمیوں کو دیکھا کہ دونوں گلے میں ہاتھ ڈالے محبت میں گڈمڈ اور لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے بعد میں حضرت خواجہ فضل علی سے اس کی بابت دریافت کیا تو فرمایا کہ

گڈمڈ ہو رہے تھے ان دونوں پر ایک ہی نسبت پڑھ رہی تھی اور اتحادِ نسبت کا اثر جسمانی اتحاد کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور جو ایک دوسرے کو مار رہے تھے ان پر مختلف نسبتیں پڑی تھیں، ایک پر نسبتِ رسالت پڑی تھی، دوسرے پر نسبتِ توحید، اور یہ دونوں نسبتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

جس پر نسبتِ توحید پڑی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی طرف کیوں جا رہا ہے، اور جس پر نسبتِ رسالت پڑی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہی سے ملا ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر براہِ راست کیسے اللہ کی طرف جا رہا ہے۔

حضرت شاہ زوّار حسین صاحب نے فرمایا کہ اس واقعہ سے میرے ذہن نے یہ کام کیا کہ بریلویوں پر نسبتِ رسالت کا غلبہ ہے اور دیوبندیوں پر نسبتِ توحید کا۔ دیوبندیوں کا اصل مطمحِ نظر توحید کی حفاظت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اتنا اونچا نہ اٹھایا جائے کہ توحید متاثر ہو، اور بریلوی حضرات پر نسبتِ رسالت کا غلبہ ہے کہ رسول کو نیچے نہ گرنے دیا جائے کہ وہ عوام کی سطح پر آجائیں، بلکہ رسول کو دوسروں سے بلند کیا جائے۔ ان کی نظر اس پر نہیں کہ بلند کرنے میں کہیں توحید متاثر نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ میں نے "مقاماتِ زواریہ" میں بھی لکھا ہے یہاں اس لئے اعادہ کیا کہ حضرت فضل علی صاحب کے جو واقعات میرے علم میں ہیں وہ یک جا ہو جائیں۔

حضرت شاہ زوّار حسین صاحب نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت فضل علی صاحب مسکین پور سے تبلیغی دورے پر نکلے۔ ایک روز فرمایا کہ کئی روز ہو گئے گھر والوں کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ حاضرین میں سے ایک مجذوب قسم کے مرید نے کہا کہ حضرت آپ اجازت دیں تو ابھی تار کر دوں، کل تک خیریت معلوم ہو جائے گی فرمایا: اچھا کر دو، لیکن اگر کل تک خیریت معلوم نہ ہوئی تو تمہاری خیر نہیں۔ اس نے

اسی وقت انگلیوں سے اشارے کرتے ہوئے ٹنن ٹنن کیا اور کہا کہ فلانے حضرت صاحب کے گھر کی خیریت لے کر کل فلاں گاؤں پہنچو۔ دوسرے دن آدمی خیریت لے کر پہنچ گیا۔ حضرت نے اس سے دریافت کیا کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں؟ اس نے جواب دیا کہ حضرت میں ٹٹی کے لئے گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ٹنن ٹنن کی آواز سنائی دی، اور کسی نے میرا نام لے کر مجھ سے کہا کہ حضرت کے گھر سے خیریت لے کر کل فلاں گاؤں میں پہنچو۔

شاہ زوّار حسین نے فرمایا کہ مولانا عبدالمالک صاحب (لسونڈہ والے) نے حضرت فضل علی صاحب کی دعوت کی اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو بھی مدعو کیا مولانا مدنی نے فضل علی صاحب کو اپنے یہاں دیوبند مدعو کیا، چنانچہ دیوبند تشریف لے گئے۔ مولانا مدنی نے فضل علی صاحب کو طلبہ سے بھی متعارف کرایا اور تعریف کی۔

مزید فرمایا کہ صوفی اللہ نواز صاحب اور کچھ دیگر حضرات مولانا تھانوی کی خدمت میں پہنچے تو حضرت تھانوی نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ ہمارا کیا تقویٰ، تقویٰ اگر دیکھنا ہے تو اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان کے یہاں حقیقۃً تقویٰ ملتا ہے۔ اشارہ فضل علی صاحب کی طرف تھا۔ اگرچہ صراحۃً اُن کا نام نہیں لیا۔

حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے بیان کیا کہ خواجہ فضل علی صاحب کاشتکاری کرتے تھے، ہل بھی خود ہی چلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ہل چلا رہے تھے اور کچھ مرید درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ ایک مرید سے حضرت کا سخت گرمی میں ہل چلانا برداشت نہ ہو سکا، عرض کیا کہ حضرت آپ تھوڑی دیر سایہ میں آرام کرلیں، ہل میں چلائے لیتا ہوں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو اس کی بات مان لی۔ مرید نے جونہی ہل سے ہاتھ لگایا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت نے لوگوں سے کہا کہ اسے اٹھا کر سایہ میں لٹا دو۔ فرمایا کہ میں ہل چلاتے ہوئے روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر کرتا ہوں۔ اس ذکر

کے بل میں جو اثرات ہیں وہ انہیں برداشت نہیں کر سکا۔

حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے فرمایا کہ ایک شخص ہمیشہ فضل علی صاحب کے پیچھے پیچھے نہایت ادب سے چلا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت نے کھانے پر اپنے ساتھ بیٹھا لیا تو حضرت کے آگے کا سالن بھی صاف کر گیا۔ حضرت نے فرمایا: چلنے میں پیچھے پیچھے اور کھانے میں آگے آگے۔ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنے سامنے سے کھائے اور دوسروں کا خیال رکھے۔ فرمایا کہ حضرت کو اتباعِ سنت کا بڑا خیال رہتا تھا۔

مولانا عبدالغفور صاحب عباسی مدنی

مجھ سے غالباً حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد عمر صاحب دلی میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرسہ امینیہ میں مدرس تھے۔ ایک مرتبہ حضرت محمد سعید صاحب تبلیغی دورے پر دلی گئے۔ ایک روز مدرسہ امینیہ کا ایک طالب علم ان کے حلقے میں پہنچ گیا۔ حضرت محمد سعید کی توجہ کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ رونے، چلانے اور تڑپنے لگا۔ یہ بات مولوی محمد عمر صاحب کو معلوم ہوئی تو چراغ پا ہو گئے اور محمد سعید صاحب کے پاس پہنچ کر ان سے غصے کے عالم میں کہا کہ ایک سیدھے سادے طالب علم پر نہ معلوم کیا کر دیا۔ مجھ پر توجہ ڈالو تو میں جانوں۔ محمد سعید صاحب نے جواب دیا کہ میرا تو کوئی تصرف نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو کسی روز حلقے میں تشریف لے آئیں۔ چنانچہ وہ جمعرات کو حلقے میں پہنچ گئے۔ حضرت نے توجہ دی تو ان کی حالت ان کے شاگرد سے بھی بدتر ہو گئی۔ حلقہ ختم ہونے کے بعد بھی مجنونانہ حرکات کرتے رہے۔ محمد سعید صاحب نے فرمایا کہ ان کو کمرے میں بند کر دو۔ چنانچہ بند کر دیئے گئے اور بڑبڑاتے رہے۔ عشاء کی نماز کے وقت محمد سعید صاحب نے کمرہ کھلوایا۔ انہوں نے پورے ہوش کے ساتھ وضو کیا، نماز پڑھی اور نماز کے بعد ان پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی، چنانچہ پھر بند کر دیا گیا اور رات بھر ان پر کیفیات طاری رہیں۔ فجر کے وقت پھر کھولا گیا۔ انہوں نے سکون سے نماز پڑھی اور پھر کیفیات میں غرق ہو گئے۔ چنانچہ پھر بند کر دیا گیا۔ جمعہ کی نماز کے لئے کھولا گیا تو نماز کے فوراً بعد منبر پر کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا کر کہنے لگے کہ لو گو یہ رسول کا ہاتھ ہے اس سے مصافحہ کرو۔ نمازیوں میں سے ایک درویش نے ان سے مصافحہ کیا اور محمد سعید صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ

آپ نے یہ دولت اتنی ارزاں کردی۔ درویش کے مصافحہ کے بعد ان کی کیفیات ختم ہو گئیں۔

یہ حالات ان کے بڑے بھائی مولانا عبدالغفور صاحب کو معلوم ہوئے تو وہ محمد سعید صاحب کی خدمت میں پہنچے، ان سے استفادہ کیا اور کچھ دن بعد کہا کہ آپ مجھے بیعت کرلیجئے۔ محمد سعید صاحب نے انکار کیا اور فرمایا کہ آپ عالم ہیں اور میں جاہل، پھر میرے پیر بھی حیات ہیں، ان کے ہوتے ہوئے میں آپ جیسے عالم کو بیعت نہیں کر سکتا، چاہیں تو میرے پیر سے بیعت کرلیں۔ چنانچہ ان کو لے کر اپنے پیر حضرت خواجہ فضل علی صاحب کی خدمت میں گئے اور مولانا عبدالغفور صاحب نے ان سے بیعت کر لی۔

حضرت مولانا عبدالغفور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پیر سے بہت محبت تھی۔ حضرت شاہ زوار حسین صاحب نے بیان کیا کہ حضرت قریشی صاحب مرض الموت میں چارپائی پر لیٹے زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ مولانا عباسی سر کے قریب چارپائی کے نیچے بیٹھے تھے اور رال کو اپنے چلو میں لے لے کر چاٹتے جاتے تھے۔

محبت کی اس معراج کی جھلکیاں ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں بھی ملتی ہیں۔ صحابہ کرام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی اور لعاب دہن زمین پر نہ گرنے دیتے تھے، اپنے ہاتھوں میں لے کر چہروں اور جسموں پر مل لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ابو طیبہ حجام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فصد کھولی۔ حضور نے ان سے فرمایا کہ اس خون کو لے جا کر کسی جگہ دفن کردو۔ انہوں نے زمین میں دفن کرنے کے بجائے اسے اپنے پیٹ میں دفن کرلیا۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فصد کا خون حضرت عبداللہ بن

زبیر کو کہیں دفن کر دینے کے لئے دیا اور انہوں نے دفن کرنے کے بجائے اسے پی لیا۔

سردیوں کے زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کے لئے ایک پیالہ چارپائی کے نیچے رکھ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی باندی (رضی اللہ عنہا) نے وہ پیشاب پی لیا۔

عام طبیعت اس طرح کے واقعات کے تصور ہی سے تنفر کرتی ہے، لیکن محبت کی دنیا، ہوش کی دنیا سے مختلف ہوا کرتی ہے۔

غالباً ۱۹۶۲ء میں جب مولانا عبدالغفور صاحب کراچی تشریف لائے تو سبیل والی مسجد میں عشاء کے بعد ایک جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی کثرت تھی، جن میں سے بہت سے حضرات بیعت بھی ہوئے۔ اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ مرید کے درجات کی بلندی میں اوراد و اشغال کا روپے میں ایک آنہ اثر ہوتا ہے اور پندرہ آنہ اثر شیخ کی توجہ کا ہوتا ہے۔

حضرت کی یہ بات مجھ پر گراں گذری اور خیال یہ آیا کہ لوگ اپنی پیری چمکانے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

گھر آکر جب سونے کے لئے لیٹا تو ذہن اسی بدگمانی کی گرفت میں تھا۔ دفعتہً خیال آیا کہ بچے کی نشو و نما میں دو عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ ایک ماں کی محبت اور اس کی توجہات، اور یہی اصل عامل ہے، دوسرے بچے کی مادی ضروریات۔ اگر بچہ ماں کی محبت اور اس کی توجہات کا مرکز نہ رہے اور ماں اس سے غفلت برتنے لگے، نہ وقت پر دودھ پلائے، نہ ضرورت کے وقت اس کے کپڑے تبدیل کرے، نہ اس کی سردی گرمی کا خیال رکھے اور نہ اس کی تکلیف پر اپنی راتوں کی نیند حرام کرے، تو کیا بچہ صحیح طور پر نشو و نما پا سکتا ہے؟ پس بچہ کے پروان چڑھنے میں اس کی غذا اور ماں کی توجہات کے درمیان ایک اور پندرہ ہی کی نسبت تو ہے۔ پھر حضرت نے اگر پیر اور مرید کی نسبت یہ بات فرمائی تو کیا غلط ہے۔

حضرت مولانا عبدالغفور کے کراچی کے اس سفر کے دوران میرے پیر بھائی حاجی محمد اعلیٰ صاحب ایک مصیبت میں گرفتار تھے۔ ان کی اہلیہ مالیخولیا کی مریض تھیں۔ جب دورہ پڑتا تو کہتیں: میں مرنا چاہتی ہوں، مجھے زہر لا دو۔ حاجی صاحب کہتے: تمہیں زہر کھانا ہے تو کسی سے بھی منگوا لو، مجھے کیوں گناہ میں شریک کرتی ہو۔

ایک مرتبہ حاجی صاحب صبح دس بجے کے قریب کسی ضرورت سے باہر نکلے اور جب لوٹے تو دیکھا کہ ان کی اہلیہ ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔ پولیس کو اطلاع کی اور مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی گئی۔ اس دوران حاجی صاحب کے لئے، جو ہمیشہ سے اعصابی ضعف کا شکار ہیں، یہ اندیشہ مسلسل سوہان روح بنا رہا کہ پولیس قتل کے الزام میں کہیں انہیں نہ گرفتار کر لے۔

ایک روز میں، مولانا عبدالغفور صاحب، شاہ زوّار حسین صاحب، حاجی محمد اعلیٰ صاحب اور شاید ایک دو صاحبان اور بیٹھے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے حضرت مولانا عبدالغفور صاحب سے اس مصیبت کا ذکر کر کے دعا کی درخواست کی۔ حضرت تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا آپ سونے کے سوا ہر وقت، خواہ وضو ہو یا نہ ہو یہ پڑھتے رہا کریں۔ "**یٰس والقرآن شر دفع مشکل آسان**" انشاءاللہ خیر ہو گی۔ حاجی صاحب نے اسے اپنا ورد بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کی عزت محفوظ رہی اور مقدمہ داخل دفتر کر دیا گیا۔

حاجی صاحب سے اس عمل کی اجازت میں نے بھی لے لی ہے اور میں اس کتاب کے ہر قاری کو جو کسی ناکردہ گناہ مصیبت میں مبتلا ہو اس کی اجازت دیتا ہوں۔

حضرت شاہ زوّار حسین صاحبؒ

حضرت شاہ زوّار حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مفصل حالات ادارہ مجددیہ کی شائع کردہ کتاب "مقاماتِ زواریہ" میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں "وفات حسرت آیات"، "ملفوظات"، "حضرت شاہ صاحب کی فقہی بصیرت"، "کشف و کرامات" کے عنوانات سے ۴۰ صفحات میرے لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کا حال میں اپنی کتاب "حیاتِ بقا" میں لکھ چکا ہوں۔

ان سطروں کی تحریر کے وقت بعض مزید واقعات یاد آرہے ہیں:

<u>ریاضت و مجاہدہ</u>

سلسلے کے اسباق میں حضرت شاہ صاحب کے مجاہدہ کا حال ہم حضرت صوفی محمد احمد صاحب مرحوم کی زبانی سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب نے مجھ سے خود فرمایا کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ میں اپنے وطن میں آبادی کے کنارے پر واقع ایک مسجد میں چلا جاتا تھا اور عشاء کے بعد سے فجر تک مراقبے میں مشغول رہتا تھا۔

<u>اخفائے حال</u>

ایک مرتبہ میں حضرت کے پاس خیرپور ٹامے والی گیا اور وہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ دو روز قیام کے لئے حاجی عبدالغفار صاحب بھی آگئے۔ حاجی عبدالغفار صاحب نے مجھ سے کہا کہ حضرت شاہ صاحب کی کرامت یہ ہے کہ ان کے کپڑے کبھی میلے نہیں ہوتے۔ میں خاموش ہوگیا۔ حاجی صاحب کے چلے جانے کے بعد ایک روز جبکہ میں اور حضرت شاہ صاحب عصر کے بعد تفریح کے لئے آبادی سے باہر نکلے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ حاجی عبدالغفار صاحب آپ کی یہ کرامت بیان کر رہے تھے کہ آپ کے کپڑے کبھی میلے نہیں ہوتے۔ اس پر مسکرائے اور فرمایا کہ میری اس کرامت کا شبہ میرے گھر

والوں کو بھی ہوتا ہے۔

فرمایا: ایک مرتبہ میں اور میری اہلیہ بیٹھے تھے اور سامنے بچی کپڑے دھو رہی تھی، بچی نے کپڑے دھوتے ہوئے کہا کہ اماں جی! اباجی کے کپڑے تو کبھی میلے ہوتے ہی نہیں۔ میری اہلیہ نے یہ کہہ کر میری اس کرامت کا بھانڈا پھوڑ دیا کہ کپڑے پہن کر یہ کرتے کیا ہیں، بیٹھے ہی تو رہتے ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ چولھے ہانڈی کا کام کریں اور پھر بھی کپڑے میلے نہ ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ اچھا اگر یہ کرامت نہیں تو کیا ہے کہ ہم ایک بات دریافت کرنے کا ارادہ لے کر آپ کے پاس پہنچتے ہیں اور آپ ہمارے اظہار کے بغیر باتوں باتوں میں اس کا جواب دے دیتے ہیں۔ اس کا خود میں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔

فرمایا: اللہ جانتا ہے کہ مجھے تو نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے دل میں کیا ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ کسی کے دل کی بات کا جواب میری زبان سے جاری فرما دیتا ہے تو یہ اللہ کا کرم ہے۔

<u>پیر کامل کے حکم کی تعمیل</u>

ایک مرتبہ میں نے خیر پور ہی میں تفریح کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا
(اگر کامل پیر حکم دے تو جانماز کو شراب میں رنگ لو
اس لئے کہ سالک منزل کے راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا)

فرمایا کہ پیر، بشرطیکہ کامل ہو، اگر مرید کو کسی ایسی بات کا حکم دے جس کی ظاہری صورت شریعت کے خلاف ہے تو بھی اس کے حکم کی تعمیل کرنی چاہئے، کیونکہ کامل پیر، جو شریعت کی اتباع کے بغیر کامل بن ہی نہیں سکتا، جب وہ دانستہ کسی خلاف

شرع بات کا حکم دے رہا ہو تو اس میں یقیناً کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اور اس طرح کا حکم پیر کامل "مراد" کو دیتا ہے (وہ جسے اللہ خود اپنی طرف کھینچ رہا ہو)، "مرید" کو نہیں دیتا (جو اللہ تک پہنچنے کے لئے اپنی طرف سے جدوجہد کرتا رہتا ہے) اور پیر کامل جانتا ہے کہ "مراد" کون ہے اور "مرید" کون۔

اس کے بعد حضرت نے حسب ذیل دو قصے سنائے:

ایک مرید نے پیر سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنے کا کوئی عمل بتا دیجئے۔ پیر نے کہا کہ آج عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو جانا۔ مرید عشاء کے وقت بڑے تذبذب کا شکار رہا۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کر کے کہ عشاء کی نماز تو اللہ کی طرف سے فرض ہے، یہ کیسے چھوڑ دوں، فرض ادا کر لئے اور سنت اور وتر چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: میں نے کیا قصور کیا تھا کہ تم نے میری سنتیں چھوڑ دیں۔ گھبرا کر اٹھا اور سنت اور وتر ادا کئے۔

صبح پیر کے دریافت کرنے پر واقعہ بتایا۔ پیر نے کہا: خدا کی قسم اگر تو فرض پڑھے بغیر سو جاتا تو اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے فرماتا کہ اٹھ اور نماز پڑھ۔

فرمایا کہ پیر جانتا تھا کہ یہ "مراد" ہے، اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کی عشاء فوت کرا دے۔

دوسرا واقعہ یہ بیان کیا کہ ایک پیر نے مرید کو پیسے دیئے اور کہا کہ فلاں رنڈی کے کوٹھے پر چلا جا، جو اس شہر میں نئی نئی آئی ہے۔ مرید چلا تو گیا، لیکن کوٹھے پر پہنچ کر اس نے رنڈی سے کہا کہ مجھے اجازت دو کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ چنانچہ نیت باندھی تو صبح کر دی اور رنڈی کو پیسے دے کر واپس آگیا۔ پیر کے دریافت کرنے پر اس نے واقعہ بتا دیا۔ پیر نے ملامت کی اور کہا میں نے تجھے وہاں اس لئے بھیجا تھا؟ پھر مزید پیسے دے کر کہا کہ آج پھر اس کے پاس جانا۔ مرید پہنچا اور پھر اسی نے اجازت لے کر دو رکعت میں صبح کر دی۔ صبح پیر نے پھر سخت ملامت کی اور مزید پیسے دے کر تیسری بار

بھیجا اور جب نماز شروع کرنی چاہی تو رنڈی نے کہا کہ نماز کے لئے تو مسجد ہوتی ہے، رنڈی کا کوٹھا تو نماز کی جگہ نہیں - اس طرح باتوں کی ابتداء ہوئی تو رنڈی نے بتایا کہ وہ فلاں جگہ کی رہنے والی ہے - اس کے ماں باپ فسادات میں مارے گئے (ماں باپ کے نام بھی بتائے) اور پھر ہم بھائی بہن بچھڑ گئے (اپنا اور بھائیوں کے نام بھی بتائے) اور میں جس کے پلے پڑی اس نے مجھے اس راہ پر لگا دیا - یہ سن کر وہ شخص روتے ہوئے رنڈی سے لپٹ پڑا - دونوں بھائی بہن تھے - اور پھر اس نے اپنی بہن کو اس گندگی سے نجات دلائی -

حضرت قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب

میں جب حضرت شاہ زوار حسین صاحبؒ سے بیعت ہوا، اس وقت حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ العالی کو خلافت ملے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ اس لئے اسی وقت سے میں موصوف کو اپنے بزرگوں میں سے شمار کرتا ہوں ۔ موصوف کا قرب اور ان کی شفقتیں مجھے اس وقت میسر آئیں جب سندھ یونیورسٹی کے شعبہ ، اسلامک کلچر میں میرا تقرر ہوا، جہاں ڈاکٹر صاحب قبلہ شعبہ ، اردو کے پروفیسر اور صدر تھے ۔ سندھ یونیورسٹی میں صرف ایک سال کی ملازمت کے بعد چونکہ میں کراچی یونیورسٹی منتقل ہو گیا اس لئے موصوف کا ظاہری قرب بعد میں تبدیل ہو گیا۔ قلبی تعلق بہرحال باقی رہا اور مجھ ناکارہ پر موصوف کی شفقتوں میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا گیا۔

علم باطن کے بغیر صرف کامل علم ظاہر ہو یا علم ظاہر کے بغیر کامل علمِ باطن، یا علم ظاہر و باطن کے کمال کے بغیر صرف انتہا۔ درجے کا عجز و انکسار اور حسنِ اخلاق، ان میں سے ہر چیز، مراتب کے اختلاف کے مطابق، لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے ۔ اور جب یہ تینوں عناصر کسی ایک شخصیت میں جمع ہو جائیں تو اس کے ساتھ لوگوں کی گرویدگی کا کیا عالم ہونا چاہئے، یہ محتاج بیان نہیں ۔ سہ آتشہ کی تاثیر سے عملی طور سے نہ ہی کم از کم علمی طور سے کون ناواقف ہے!

قبلہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ علم ظاہر کے اعتبار سے ایم ۔ اے، ایل ۔ ایل بی، پی ایچ ۔ ڈی، ڈی ۔ لٹ ہونے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے ۔ تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ضعیفی کے باوجود یہ سلسلہ اب تک اس طرح جاری ہے کہ کوئی سال مشکل ہی ایسا گذرتا ہے جب آپ کی

ایک دو کتابیں منظرِ عام پر نہ آجاتی ہوں ۔ بے شمار طلبہ کو پی ایچ ۔ڈی بھی کرایا۔

علم باطن کے اعتبار سے سامنے کی بات یہ ہے کہ نقشبندی سلسلے کے ایک کامل بزرگ حضرت شاہ زوار حسین صاحبؒ سے انہیں خلافت ملی اور اب مراتب سلوک میں ان کا کیا مقام ہے اس کا صحیح علم تو انہیں ہے یا اللہ عزوجل کو۔ تاہم مجھے مختلف شواہد کی بنا پر یقین ہے کہ علم باطن میں ان کا مرتبہ علم ظاہر کے ڈی ۔لٹ سے کم نہیں۔

حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ ان کے عجز و انکسار کا یہ عالم ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس کی نظیر نہیں دیکھی ۔جس سے بھی ملتے ہیں اس کے سامنے گویا بچھ سے جاتے ہیں۔

یہ پُر فتن زمانہ اور ایسی جامع شخصیت! " **ذلک فضل الله یوتیه من یشاء** "(یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے اس سے نوازے)۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اپنی کتاب " تاریخِ اسلاف " میں زیادہ تر اشاریاتی انداز میں اپنے جو حالات تحریر فرمائے ہیں وہ بھی اربابِ بصیرت کے لئے ان کے بلند مقام کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

یہ میری کم نصیبی کہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے لئے مجھے کم عرصہ ملا اور اسی لئے موصوف کے تفصیلی حالات میرے سامنے نہیں آئے۔ جو حالات اور واقعات میرے علم و مشاہدے میں آئے اور حافظے میں محفوظ رہے وہ یہ ہیں:

۱۔ اپنی کتاب " حیاتِ بقا " میں، میں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ میں نے جب ۱۹۷۰ء میں حج کا ارادہ کیا اور قرعہ میں نام نہ آنے کے ساتھ ساتھ ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو حضرت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ موصوف نے فرمایا " ارے مفتی صاحب آپ حج کی تیاری کیجئے، میں نے آپ کو عرفات کے میدان میں دیکھا ہے ۔" اور واقعتاً اللہ

تعالیٰ نے مجھے اسی سال حج نصیب فرمایا۔

ایسے وقت میں جب کہ اس سال عرفات کے میدان میں اللہ عزوجل کا دربار سجا بھی نہیں، کسی کو عرفات کے میدان میں دیکھ لینا، اس کی تاویل اس کے سوا اور کیا کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی رسائی عالم مثال تک بھی ہے۔

۲۔ جن دنوں حاجی محمد اعلیٰ صاحب کی اہلیہ کا قتل ہوا (جس کی تفصیل "مولانا عبدالغفور عباسی" کے ذکر میں گذر چکی ہے) ڈاکٹر صاحب ان دنوں حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے۔ حاجی صاحب کے ساتھ وہ ان کی اہلیہ کے قبر پر گئے۔ مراقبے میں ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک عورت کو اپنا زیور دیا تھا کہ کسی مرد سے مجھے قتل کرا دے، چنانچہ ایک بھنگی آیا اور اس نے مجھے ذبح کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا: وہ کون سی عورت اور کون سا بھنگی تھا، ان کے نام کیا ہیں؟ اس پر وہ خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حاجی صاحب کے والد کی قبر پر مراقبہ کیا۔ انھوں نے اپنی بہو پر بہت غصے کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس کمبخت نے میرے بیٹے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے قاتل کا نام دریافت کیا تو خاموش ہو گئے۔

۳۔ ۱۹۹۴ء میں جب کہ میں مکہ مکرمہ میں تھا، ایک گرامی نامہ ارسال فرمایا کہ میں نے ایک سال حج کے موقع پر منیٰ کی مسجد میں حضرت آدم علیہ السلام کا مزار دیکھا، اور اصحاب کہف کو دیکھا کہ وہ مختلف خدمتوں پر مامور ہیں اور جب کسی خدمت سے فارغ ہوتے ہیں، آکر حضرت آدمؑ کی قبر کا طواف کرتے ہیں اور پھر دوسری خدمت بجا لانے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ میں نے مسجد خیف میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ وغیرہ اور آخر میں خاتم الانبیاءؑ کو بھی ایک تخت پر تشریف لاتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب حضرات حج کے لئے تشریف لائے تھے۔ علی نبینا وعلیہم الصلوات والتسلیمات۔

اس کے بعد مجھے تحریر فرمایا کہ تم اس کی تحقیق کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کہاں ہے۔

میں نے کچھ کتابیں دیکھیں اور جواب دیا کہ حضرت آدمؑ کی قبر سری لنکا، جبل ابو قبیس (مکہ) یا ارضِ فلسطین میں بتائی جاتی ہے۔ مسجد خیف میں قبر ہونے کا ثبوت نہیں ملا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ تحریر فرمایا کہ میں نے دوسرے سال بھی حضرت آدم علیہ السلام کی قبر مسجد خیف ہی میں دیکھی اور میں نے حضرت آدم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ گذشتہ سال میں نے جن حضرات کو دیکھا تھا، اس سال نظر نہیں آرہے آپؑ نے جواب دیا کہ بیٹے اس سال تم دیر میں آئے ہو، سب لوگ آکر چلے گئے۔
اس لئے مزید تحقیق کرو، شاید کوئی ثبوت مل جائے۔

میں نے مزید کتابیں دیکھیں اور فاکھی نے مکہ کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں ایسی روایات مل گئیں جن سے حضرت آدمؑ کی قبر کا مسجد خیف میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

۴۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ایک استاد تھے، جو ڈاکٹر صاحب سے خوش نہ تھے اور ڈاکٹر صاحب بھی ان کی ناراضگی سے واقف تھے، ان سے میرے خوشگوار مراسم تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ، جب بھی ذکر آتا، ڈاکٹر صاحب کی برائی کرتے رہتے تھے، لیکن میں نے ڈاکٹر صاحب کی زبان سے کبھی ان کی برائی نہیں سنی۔ جب بھی ان کا ذکر کیا خیر کے ساتھ ہی کیا۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ ایک عالی مرتبت صوفی ہی نہیں ایک زندہ دل انسان بھی ہیں۔ میری سندھ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران تعطیلات میں ڈاکٹر صاحب قبلہ، خان رشید صاحب مرحوم اور سید حئی احمد ہاشمی صاحب کبھی کبھی مچھلی یا پرندوں کے شکار کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوشگوار موڈ میں سب کے ساتھ

بے تکلفی سے پیش آتے تھے، جیسے مرید و مرشد اور استاد و شاگرد نہ ہوں، سب ایک دوسرے کے دوست ہوں۔

ہو حلقہ ٔیاراں تو بریشم کا طرح نرم

اس کے برخلاف ایک مرتبہ یہ صورت بھی پیش آئی کہ ہم لوگ حضرت نوح ہالائیؒ کے مزار پر جارہے تھے۔ سجادہ نشین خاندان کے کچھ لوگوں نے اشاریاتی انداز میں مذاق اڑایا تو ڈاکٹر صاحب کو پٹھانی جلال آگیا، خوب ڈانٹا اور سب لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ایک مرتبہ حیدرآباد سے دور پھلیلی نہر پر بنسیاں ڈالے بیٹھے تھے، قلاقند ساتھ لے گئے تھے، سب لوگوں کی توجہ شکار کی طرف تھی اور میری نظریں ترنے پر تھیں اور ہاتھ قلاقند میں۔ سب کو شیرینی کی طرف میری شدید رغبت کا علم تھا۔ خان رشید صاحب مرحوم نے مجھ سے کہا: مفتی صاحب! قلاقند کی خبر بھی تو لیجئے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: مفتی صاحب کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں، ان کا تو پہلے سے یہ حال ہے "ہاتھ کار میں دل یار میں"۔

اللہ تعالیٰ عافیت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سایہ قائم رکھے اور ان کے فیض کو عام فرمائے۔ آمین۔

حضرت مفتی عبدالمجید صاحبؒ

حضرت قبلہ مفتی عبدالمجید صاحب رحمتہ اللہ علیہ سرونج کی عدالت شرعیہ میں مفتی تھے۔ میری ان سے آخری ملاقات ۱۹۷۹ء میں اس وقت ہوئی جب میں سعودیہ سے سرونج پہنچا تھا۔

اس وقت ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی، حافظہ بھی تقریباً جواب دے چکا تھا اور وہ اس وقت عمر کے اس مرحلے میں تھے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: **ثم یرد الی أرذل العمر لکی لایعلم من بعد علم شیئا** (پھر سب سے بدتر عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے)۔ شاید آخری عمر میں، جب کہ اللہ کے پاس جانے کے دن قریب ہوتے ہیں، حافظہ اس لئے جواب دے جاتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی بات یاد نہ رہے۔

سرونج پہنچ کر جب مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: بیٹا بقا! اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے۔ جب تو چھوٹا سا تھا تو منشی جی (میرے والد صاحب مرحوم) تجھے میرے پاس لائے تھے کہ اس کی بسم اللہ کرا دو۔ میں نے کہا تھا کہ ارے کس شہد کو میرے پاس لائے ہو۔ بیٹا بقا! اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے۔

مفتی صاحب مولانا گل حسن شاہ صاحب مرحوم کے خلیفہ تھے۔ مولانا گل حسن شاہ صاحب، حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اور پانی پت میں ان کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ مفتی صاحب کی تربیت بھی انہیں کے پاس ہوئی۔

میں نے ہوش سنبھالا تو مفتی صاحب کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ اور پیری نے بالوں کے جھروکے سے چھب دکھانی شروع کر دی تھی، جس پر وہ خضاب کی چلمن

ڈالے رہتے تھے ۔ بلند قامت، سرخ و سپید اور وجیہ و شکیل انسان تھے ۔ عطر میں بسا ہوا خوبصورت لباس پہن کر جب وہ کسی راہ سے گذرتے تو باقی رہنے والی مہک سے صاف اندازہ ہو جاتا تھا کہ؛

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی

مزاج میں بڑی نفاست و لطافت اور ظاہری حیات میں بے اعتبار نگینی تھی ۔ بالوں کی چوٹری ہلاتے ہوئے چھوٹے بازار سے گزر کر عصر کے بعد بڑے بازار تک جانا اور تھوڑی دیر رجو لال کی دوکان پر بیٹھنا، جسے انہوں نے خود ہی کپڑے کے دوکان کھلوا دی تھی، ان کا روز کا معمول تھا۔ عام طور پر دو چار آدمی جلو میں ہوتے تھے ۔ یہ ساتھی تو بڑے مؤدب رہتے تھے لیکن مفتی صاحب ان سے خوش مزاجیاں فرماتے جاتے تھے ۔ کبھی پیدل تشریف لے جاتے، کبھی اس چھوٹے سے ایک نشست والے یکہ پر جسے انہوں نے بطورِ خاص بنوایا تھا اور یکہ ہی کی مناسبت سے ایک چھوٹا سا خوبصورت گھوڑا اس میں جتا ہوتا تھا۔ جس کی باگ مفتی صاحب کے ہاتھ میں ہوتی تھی ۔ کبھی سفید نکل کی نئی سائیکل پر اس شان سے کہ ایک آدمی کے کاندھے پر ہاتھ ہوتا تھا اور پھیوں پھیوں سائیکل چلاتے جاتے تھے ۔

لوگوں کے دلوں پر مفتی صاحب کی حکومت اتنی تھی کہ مجال نہ تھی کہ وہ بازار سے گزریں اور دوکاندار، ہندو اور مسلمان کی تفریق کے بغیر عام طور پر کھڑے ہو کر انہیں سلام نہ کریں ۔

پورا سرونج ان کی رنگینئ مزاج کو جانتا تھا اور پورا سرونج ان سے محبت یا کم از کم ظاہری عزت کرنے پر گویا مجبور سا تھا۔

باہر کے قوال، عطر فروش یا طوائفیں سرونج آئیں تو معمول تھا کہ سب سے پہلے مفتی صاحب کے درِ دولت پر حاضری دیں ۔

ایک مرتبہ ایک " نوخیز حسین بلند و بالا " طوائف سرونج آئی اور حسبِ معمول

پہلے مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچی۔ مفتی صاحب نے اپنے خادم خاص سے فرمایا کہ اسے فلاں مکان میں ٹھہرا دو، یہ ہماری مہمان رہے گی۔ پھر اس کے سرونج میں قیام تک مفتی صاحب کا روز کا یہ معمول رہا کہ شام کو بازار کے لئے نکلتے وقت اس کے پاس جاتے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر روانہ ہو جاتے۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ مفتی صاحب نے اپنی رنگینیوں میں ایک دلچسپ اضافہ کیا ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود بدنامی مول لے لی اور قصبہ کے تمام رنگین مزاجوں کو شب خون سے محفوظ کر دیا، کیونکہ پہلے ہی روز سے مفتی صاحب کا نام لگ جانے کی وجہ سے نہ تو کسی کا مجال تھی کہ طوائف کے دروازے پر قدم رکھ سکے اور نہ طوائف کی مجال تھی کہ دروازے سے باہر قدم نکال سکے۔

۶۸ء میں جب مفتی صاحب کراچی تشریف لائے تو استقبال کرنے والوں سے اسٹیشن پر اترتے ہی میرا نام لے کر فرمایا کہ اس کے مکان پر چلو۔ مجھے خبر بھی نہ تھی، دفعتہً پہنچے تو بڑی خوشی ہوئی۔ بچے انڈیا گئے ہوئے تھے اور مکان میں میں تنہا تھا۔

مفتی صاحب کے خادم خاص سے سنا تھا کہ انہوں نے کبھی مفتی صاحب کو رات کے دو بجے کے بعد سوتے نہیں دیکھا۔ یہ تو میں نے بھی سرونج میں کئی بار دیکھا تھا کہ فجر کے بعد سے تلاوت شروع کرتے اور جب تک اشراق سے فارغ نہ ہو جاتے کسی اور کام میں مشغول نہ ہوتے، لیکن شب بیداری کا حال معلوم نہ تھا۔

کراچی میں پہلی رات تو میں نے دیکھا کہ مفتی صاحب میرے سامنے فجر کی نماز کے وقت بیدار ہوئے، شاید اس لئے کہ سفر کی تکان تھی۔ اس کے بعد سے جب تک قیام رہا فجر یا تہجد کے وقت جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے مفتی صاحب کو مصلّے ہی پر دیکھا۔

مفتی صاحب کو شطرنج کا شوق بھی تھا لیکن دو تین مخصوص حضرات تھے جن کے ساتھ وہ شطرنج کھیلتے تھے، وہ بھی ہفتہ میں صرف ایک بار دوپہر کے وقت۔ مفتی

صاحب ہر ہفتہ مہندی اور وسمہ کا خضاب کیا کرتے تھے۔ نائی جب خضاب لگا کر چلا جاتا تو وہ دو گھنٹے کے لئے شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے۔ فرماتے تھے خضاب لگا کر سونا نقصان دہ ہوتا ہے۔

میرے گھٹنے میں کافی عرصے سے درد تھا۔ فرمایا میں سرونج پہنچ کر تمہارے لئے لوبان کا تیل بھیجوں گا، اس سے انشاءاللہ درد جاتا رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فرماتے تھے کہ میں نے پنسیریوں لوبان پھونکا ہے تب جا کر صحیح طریقے سے لوبان کا تیل نکالنا آیا ہے۔

ایک روز میں نے عرض کیا کہ سنا ہے کہ ایک بوتل میں تل کا تیل لیا جائے اور ببول کی جڑ کھودی جائے۔ اس کی ایک جڑ بوتل کے منہ میں اتنی داخل کر دی جائے کہ کارک کا کام دے۔ پھر بوتل کو گل حکمت کر کے چالیس روز کے لئے وہیں دفن کر دیا جائے تو تیل خود بھی سیاہ ہو جاتا ہے اور بالوں کو بھی سیاہ کرتا ہے۔ فرمایا: اس کے لئے تین شرائط ہیں: ایک یہ کہ تیل سرسوں کا ہو تل کا نہیں، کیونکہ سرسوں کے تیل میں قدرے تیزابیت ہوتی ہے اور خضاب اس وقت تک نہیں بنتا جب تک اس میں تیزاب کی لاگ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ببول جوان ہو، بوڑھا یا بچہ نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ چالیس کے بجائے اسی (۸۰) دن دفن کیا جائے۔ فرمایا کہ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے۔

مفتی صاحب کے مکان کے احاطے میں خودرو نہیں بلکہ لگائے ہوئے ببول کے کئی پیڑ تھے اور تعجب ہوتا تھا کہ پھولوں سے محبت رکھنے والے پھول جیسے انسان کو کانٹوں سے یہ دلچسپی کیوں ہے۔ اس کا راز اب سمجھ میں آیا۔

سرونج میں رام چندر ایک نائی تھا۔ وہ ایک جاگیردار صاحب کے بال بنا رہا تھا کہ کھال کٹ گئی۔ انہوں نے کہا کہ رام چند تو نے میرا وضو توڑ دیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا وضو نہیں ٹوٹا، خون اپنی جگہ سے بہا کب ہے۔ تعجب سے پوچھا کہ ہندو ہو کر تجھے یہ مسئلہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے جواب دیا: میں مفتی صاحب کے بال جو بناتا ہوں۔

فرمایا کہ چندا ڈھانہ (سرونج کا ایک گاؤں) کا ایک ہندو پٹیل (مکھیا) بڑا طاقتور تھا۔ اس کی طاقت کی خبر نواب وزیر الدولہ تک پہنچ چکی تھی۔ نواب صاحب سرونج کے دورے پر تشریف لائے تو نذر پیش کرنے کے لئے وہ پٹیل بھی حاضر ہوا اور چنور شاہی روپیہ (ریاست کا مقامی سکہ تھا اور کلدار سے چھوٹا اور موٹا ہوتا تھا) نذر میں پیش کیا۔ نواب صاحب خود بھی اتنے طاقتور انسان تھے کہ گھوڑے پر بیٹھ کر اگر رانیں دبا دیں تو گھوڑے کی زبان نکل آتی تھی۔ نواب صاحب نے پٹیل کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور روپیہ کو چٹکی سے اس زور سے مسلا کہ دونوں طرف سے اس کے ابھرے ہوئے نقوش مٹ گئے۔ پھر پٹیل سے کہا کہ ارے فلانے تو نے کھوٹا سکہ نذر کیا ہے۔ پٹیل سمجھ گیا۔ اس نے کہا دیکھوں سرکار: اور روپیہ کو دونوں ہاتھ کی چٹکیوں سے دبا کر دو تین بار اوپر نیچے کر کے دو ٹکڑے کئے اور کہا کہ سرکار درب کا تو اچھا ہے۔ نواب صاحب دنگ رہ گئے۔

فرمایا کہ نواب وزیر الدولہ روزانہ صبح کے وقت پینس میں سوار ہو کر سیر کے لئے نکلا کرتے تھے۔ راستہ متعین تھا، اس راہ میں قافلہ کا محلہ بھی پڑتا تھا، جس میں بیشتر حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کا خاندان آباد تھا۔ سید صاحب کے خاندان میں ایک صاحب تھے کلّو میاں، وہ مدک کے عادی تھے، ہر وقت ٹن رہتے۔ کلّو میاں نے ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ نواب صاحب کی سواری اس طرف سے گذرے تو انہیں خبردار کر دیا کرے۔ چنانچہ نواب صاحب کی سواری قریب آتی تو گھر سے نکلتے۔ نواب صاحب سواری سے اترتے، ان کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے اور فرماتے: کلّو میاں یہ خلافِ شرع ہے اسے چھوڑ دیجئے اور کلو میاں روز مدک پر لاحول پڑھتے۔ سواری سے اتر کر سر پر ہاتھ رکھوانا اور نصیحت کرنا نواب صاحب کا روز کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ تین دن گزر گئے اور ملازم نے نواب صاحب کی آمد کی اطلاع نہ دی۔ کلّو میاں نے ملازم سے دریافت کیا: کیا بات ہے سرکار کی سواری کئی روز سے نہیں

گزری؟ ملازم نے جواب دیا: میاں آپ کو ہوش کہاں رہتا ہے، سرکار تو تین روز ہوئے انتقال فرما چکے۔ اناللہ پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ کونے کھدروں سے نلکیاں اور مدک کے لوازمات جمع کئے اور سل پر رکھ کر چلنے لگے۔ ملازم نے کہا: میاں کیا کرتے ہیں، یہ تو آپ کی زندگی ہے۔ جواب دیا: ارے جب ٹوکنے والا نہیں رہا تو پینے کا کیا مزہ۔

اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس میں ہر سال شریک ہونا مفتی صاحب کا معمول تھا۔ اجمیر میں کبھی ان کا قیام میرے تایا زاد بھائی محمد ناصر انصاری مرحوم کے مکان پر ہوتا تھا اور کبھی درگاہ کے ایک حجرے میں جسے وہاں کے خادم خاص طور پر مفتی صاحب کے لئے خالی رکھتے تھے۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ اجمیر سے واپسی پر حسب معمول جاورہ رکا اور میاں عبدالرحیم شاہ صاحب (مولانا غوث علی شاہ صاحب کے خلیفہ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ سرونج جانے لگو تو اندور رک کر وہاں کے مجذوب سے ملتے ہوئے جانا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ مجذوب آبادی سے باہر مقیم تھے۔ پتہ دریافت کرتے ہوئے رات کو بارہ بجے کے قریب ان کے پاس پہنچا۔ قریب پہنچا تو ایک کٹھری سی نظر آئی۔ اس میں حرکت ہوئی اور مجذوب صاحب ظاہر ہوئے۔ ہاتھ کے اشارے سے کچھ پینے کے لئے مانگا۔ گشت کا سپاہی جو میرے ساتھ ہو لیا تھا، دوڑ کر دودھ لایا۔ انہوں نے کچھ پی کر مجھ سے کہا: صاحب پئیں گے۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ تین بار میرا انکار سن کر دودھ پھینک دیا اور پھر گٹھری میں غائب ہو گئے۔ میں واپس آگیا۔

آئندہ سال اجمیر سے واپسی پر میاں عبدالرحیم شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو سونے سے قبل ان کے پیر دبا رہا تھا۔ فرمایا: میاں گذشتہ سال تم نے مجذوب کا بچا ہوا دودھ کیوں نہ پیا تھا۔ میں نے عرض کیا: حضرت اس کے سوا کیا ہوتا کہ میں بھی انہیں جیسا بن جاتا اور مجذوبانہ زندگی مجھے پسند نہیں۔

سرونج میں آبادی سے دور ایک پہاڑی پر ایک بزرگ شاہ فخرالدین صاحب کا

مزار ہے، اس کے قریب اور بھی بے شمار قبریں ہیں۔ ایک قبر ایسی بھی ہے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ مجذوب کی قبر ہے۔ اس کا احاطہ بنا ہوا تھا اور چھت بھی پڑی تھی لیکن اس طرح کہ پیروں کی جانب کی چھت برقرار تھی اور کمر سے سر تک کے اوپر کی چھت گری ہوئی تھی۔ مشہور تھا کہ کئی بار چھت بنائی گئی ہے۔ لیک جب بھی مکمل ہوئی اسی رات اس کا اگلا حصہ گر جاتا ہے۔

میں نے مفتی صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا: ہاں میاں میں نے بھی اس کا تجربہ کیا ہے۔ میں نے خود چھت بنوائی اور صبح گری ہوئی ملی۔

ایک روز میں چائے کے لئے دودھ گرم کر رہا تھا، باورچی خانے میں تشریف لے آئے اور دودھ کو کھولتے دیکھ کر فرمایا: میاں اس طرح گرم کرنے سے بالائی پڑ جاتی ہے جسے چائے میں ڈالو تو بری معلوم ہوتی ہے اور بالائی ہٹا دو تو دودھ کا مزہ کم ہو جاتا ہے۔ چائے کے لئے دودھ اس طرح گرم کیا جاتا ہے کہ جب جوش کے آثار پیدا ہوں اس میں مسلسل چمچہ چلاتے رہیں اور جب جوش آجائے تو اتار لیں۔ اس طرح بالائی نہ پڑے گی اور دودھ کا پورا مزہ اس میں برقرار رہے گا۔

ہر چیز کی طرح مفتی صاحب کا چائے کا ذوق بھی بہت نفیس تھا۔ نہایت اچھی قسم کی چائے پیتے اور شام کی چائے پر کافی مہمان ہوتے تھے۔ مفتی صاحب کو صرف ۲۴ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس سے یقیناً ان کی چائے کے مصارف بھی پورے نہ ہو سکتے تھے۔ نہ معلوم یہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے چلتا تھا۔

مفتی صاحب بڑے خوش مزاج انسان تھے، ہر ایک سے مزاح فرماتے اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ بایں ہمہ خودداری کا یہ عالم تھا کہ صاحبزادہ عبدالتواب خان صاحب (وزیر) سرونج تشریف لائے۔ شریعت کا محکمہ انہی کے تابع تھا۔ مفتی صاحب نہ ان کے استقبال کو گئے اور نہ ان کی قیام گاہ پر۔ کسی نے توجہ بھی دلائی تو فرمایا: مجھے ان سے کیا غرض، اگر وہ ملنا چاہیں تو خود آجائیں۔

اس زمانے میں کم از کم سرونج جیسی جگہ میں خوشنما شادی کارڈوں پر پیسے برباد نہ کئے جاتے تھے۔ ایک کاغذ پر مدعووین کے نام لکھ کر نائی کو دے دیئے جاتے تھے اور وہ سب کو اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ اس طرح کے مواقع پر اگر ناظم و کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی مدعو ہوں تو سب سے اوپر مفتی صاحب ہی کا نام لکھا جاتا تھا۔ عید، بقر عید کے مواقع پر ناظم صاحب اور تمام بڑے افسران خود مفتی صاحب کے پاس جاتے تھے۔ بچے سے بڑے تک اور چھوٹے درجے کے آدمی سے لے کر ناظم صاحب تک مفتی صاحب کی یکساں تعظیم کرتے تھے۔ ان کے رعب کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ سرونج کے ایک ہیڈ ماسٹر نے ایک بیڑھنی (طوائفوں کی ادنیٰ قسم) کو چند آدمیوں کے سامنے اس کے کوٹھے پر قتل کر دیا اور آکر مفتی صاحب سے واقعہ بیان کیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا تم میرے پاس رہا کرو، چنانچہ وہ ہر وقت مفتی صاحب کے پاس رہنے لگے۔ شام کو جب مفتی صاحب معمول کے مطابق بازار نکلتے تو وہ بھی ساتھ ہوتے۔ حالانکہ قتل کے عینی شاہد موجود تھے، لیکن پولیس کی مجال نہ تھی کہ مفتی صاحب کی موجودگی میں ان پر ہاتھ ڈال دے۔ بالآخر وہ بری ہوئے۔

فرمایا ایک مرتبہ میں نے جمعہ کی نماز کے بعد بازار میں ایک اجنبی کو دیکھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا: کیا اس زمانے میں حلال کھانے کی کوئی صورت ہے؟ میں نے جواب دیا: ہاں اس طرح کہ نہ کھائے اور جب جان جانے کا گمان غالب ہو جائے تو بقدر سد رمق کھالے۔

واضح رہے کہ ایسی اضطرار کی حالت میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ حرام، حرام ہی نہیں رہتا۔ صرف جان بچانے کی حد تک، نہ کہ پیٹ بھرنے کے لئے۔

ایک مرتبہ فرمایا: میاں تمہارے پاس تذکرہ غوثیہ ہے؟ میں نے جواب دیا: تھی تو لیکن ایک صاحب کو تحفتہً پیش کر دی۔

ملتی ہے؟

جی ہاں۔

خرید لانا۔

میں خرید لایا۔ فرمایا کہ اس میں یہ تعویذ دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا کہ جب میں مولانا گل حسن شاہ صاحب کی زیرِ کفالت تھا اور دیو بند میں پڑھتا تھا، ایک مرتبہ تعطیلات ختم ہونے پر میں دیو بند جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ کاش مولانا صاحب مجھے اس تعویذ کی اجازت دے دیں۔ مولانا صاحب مجھے رخصت کرنے پانی پت کے اسٹیشن تک آئے۔ روانگی کا وقت قریب آیا تو فرمایا: تم ابھی چھوٹے ہو ورنہ ہم تمہیں اس تعویذ کی اجازت دے دیتے۔ مجھے تعجب ہوا کہ میری تمنا جو زبان پر بھی نہ آئی تھی انہیں کیسے معلوم ہوئی۔

مولانا گل حسن شاہ صاحب کے انتقال پر مجھے سجادہ نشینی کے لئے پانی پت بلایا گیا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ برسوں بعد ایک مرتبہ پانی پت پہنچا تو پرانا خادم زندہ تھا، اس نے پہچان لیا اور اسی کمرہ میں ٹھہرایا جس میں رہا کرتا تھا۔ ایک روز عشاء کے بعد مسجد ہی میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا، سب جا چکے تھے، صرف ایک صاحب باقی تھے جو صحن میں تیز تیز قدموں سے ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ بالآخر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور تیز لہجے میں کہا کہ میں صرف تمہارے انتظار میں ہوں اور تم فارغ ہی نہیں ہوتے۔ اٹھو تازہ وضو کرو اور کمرے میں چلو۔ کمرے میں پہنچ کر فرمایا فلاں تعویذ لکھو۔ میں نے عرض کیا کہ حضور اب میرے بس کی بات نہیں، اس کے لئے چار چلّے کون کرے گا۔ ڈانٹ کر فرمایا: چلّے کے لئے تم سے کون کہتا ہے، میں چلّوں کے بغیر تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے نقش بھرنے کی ترکیب بتائی اور تشریف لے گئے۔ بعد میں خادم نے بتایا کہ وہ حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب کے خلیفہ تھے اور ان کے خلفاء میں سے صرف وہی اس وقت بقیدِ حیات تھے۔

ایک مرتبہ گرمی کی دوپہر میں سرونج میں ایک سکھ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہا کہ میں دلّی سے اس تعویذ کے لئے آیا ہوں۔ سنا ہے آپ کو اجازت ہے۔ میں نے اسے ٹھیرایا اور ظہر کی نماز کے بعد جب نقش لکھنے کے لئے بیٹھا تو نقش صحیح بیٹھتا ہی نہ تھا۔ میں نے جھنجلا کر قلم پھینکا اور زبان سے نکلا کہ میں نے کب خوشامد کی تھی، اور جب از خود بتلایا گیا ہے تو آتا کیوں نہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر داعیہ پیدا ہوا۔ قلم اٹھایا تو نقش صحیح طور پر بھر گیا۔

اس لمبی تمہید کے بعد فرمایا: میاں اگر تم حفاظت سے رکھ سکو تو وہ نقش میں تمہیں لکھ دوں میں نے زعفران لا دیا اور مفتی صاحب نے وہ نقش لکھ کر مجھے دے دیا۔

اتفاق سے وہ نقش گم ہو گیا۔ میرے لکھنے پر مفتی صاحب نے دوبارہ وہ نقش بھیج دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ نقش بھی میرے پاس ہے یا نہیں اور ہے تو کہاں رکھا ہے ویسے مجھے اس طرح کے تعویذوں کی چنداں قدر نہیں۔ عزّہ اس کا ہے کہ اللہ نے تو میری قسمت ایسی بنائی ہے کہ مٹی میں ہاتھ ڈالوں تو سونا ہو جائے پھر مجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس رہا کرتا تھا۔ حضرت کشمیری کا معمول تھا کہ فجر کے بعد کتب خانے میں بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھی اٹھتے اور کوئی کتاب نکال کر دیکھتے اور پھر آ کر بیٹھ جاتے۔ ایک روز میں نے دریافت کیا کہ حضرت اس وقت آپ کون سا وظیفہ پڑھتے ہیں؟ فرمایا: یہ وظیفے کا نہیں میرے مطالعے کا وقت ہے۔ کوئی بھی کتاب ذہن میں لیتا ہوں، اسے پڑھتا جاتا ہوں اور کہیں شبہ ہو تو اٹھ کر دیکھ لیتا ہوں۔

مفتی صاحب بے انتہا فیاض آدمی تھے۔ کیسی ہی قیمتی چیز ہو، کسی شخص کے منہ سے اگر اس کی تعریف نکل گئی تو بس اسی کی ہو گئی۔

ایک مرتبہ مفتی صاحب نے مجھے تسبیح پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ فرمایا: اچھا میاں تمہیں تسبیح کا بھی شوق ہے؟ پھر اپنے بکس سے چاندی کی ایک خوبصورت تسبیح نکال کر

دی، جس میں ہر دوسرے دانے پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ بعد میں میں نے وہ تسبیح ایک سنار کو بتائی کہ اس کی قیمت کیا ہوگی؟ کہا کہ اس میں چاندی تو تقریباً پچیس روپے کی ہوگی لیکن دانے کاٹنے اور پچاس دانوں پر سونے کا ملمع کرنے کی لاگت سو روپے سے کم نہ ہوگی۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔

فرمایا کہ نواب وزیر الدولہ ایک مرتبہ پینس پر بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک سپاہی کو دیکھا، ڈاڑھی اور سر کے بال پریشان اور گرد آلود۔ رک کر دریافت کیا کہ تیل کیوں نہیں لگاتا، کنگھا کیوں نہیں کرتا کہ یہ مسنون ہے۔ سپاہی نے جواب دیا: سرکار تم (میرے زمانہ تک لوگ نواب سعادت علی خان کو تم کے لفظ سے خطاب کیا کرتے تھے) چار روپے ماہوار تو تنخواہ دیتے ہو۔ اس میں اپنا اور بچوں کا پیٹ پالوں یا یہ سنت ادا کروں؟ حکم دیا کہ اس کے تیل اور کنگھے کے لئے دو روپے ماہوار مقرر کر دیئے جائیں۔ ایک روز پھر اسی سپاہی کو اس طرح کھڑے دیکھا کہ ڈاڑھی تو قاعدہ میں تھی لیکن سر کے بال پریشان۔ سبب دریافت کیا تو سپاہی نے جواب دیا: سرکار دو ہی روپے تو مقرر کئے ہیں وہ ڈاڑھی کے تیل کنگھے میں صرف ہو جاتے ہیں، سر کے لئے کہاں سے لاؤں؟ فرمایا: سر منڈا دے۔

اکبر خان دادا ایک سپاہی تھے۔ انہیں میں نے بھی دیکھا ہے جب کہ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کا حیرت انگیز واقعہ بیان کیا۔ فرمایا کہ اکبر خان صاحب کے دادا مولانا غوث علی شاہ صاحب کے معتقد تھے مولانا غوث علی صاحب ہر سال اجمیر جاتے تھے اور سرونج میں اکبر شاہ خان کے دادا کے پاس کچھ روز قیام کرتے تھے۔ اکبر شاہ خان کے دادا کی صرف پوتیاں تھیں، پوتا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ مولانا سے پوتے کے لئے دعا کی درخواست کی۔ دوسرے سال جب سرونج سے مولانا کا گذر ہوا تو ان کے قیام کے دوران ہی پھر پوتی ہوئی۔ مولانا کو اطلاع دی گئی تو فرمایا کہ یہاں لاؤ اور بچی کو گود میں لے کر فرمایا کہ لڑکی کہاں ہے یہ تو لڑکا ہے اور خود ہی لڑکے کا نام اکبر خان رکھا۔

مفتی صاحب نے فرمایا کہ بڑھاپے میں جب اکبر خان ملازمت کے قابل نہ رہے تو ایک روز میرے پاس آکر کہنے لگے کہ میاں اب تو ملازمت میرے بس کی نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ اپنے دادا کی قبر پر جاکر کہو کہ لڑکی سے لڑکا بنوا کر آپ نے مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ لڑکی ہی رہتا تو میری فکر دوسروں کو ہوتی۔ اب جب کہ ملازمت بس کی نہیں رہی میں کیا کروں۔ اکبر خان گئے اور دادا کی قبر پر کھڑے ہو کر یہی کہہ آئے۔ اتفاق سے ان دنوں نواب سعادت علی خان شیر کے شکار کے لئے سرونج آئے ہوئے تھے۔ کورٹ کے دروازے سے گذرے تو اکبر خان پہرے پر تھے۔ انہیں دیکھ کر گاڑی روکی اور اکبر خان صاحب سے اپنے سر پر ہاتھ رکھوایا۔ اور کہا کہ اکبر خان اب آپ بہت بوڑھے ہوگئے، گھر بیٹھیں اور آپ کی تنخواہ آپ کے گھر ہی پہنچ جایا کرے گی۔ نواب سعادت علی خان کا ہمیشہ سے دستور تھا کہ جب بھی سرونج آتے اور پہرے پر اکبر خان کو دیکھتے تو گاڑی روک کر ان سے اپنے سر پر ہاتھ رکھواتے تھے۔

مفتی صاحب ہر سال عرس کے موقع پر اجمیر تشریف لے جاتے تھے۔

میرے پھوپھا سسر حافظ محمود خان صاحب نے (جو ثقہ بزرگ ہیں) بیان کیا کہ ایک مرتبہ اجمیر تشریف لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ قوالی کی محفل جمی۔ سردی کا زمانہ تھا اور مفتی صاحب سردی کا پورا لباس پہنے ہوئے تھے اور جبہ بھی تھا۔ ایک شعر پر انہیں وجد آیا اور بہت دیر تک وجد کی کیفیت رہی۔ پہلے تو انہوں نے قوال کو پیسے دینا شروع کئے، پیسے ختم ہوئے تو جبہ اتار کر دیا۔ پھر ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار کر قوال کے نذر کر دیئے اور صرف لنگی باندھ کر باہر نکلے۔ جیسے ہی سماع خانہ سے باہر قدم رکھا ایک شخص طشت میں جوڑا لئے کھڑا تھا۔ پوچھا کس نے بھیجا ہے؟ جواب دیا: اس نے جس کے آپ مہمان ہیں۔ حافظ محمود خان صاحب نے فرمایا کہ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔

حضرت مفتی کا تعلق مولانا غوث علی شاہ صاحب کے سلسلے سے تھا اور جو شخص بھی مولانا غوث علی شاہ صاحب کے حالات سے باخبر ہو اسے مفتی صاحب کے حالات پر تعجب نہ ہوگا۔

مولوی عبدالسمیع صاحب

مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم، جیسا کہ قاری سید فصیح احمد صاحب کے تذکرے میں گذرا، حافظ محمود الحسن صاحب مرحوم کے خلیفہ تھے۔ قاری صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب کے علاوہ بھی سرونج میں ان کے متعدد مرید تھے۔ موصوف تقریباً ہر سال سرونج تشریف لاتے تھے۔ ہم اس وقت اگرچہ طالب علم تھے اور اس قابل نہ تھے کہ کسی کے مرید ہوتے تاہم مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم جب اپنے مریدوں کے ساتھ سرونج کے اطراف میں واقع نزدیک اور دور کے اولیاء اللہ کے مزارات پر جاتے تو تقریباً ہر موقع پر ہم بھی ہمسفر ہوتے تھے۔ موصوف کو کشف قبور بہت ہوتا تھا اور اہل قبور کے بہت سے واقعات ہم ان سے سنا کرتے تھے۔

موصوف نے ایک مرتبہ ایک عجیب بات یہ فرمائی کہ جب ملکوں میں آپس میں جنگیں ہوتی ہیں تو وہاں کے اصحاب خدمت بھی ان کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں بھی دوسروں کی طرح فتح و شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فرمایا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہماری ڈیوٹی بھی جرمنی کی طرف سے تھی۔ واللہ اعلم۔

پیر صاحب دیول شریف

۱۹۸۰ء میں جب مجھے قائد اعظم یونیورسٹی کی شریعہ فیکلٹی میں (جو اب جامعہ اسلامیہ کے نام سے مستقل یونیورسٹی ہے) مختصر عرصہ کے لئے مکہ مکرمہ کی جامعہ اُم القریٰ کی طرف سے اُصول فقہ پڑھانے کے لئے اسلام آباد بھیجا گیا تو ایک روز مغرب کے بعد پیر صاحب دیول شریف کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، جو ایوب خان مرحوم کے پیر ہونے کی وجہ سے زیادہ مشہور تھے۔ اتفاق سے وہ دن مریدوں کے اجتماع کا دن تھا۔ حلقہ۔ مریداں میں ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر میری طرف ملتفت ہوئے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو التفات زیادہ بڑھا۔ مریدوں سے معذرت کر کے مجھے خلوت میں لے گئے فرمایا کہ جو کام میرے لائق ہو بتائیں۔ چونکہ بڑے لوگ خصوصاً فوجی افسران کے حلقہ بگوش تھے اس لئے سمجھے کہ شاید میں کسی سفارش کے لئے آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو صرف نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔ ان کا التفات مزید بڑھ گیا۔ چائے پلائی اور کچھ وظائف اپنے قلم سے لکھ کر دیئے کہ انہیں پڑھ لیا کرنا۔

اس کے بعد خلوت سے جلوت میں آئے۔ سب لوگ فرش پر تھے اور وہ صوفے پر۔ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ کولہے میں مستقل تکلیف کی وجہ سے نیچے بیٹھنے میں مجھے تکلف ہوتا ہے۔ چونکہ جان چکے تھے کہ میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہوں اس لئے سرگوشی کے انداز میں فرمایا کہ حلقے کے معمولات میں کھڑے ہو کر صلاۃ و سلام پڑھنا بھی ہے، آپ کو اعتراض ہو تو اسے ترک کر دیں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں، آپ حسب دستور اپنے معمولات انجام دیں۔ چنانچہ سب کھڑے ہوئے تو میں نے بھی ساتھ دیا، محض آداب ملحوظ رکھنے کی خاطر۔

حلقے سے فراغت کے بعد میرے لئے اعلان فرمادیا کہ میں نے ان کو خلافت دی

اور مبارک باد کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔جب نذریں پیش کرنے کا سلسلہ چلا تو میں خاموش بیٹھا تھا۔ایک صاحب نے میرے ہاتھ پر دو روپے رکھ کر نذر پیش کرنے کا اشارہ کیا۔میں نے وہ روپے تو واپس کر دیئے اور اپنے بٹوے سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر بطورِ نذر پیش کر دیا۔سعودیہ کی کمائی تھی، پچاس روپے کی نظر میں کیا اہمیت ہوتی جب کہ تنخواہ کے علاوہ اسلام آباد میں قیام کے دوران ٹی۔اے، ڈی۔اے کے طور پر ساڑھے تین سو روپیہ (پاکستانی) یومیہ الاؤنس بھی مل رہا تھا۔

اس کے بعد لنگر کا سلسلہ چلا۔مجھے اپنے ساتھ محبت سے بیٹھایا اور مختلف چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ہفتہ واری لنگر کا انتظام اسی نذر سے ہوتا ہے۔

پیر صاحب کی بزرگی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ اپنی "شپرہ چشمی" کی وجہ سے اگر میں نہ دیکھ سکا تو "چشمہ آفتاب را چہ گناہ" البتہ ان کے وقار، متانت، اخلاق اور محبت سے میں بے انتہا متاثر ہوا اور بزرگی کے ساتھ جب یہ عناصرِ اربعہ جمع ہو جائیں تو مقبولیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات مزید بلند فرمائے۔

حافظ فضل الرحمٰن صاحب

حافظ فضل الرحمن صاحب اپنے والد حضرت شاہ زوار حسین صاحب مرحوم کی طرح باوقار، باحیا، سنجیدہ، ذہین اور کم گو انسان ہیں اور اپنے والد ہی کی طرح خاموشی سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

ایس۔ایم۔کالج سے انٹرسائنس کرنے کے دوران حافظ صاحب کا قیام میرے ساتھ سندھ مدرسے کے مکان میں تھا۔

ایک مرتبہ ہم سب مکان میں تالا لگا کر گئے اور واپس آئے تو تالا کھلا ہوا دیکھا۔ سوچا کہ شاید خود ہی تالا لگانا بھول گئے ہوں گے۔چند روز بعد دوبارہ سب لوگ باہر گئے اور واپسی پر دیکھا کہ نہ صرف تالا بلکہ دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہے۔گھر کی چیزوں کا جائزہ لیا تو ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔دل میں کچھ کھٹک سی ہوئی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

ایک مرتبہ حافظ صاحب کا قیمتی بال پوائنٹ غائب ہو گیا۔میں نے گھر کے ہر فرد سے پوچھا، کسی کو خبر نہ تھی۔دوسرے روز وہ بال پوائنٹ حافظ صاحب کے تکیہ کے نیچے سے اس طرح ملا کہ اس کے تمام اجزاء جدا جدا تھے۔

اس موقع پر میں نے کہا: حافظ صاحب، کیا جنات تو آپ کے ساتھ نہیں؟ شرما کر خاموش ہو گئے اور جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بتایا کہ میرے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات تو پیش آتے رہتے ہیں۔میں نے ان کی تفصیل پر اصرار کیا تو کہا: کبھی کبھی اگر میں دیر سے گھر آتا ہوں اور سندھ مدرسے کے میدان میں اندھیرا سا ہوتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تالپور ہاؤس کی طرف سے دوڑتے ہوئے آئے اور میرے سامنے سے گذر کر کالج کی دیوار میں غائب ہو گئے۔میں نے مزید کریدا تو بتایا کہ کبھی کبھی خیرپور ناتھن شاہ والی میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ میں کنویں سے پانی اپنے گھر لا رہا ہوں

اور کسی نے گھڑا کاندھے پر اٹھا لیا، میں چلتا جا رہا ہوں اور گھڑا میرے ساتھ کاندھے کے اوپر چل رہا ہے۔ جب گھر قریب آیا تو گھڑا کاندھے پر آگیا۔

حافظ صاحب چونکہ انتہائی ثقہ آدمی ہیں اس لئے ان کے بیان میں جھوٹ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

شاہ عبدالوہاب صاحب

حیدر آباد سندھ میں شاہ عبدالوہاب صاحب کا مزار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے اخلاف میں سے ہیں۔ یہاں وہ تمام بدعات ہوتی رہتی ہیں جو عام طور پر ایسے مقامات پر ہوتی ہیں۔

۱۵۔ شعبان کی رات کو پروفیسر خان رشید صاحب مرحوم کے ساتھ قبرستان گیا اور واپسی پر ہم دونوں شاہ عبدالوہاب صاحب کے مزار پر مراقب ہوئے۔ مراقبے کے عالم میں، میں نے اپنی تقریباً ساڑھے تین ماہ کی شیر خوار بچی کی نعش اپنے ہاتھوں پر دیکھی۔ گھبرا گیا کہ یہ رات تو زندگی، موت اور رزق کے تعین و تقسیم کی رات ہوتی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے۔

رمضان میں وہ بچی بیمار ہوئی اور ۲۰۔ رمضان کو اس کا انتقال ہو گیا۔ بیوی کے مقابلے میں مجھے اس کی موت کا صدمہ کم ہوا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مرد کا دل عورت کے دل کے مقابلے میں قوی ہوتا ہے، دوسرے اس وجہ سے بھی کہ ۱۵۔ شعبان ہی سے اس کی موت میرے تصور میں تھی۔

کوئٹہ میں ایک بزرگ تھے جن کی وضع قطع فیشن ایبل مولویوں کی سی تھی، پیروں جیسی نہ تھی۔ ڈاڑھی صرف ایک مشت، جسم پر شیروانی اور سر پر جناح کیپ۔ کوئٹہ میں موٹر کے اسپیئر پارٹس کی دوکان کرتے تھے۔ حیدر آباد میں یوسف اسحاقی صاحب مرحوم کے مکان پر ان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران فرمایا کہ میں نے تو زندگی میں دو ہی آدمی تیار کئے ہیں۔ جو چاہے آزما کر دیکھ لے۔ ان میں سے ایک عاقل اسحاقی صاحب ہیں دوسرے نعیم صاحب۔ میں دونوں کو جانتا ہوں۔ عاقل اسحاقی صاحب، یوسف اسحاقی صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں اور نعیم صاحب ان دنوں

غالباً لائلپور (فیصل آباد) میں کسی مل کے منیجر تھے۔ دونوں کلین شیو تھے۔

ایک دن میں اور نعیم صاحب اسحاقی صاحب مرحوم کے مکان پر بیٹھے تھے۔ اسحاقی صاحب مرحوم نے کہا: نعیم صاحب! مظہر بقا صاحب کو بھی شاہ عبدالوہاب صاحب کی زیارت کرادیں۔ انہوں نے جواب دیا: جب چاہیں۔ چنانچہ مغرب کے بعد کا وقت مقرر کر لیا۔ دونوں مغرب کے بعد مزار پر مراقب ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد نعیم صاحب نے "حق حق" کے زور زور سے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان کے خاموش ہونے کے تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ بہت گہرا نیلگوں پانی ہے، میں بلند کنارے پر بیٹھا ہوں، دور سے گلاب کا ایک پھول تیرتا ہوا آرہا ہے۔ وہ پھول کنارے سے لگا اور اس کے فوراً بعد گنبد خضرا نظر آیا۔ یہ منظر غائب ہوا تو دیکھا کہ ایک بزرگ کرتا پاجامہ پہنے، عمامہ باندھے قرآن کریم پڑھ رہے ہیں۔ قرآن کریم سامنے رحل پر رکھا ہے۔ ان بزرگ میں جو خاص چیز نظر آئی وہ یہ کہ ان کی ڈاڑھی کے بال بالکل سونے کے رنگ کے تھے۔

مراقبہ ختم کرکے ہم مسجد میں آئے اور چونکہ عشاء کی نماز میں تھوڑی دیر تھی اس لئے صحن میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں نعیم صاحب سے ان بزرگ کی ڈاڑھی کا رنگ دریافت کروں گا، کیونکہ سفید ریش تو سب ہی ہوا کرتے ہیں۔ نعیم صاحب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور آپؐ نے شاہ عبدالوہاب صاحب کو حکم دیا ہے کہ ان کی (مظہر بقا کی) تربیت کریں اور شاہ عبدالوہاب صاحب نے فرمایا کہ آپ مزار پر آیا کریں۔ اس کے بعد خود ہی کہا کہ شاہ عبدالوہاب صاحب میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کی ڈاڑھی کا رنگ بالکل سنہرا ہے۔ میری بے توفیقی کہ اس کے بعد بھی میں نے مزار پر آمد و رفت نہ رکھی۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کا بڑا اچھا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ روتوں کو ہنسانا، ہنستوں کو رلانا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ مجھے ان کی تقریر سننے کا دو مرتبہ اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ سہارنپور میں کہ عشاء کے بعد انہوں نے تقریر شروع کی اور فجر کی اذان پر ختم کی۔ پوری رات ہنستے اور روتے گذر گئی، مجال ہے کہ نیند نے پلکوں سے آنکھ مچولی بھی کی ہو۔

دوسری بار دہلی میں جمعیتہ علمائے اسلام کے سالانہ اجلاس میں یہ کہہ کر تقریر شروع کی کہ دلی والو! میں تم سے ناراض ہوں، کوئی تقریر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کہہ کر صرف ڈھائی گھنٹہ تقریر کی۔ جو شخص ساری ساری رات تقریر کا عادی ہو اس کے لئے صرف ڈھائی گھنٹہ بولنا نہ بولنے کے برابر تھا۔

مولانا عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کی باری تھی اور جب ان کی باری آئی تو ہجوم پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ ٹکٹ (جو چار آنہ کا تھا) ختم کر کے پنڈال کے پردے اٹھا دیئے گئے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے حق میں تھے کہ ہندوستان کو مکمل آزادی ملنی چاہیئے۔ وقتی طور پر وزارتیں دینا ایسا ہی ہے جیسے طوطے کو پنجرے سے نکال کر کمرے میں قید کر دینا۔ مولانا عثمانی ان وقتی وزارتوں کے حق میں تھے۔ فرمایا کہ پنجرے میں قید رہتے ہوئے طوطے کے بازو قوت پرواز کھو چکے ہیں، سر تیلیوں سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو چکا ہے، پنجرے سے کمرے کا نسبتہً وسیع میدان میسر ہو گا تو پر پھڑپھڑائے گا، بازوؤں میں پرواز کی قوت پیدا ہو گی اور سر کے زخم مندمل ہوں گے، اس لئے عارضی حکومت قبول کر لینی چاہیئے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب غیر منقسم ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور وہ ہندوستانیوں کو انٹریم گورنمنٹ دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

مولانا محمود حسن خاں صاحب مرحوم

معجم المصنفین (جس کی چار جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں) کے مؤلف مولانا محمود حسن خان صاحب جو ٹونک کے باشندے تھے، جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ظریف بھی تھے۔ ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے امام صاحب کے قریب ایک سوراخ سے چیونٹیوں کا غول نکل آیا اور امام صاحب کے پیروں اور پنڈلیوں پر چڑھنے لگا امام صاحب نے فرفر نماز ختم کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ بھی کوئی نماز ہوئی۔ مولانا محمود حسن خان صاحب نے فرمایا: اس سے اچھی ہماری نماز تو آج تک ہوئی ہی نہیں، "اللہ اکبر، اللہ اکبر" ظالم نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ اللہ سے ہٹ کر خیال کہیں بھٹک سکتا۔

ایک مرتبہ موصوف کو رمضان میں دستوں کی شکایت ہو گئی۔ روزہ رکھتے تو دست آنے لگتے، چھوڑ دیتے تو بند ہو جاتے۔ کسی نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا: شیخ سعدی پہلے ہی فرما گئے ہیں:

خدا گر بحکمت ببندد درے
کشاید بفضل و کرم دیگرے

(اگر خدا حکمت سے ایک دروازہ بند کرتا ہے
تو فضل و کرم سے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے)۔

دستور کے مطابق دوسرے علماء کے ساتھ مولانا محمود حسن خان صاحب بھی سلام کے لئے نواب صاحب کے در دولت پر حاضری دیتے تھے۔ البتہ علماء کے لئے یہ رعایت تھی کہ وہ نواب صاحب کی تشریف آوری پر کھڑے ہونے کے ادب سے مستثنیٰ تھے۔ مولانا محمود حسن خان صاحب جب بھی پہنچتے نواب سعادت علی خان ان کا ہاتھ پکڑ

کر اپنے سر پر رکھتے۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا: ارے تمہارے سر پر میرے ہاتھ سے کیا ہو گا۔ تم میرے سر پر اپنا پیر بھی رکھ دو تو بھلا ہو جائے گا۔

۔ مولانا محمود حسن خان صاحب کے سارے بال سفید ہو جانے کے بعد از سر نو سیاہ ہو گئے تھے۔ مفتی ولی حسن صاحب نے بیان کیا کہ مولانا نے بھلاواں لے کر اس کی کھاد بنائی تھی اور اسے مٹی میں ملا کر اس میں سات کونڈوں میں میتھی بو دی تھی اور روزانہ ایک کونڈے کی بھاجی کاٹ کر کھاتے تھے۔ بالوں کی سیاہی اسی کا اثر تھا۔

شیخ محمد محمود شعبان

شیخ محمد محمود شعبان مصری، قاہرہ کی جامعہ الازہر سے کراچی یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے شعبوں میں عربی ادب پڑھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ میں اس زمانے میں شعبہ معارف اسلامیہ کا صدر تھا۔ رفتہ رفتہ موصوف کے مجھ سے بہت قریبی تعلقات ہو گئے۔ حافظ قرآن اور بڑے ذاکر و شاغل آدمی تھے، سلسلہ جنیدیہ میں بیعت تھے۔

میں ان دنوں قرآن کریم حفظ کر رہا تھا اور ان کو سنایا کرتا تھا، تاکہ اس بہانے ان سے عربی میں گفتگو کا کچھ موقع میسر آجایا کرے۔

شعبان صاحب ایک مرتبہ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے اور واپس آکر مجھے حسب ذیل قصہ سنایا:

مدینہ منورہ میں ایک افریقی ہیں جو نمازوں کے اوقات میں ریاض الجنۃ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے کے پاس بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے وطن میں دولت مند اور امیر کبیر تھے۔ عمرہ پر آئے، مدینہ منورہ میں ایسا دل لگا کہ واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ ویزا کی مدت ختم ہوئے خاصا عرصہ گذر گیا اور وہ پولیس کی نظر میں آگئے۔ کھانے اور بیت الخلا کے لئے نکلنے کے علاوہ وہ تہجد کے بعد سے عشاء کے بعد تک مسجد نبوی ہی میں رہتے تھے۔ ایک دن پولیس کا ایک کپتان دو سپاہیوں کے ساتھ انہیں گرفتار کرنے کے لئے مسجد میں داخل ہو گیا اور جونہی کپتان نے انہیں پکڑا وہ روضہ اقدس کی جالیاں پکڑ کر چلائے: "یارسول اللہ! میں آپ کا مہمان ہوں اور یہ لوگ مجھے نکالنا چاہتے ہیں"۔ جالیوں سے ایک مقدس ہاتھ برآمد ہوا جس نے ان افریقی کا بازو پکڑ لیا اور یہ آواز آئی: "**نعم هذا ضيفي**" (ہاں یہ میرا مہمان ہے)۔ کپتان پر اس کا اتنا

اثر ہوا کہ اسی وقت کاندھے پر کے ستارے نوچ کر پھینک دیئے اور کہا کہ اب تو میں حکومت کی ملازمت کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی خدمت کروں گا۔ اس وقت سے اب تک کپتان ان کے ساتھ خادم کی حیثیت سے رہتا ہے۔

عمرہ کے بعد شعبان صاحب حج کے لئے گئے اور واپس آکر پھر بتایا کہ اس مرتبہ میں نے ان افریقی سے معانقہ بھی کیا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔

میرا تو ہر سال کئی بار مدینہ منورہ جانا ہوتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ ایک افریقی کو نماز کے بعد اس طرح ریاض الجنتہ سے جاتے ہوئے دیکھا ضرور ہے، جن کے پیچھے دو تین عرب اس طرح جا رہے تھے جیسے کسی بزرگ کے پیچھے جاتے ہیں۔ میں نے ایک عرب سے دریافت بھی کیا کہ یہ کون ہیں، تو اس نے جواب دیا کہ ایک بزرگ ہیں۔

مدینہ منورہ میں اپنے جاننے والوں سے اس واقعہ کی تصدیق کرنی چاہی تو کسی کو خبر نہ تھی۔ یہ بات بھی ہے کہ سعودیہ میں اس طرح کے واقعات کو ہوا نہیں دی جاتی بلکہ چھپایا جاتا ہے۔

شیخ محمد شعبان اگر ثقہ بزرگ نہ ہوتے تو میں اس واقع کو نقل نہ کرتا۔

جب میں مصر گیا تو قاہرہ میں شعبان صاحب کے گھر جا کر ان کی زیارت کی۔ بیوی اور میری بچی ساجدہ ساتھ تھے۔ انہوں نے کھانے کا بڑا اہتمام کیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ کھانا سب لوگ ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے یا مرد اور عورتیں علحدہ علحدہ؟ اور یہ اس لئے دریافت کر رہا ہوں کہ مصر کی جدید تہذیب میں اگر مخلوط طور پر کھانا نہ کھایا جائے تو اسے مہمان کے اعزاز کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ ہم تو پردہ کرتے ہیں، میری بیوی اور بچی اس وقت بھی برقعے پہن کر آئی ہیں۔ چنانچہ ہم نے علحدہ علحدہ کھانا کھایا۔

ڈاکٹر راشد خلیفہ

ڈاکٹر راشد خلیفہ امریکہ کی ایریزونا اسٹیٹ میں توسان (TUCSAN) کی مسجد کے امام ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں قرآن کریم کے ترجمے کے علاوہ متعدد کتابیں لکھیں ہیں، جن میں سے دو حسب ذیل ہیں:

1. The Computer Speaks.
   God's Massage to the World
2. Quran – Visual Presentation of the Miracle

ان کتابوں میں انہوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ قرآن کریم کا یہ اعجاز پیش کیا ہے کہ پورے قرآن میں (۱۹) کے عدد کی رعایت ہے۔ **بسم اللہ الرحمن الرحیم** کے حروف (۱۹) ہیں۔ اس میں چار لفظ ہیں:

۱۔ اسم، ۲۔ اللہ، ۳۔ رحمٰن، ۴۔ رحیم

ان میں سے لفظ "اسم" قرآن میں ٹھیک (۱۹) جگہ ہے۔ دوسرا لفظ "اللہ" قرآن میں (۲۶۹۸) جگہ ہے، یہ مساوی ہے ۱۹ X ۱۴۲ کے۔ تیسرا لفظ "رحمٰن" قرآن میں (۵۷) جگہ ہے، جو مساوی ہے ۱۹ X ۳ کے۔ چوتھا لفظ "رحیم" ہے، یہ قرآن میں (۱۱۴) مقامات پر ہے، جو مساوی ہے ۱۹ X ۶ کے۔

اسی طرح قرآن کی ۱۱۴ سورتیں ہیں یعنی ۱۹ X ۶۔

اس طرح وہ (۱۹) کے عدد کو پورے قرآن پر پھیلاتے جاتے ہیں۔

میں نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی، لیکن ڈاکٹر راشد خلیفہ کے بارے میں مجھے وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ سُنت کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے اذان میں سے "**محمد رسول اللہ**" کو نکال دیا ہے، اس آیت سے استدلال

کرتے ہوئے کہ "أن المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدا"[۳۰] (مساجد اللہ کے لئے ہیں، لہذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو)۔

ان کے افکار میں اس طرح کی اور بھی گمراہیاں ہیں۔

میرے خیال میں ان کی یہ گمراہیاں تو اپنی جگہ ہیں، لیکن اگر واقعتہً انہوں نے (۱۹) کے عدد کو صحیح طور پر پورے قرآن پر منطبق کیا ہے تو بلاشبہ قرآن کا یہ اعجازی پہلو ہو گا، تاوقتیکہ حسابی طریقہ پر ہی اس کی تغلیط نہ کی جائے۔

ایک عجیب بات ڈاکٹر خلیفہ راشد نے یہ کہی ہے کہ سورہ توبہ (نویں سورت) کی آخری دو آیات (لقد جاء کم ...) کے بارے میں ابن کثیر، سیوطی اور بخاری لکھتے ہیں کہ جمع قرآن کے لئے حضرت زید بن ثابت نے جو معیار مقرر کیا تھا اس پر یہ دونوں آیات پوری نہ اتری تھیں۔ اور میرے (۱۹) کے حساب پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

رسول	۱۱۴	جگہ ہے	=	۶ ×۱۹
انفس	۱۵۲	جگہ ہے	=	۸ ×۱۹
رحیم	۱۱۴	جگہ ہے	=	۶ ×۱۹
تولوا	۱۹	جگہ ہے	=	۱ ×۱۹
اللہ	۲۶۹۸	جگہ ہے	=	۱۴۲ ×۱۹
الہ	۹۵	جگہ ہے	=	۵ ×۱۹
توکلت	۵۷	جگہ ہے	=	۳ ×۱۹
رب	۹۶۹	جگہ ہے	=	۵۱ ×۱۹
العرش	۱۹	جگہ ہے	=	۱ ×۱۹

اور اگر سورہ توبہ کی آخری دو آیات میں وارد شدہ ان الفاظ کو ملا لیا جائے تو ہر ایک میں ایک ایک عدد بڑھ جاتا ہے اور پھر (۱۹) سے تقسیم نہیں ہوتا۔

قرآن کریم میں اس طرح کی دقیق رعایتوں کا سراغ دوسرے لوگوں نے بھی لگایا ہے، مثلاً علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں سورہ بقرہ کے حروفِ مقطعات (الم) پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۲۹ سورتوں کے شروع میں حروفِ تہجی کے نصف یعنی (۱۴) حروفِ مقطعات ذکر کئے گئے ہیں اور ان میں بھی یہ رعایت ہے کہ حروف کی قسموں، مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ، رخوہ، مطبقہ، منفتحہ، مستعلیہ، منخفضہ اور قلقلہ۔ ان میں سے ہر قسم کے تحت جتنے حروف آتے ہیں اس کے نصف حروفِ مقطعات میں لئے گئے ہیں۔ اس طرح نصف نصف کی رعایت بھی اعجاز کی ایک صورت ہے۔

مولانا اسعد میاں

مولانا اسعد میاں میرے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران کئی بار یہاں تشریف لائے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں چند احباب کے ساتھ ناشتے پر مدعو بھی کیا۔ گھر میں ٹی۔وی سیٹ دیکھ کر فرمایا: آپ حضرات نے اسے کب سے جائز کر لیا؟

اگر پروگراموں کے بجائے مطلقاً ٹی۔وی سیٹ پر حرمت کا حکم لگایا جائے تو نہ معلوم ایسے حضرات ہوائی اڈوں کے ان ٹی۔وی سیٹوں پر کیا حکم لگائیں گے جن میں ہوائی جہازوں کی آمد و رفت کے پروگرام بتائے جاتے ہیں۔

اسعد میاں جمعیت علمائے ہند کے صدر بھی ہیں۔ میں نے اپنے دارالعلوم دیو بند کے ہم درس اور دوست مولانا افضال الحق صاحب گوہر قاسمی سے، جو حج کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے، دریافت کیا کہ آپ نے تو برسوں اسعد میاں کے ساتھ جمعیت میں کام کیا ہے، بتائیے کہ کیا اسعد میاں میں اپنے والد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی جیسا تقویٰ اور خلوص بھی ہے؟ خاموش ہو گئے۔

جن دنوں میں دیو بند میں زیر تعلیم تھا، اسعد میاں اس وقت چھوٹے تھے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اچھی ہے اور کیوں نہ ہو، انہوں نے تو سیاست کی گود ہی میں پرورش پائی ہے۔ یہ سیاسی سوجھ بوجھ ہی کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم کے اہتمام کے جھگڑے میں انہوں نے اپنے حریف مولوی سالم صاحب کو پچھاڑ دیا اور بیٹے کی طرف داری میں قاری طیب صاحب کو بھی اہتمام سے علیحدہ ہونا پڑا۔ میرے خیال میں یہ جھگڑا اسعد میاں اور مولوی سالم صاحب کا ذاتی جھگڑا تھا جو بچپن سے ایک دوسرے کے حریف چلے آ رہے تھے۔

مولوی عبدالسّلام دہلوی

دہلی کے مولوی عبدالسّلام صاحب ایک مجذوب صفت بزرگ اور جید عالم تھے۔ میرے وطن سرونج کے مولانا عبید اللہ خان صاحب نے دارالعلوم دیو بند سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ ان کے ساتھ بھی گذارا۔ مولانا عبید اللہ خان مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے پاس رہتے ہوئے ان کے مصارف کا چارج میرے پاس تھا اور بکثرت ایسا ہوا کہ پیسوں کی ضرورت ہوئی تو فرمادیا کہ فلاں طاق میں سے لے لو اور مجھے اس طاق سے اتنے ہی پیسے مل جایا کرتے تھے جتنی ضرورت ہوتی تھی۔

غالباً مولانا عبید اللہ خان ہی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ مولوی عبدالسّلام صاحب ایک نکاح کی تقریب میں شریک ہوئے اور چھوہارے تقسیم کرنے کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ خدائی بانٹ بانٹوں یا انسانی؟ کہا گیا کہ خدائی بانٹ سے بہتر کیا ہو گی۔ انہوں نے ایک شخص کو دو تین چھوہارے دیئے دوسرے کو ایک مٹھی، تیسرے کو دو مٹھی اور باقی سب چھوہارے چوتھے شخص کو دے دئے۔ باقیماندہ سب لوگ محروم رہ گئے۔ پوچھا گیا: مولوی صاحب یہ کیا؟ جواب دیا: خدائی بانٹ تو ایسی ہی ہوتی ہے۔

مولانا تمنّا عمادی

مولانا تمنّا عمادی کو میں نے اس وقت دیکھا ہے جب ان کا سفینہ، حیات ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بلخی صاحب مرحوم کے ساتھ پہنچا تھا۔ چشمے پر چشمہ چڑھائے گٹھری بنے گاؤتکیہ سے لگے کچھ لکھ رہے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم نے بتایا تھا کہ ناشتے میں خشخاش بھری ایک ٹکیہ اور شہد ان کا برسوں کا معمول ہے۔ اس لحاظ سے بینائی اتنی کمزور نہ ہونی چاہئے تھی لیکن جب انسان گھوڑے پر ہاتھی کا بوجھ لاد دے تو وہ بھی کیا کرے۔

ایک صاحب کے خاندان میں جو نام رکھے جاتے تھے ان کا مادہ "ف، ض، ل" ہوتا تھا۔ "فاضل، افضل وغیرہ" ۔ان کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی تو تمنا صاحب سے درخواست کی کہ اسی مادہ سے کوئی مناسب نام تجویز کر دیں۔ انہوں نے خاندان کے دوسرے بچے بچیوں کے نام پوچھے۔ پھر فرمایا کہ اس مادہ کے سارے نام تو ہو چکے ہیں اب تو "فضلیٰ" کے سوا اور کوئی نام ذہن میں نہیں آتا۔

"فضلیٰ" اور "افضل" دونوں کے معنی ایک ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ افضل مذکر کے لئے ہے اور فضلیٰ مونث کے لئے۔ لیکن یائے مقصورہ کے بجائے اگر "ہ" تصور کر لی جائے تو کیا معنی ہو جاتے ہیں؟ اور گفتگو میں "ی" اور "ہ" کا کیا تمیز ہوتا ہے۔

قاری فتح محمد صاحب مرحوم

قاری فتح محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جو استاد القراء تھے اور قرأت عشرہ میں مہارت رکھتے تھے اور جن کی بیداری کا بیشتر وقت قرآن کریم کے پڑھنے یا سننے میں گذرتا تھا، انہیں ۲۰۔ مئی ۱۹۷۹ء میں لاہور میں فالج ہوا جبکہ وہ مدینہ منورہ سے کچھ دن کے لئے پاکستان گئے ہوئے تھے۔ فالج ہی کی حالت میں مدینہ منورہ واپس آگئے ایک حافظ صاحب انہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر مسجدِ نبوی لاتے اور لے جاتے تھے اور انہیں قرآن کریم سناتے رہتے تھے۔

۱۷اور ۱۸۔ شعبان ۱۴۰۷ھ کی درمیانی شب میں تین پینتیس پر ان کا انتقال ہوا اور ۱۸۔ شعبان بروز پنجشنبہ (۱۶۔ اپریل ۱۹۸۷ء) بعد ظہر حرم نبوی کے امام علی الحذیفی نے جنازے کی نماز پڑھائی اور بقیع میں دفن ہوئے۔ امام مالکؒ اور امام نافعؒ کی قبور سے قبلے کی جانب نویں قبر ہے۔

مولانا عابد شبّر صاحب

کراچی یونیورسٹی میں ہمارے رفیق کار مولانا عابد شبّر صاحب نے بیان کیا کہ میں نے حج کے لئے درخواست دی اور بعد میں اپنی بیوی کی درخواست بھی داخل کر دی۔ قرعہ میں میرا نام تو آ گیا، بیوی کا نام نہ آیا۔ ہم دونوں کلفٹن پر عبداللہ شاہ صاحب کے مزار پر گئے۔ بیوی نے منت مانی، نیچے اترے تو سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ایک ملنگ نے کہا تو نے حج کی منت مانی ہے، تو ضرور جائے گی۔ بیوی نے کہا کہ قرعہ میں تو میرا نام آیا نہیں۔ کہنے لگا۔ کہہ دیا کہ ضرور جائے گی، نہ جائے تو میرے منہ پر تھوک دینا اور یہی ہوا کہ اسباب خود بخود اس طرح کے پیدا ہو گئے کہ اس سال بیوی میرے ساتھ حج کو آئیں۔

یہ شیعہ حضرات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی سنّی بزرگ زندہ ہو تو خاطر میں نہیں لاتے، مر جائے تو شیعہ سنی کی تفریق کے بغیر منتیں مانتے اور چادریں چڑھاتے ہیں مگر زندوں کے مقابلے میں جنہیں مُردوں سے زیادہ تعلق ہو ان کے لئے یہ بات قابلِ تعجب بھی نہیں۔

ڈاکٹر عابد علی خاں صاحب

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر عابد علی خاں صاحب مراد آبادی میرے ان رفقائے کار میں ہیں جنہیں میں اپنے بزرگوں کی فہرست میں شمار کرتا ہوں۔ بزرگوں کی اولاد ہیں اور خود بھی بزرگ ہیں۔ ان کے دادا حاجی مظفر علی خاں صاحب اور پردادا حاجی گوہر علی خاں صاحب معروف بزرگوں میں سے ہیں۔

شیخ سعدی نے یہ جو کہا ہے "آثار بزرگی در عہد طفلی از جبینش ہویدا" (بچپن کے زمانے ہی سے بزرگی کے آثار اس کی پیشانی سے ظاہر ہوتے تھے) ڈاکٹر صاحب پورے طور پر اس کا مصداق ہیں۔ موروثی اثرات تو تھے ہی، بچپن ہی سے مولانا غالب علی صاحب کے فیض صحبت نے انہیں جلادے کر مزید پروان چڑھایا۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں دس گیارہ سال کی عمر ہی میں مردوں کو قبروں میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے دیکھ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے "گھو" کو دیکھا کہ وہ قبر سے نکلا اور میں نماز میں شامل ہوا تو میرے برابر آکر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے اسے واپس جاتے دیکھا، اپنی قبر پر کھڑا ہوا اور پھر قبر میں غائب ہو گیا۔

فرمایا کہ بچپن میں میرے خواب بسا اوقات سچے ہوتے تھے۔ جیسا دیکھتا تھا ویسا ہی وقوع میں آجاتا تھا اور جب بھی اس طرح کے خواب مولانا غالب علی صاحب سے بیان کرتا تھا، فرماتے تھے: بیٹا عابد خان، تم یہ بھی دیکھ لیا کرتے ہو!

مولانا غالب علی، مولانا محمد تھانوی کے اور وہ حضرت نور محمد جھنجھانوی کے خلیفہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بیعت لڑکپن ہی میں مولانا غالب علی صاحب سے کی اور مدتوں ان سے فیض حاصل کیا، اسی لئے بکثرت ان کے کشف و کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔

مولانا غالب علی صاحب کے منہ سے بکثرت، حتی کے نماز تک میں، بے اختیار زور سے "اللہ" کا نعرہ نکل جایا کرتا تھا، اور ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی باتیں کرتے کرتے جھرجھری آتی ہے اور "اللہ" کا نعرہ ان کے منہ سے بھی بے اختیار نکل جاتا ہے۔

فرمایا کہ رُڑکی میں قاضی اسماعیل صاحب کے پوتے عبدالولی صاحب کی شادی کے موقع پر ان کے مخالفین نے انہیں شرمندہ کرنے کے لئے ان کو مطلع کئے بغیر بہت لوگوں کو مدعو کر لیا۔ کھانے کی قلت اور مہمانوں کی کثرت سے میزبان سخت پریشان تھے۔ مولانا غالب علی صاحب نے اپنا رومال دیگ پر ڈھانک دیا، اس میں سے کھانا نکالتے گئے اور سب نے سیر ہو کر کھایا۔ فرمایا کہ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے دادا پیر قاضی اسماعیل صاحب کا بھی یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ان کے ایک خلیفہ بنارس میں ایک دوکان پر بیٹھے تھے، سامنے سے ناگوں (وہ سادھو جو ننگے رہتے ہیں) کا جلوس گذرا، جن کا سردار ہاتھی پر سوار تھا۔ جونہی ہاتھی سامنے آیا ان کے دل میں خیال آیا کہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سردار فوراً ہاتھی سے اتر کر دوکان میں ان کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور انہیں حکم دیا کہ آنکھیں بند کرو، انھوں نے آنکھیں بند کیں، سادھو نے بھی آنکھیں بند کر کے ان پر روحانی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ فوراً انہوں نے اپنے پیر قاضی اسماعیل صاحب کا تصور کیا، سادھو نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور یہ کہہ کر چل دیا کہ تیرا پیر بڑا زبردست ہے، تیرا پیر بڑا زبردست ہے۔ بعد میں وہ خلیفہ قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا کہ اگر تم میرا تصور نہ کرتے تو وہ تمہیں ہندو بنا کر چھوڑتا۔

دل کی دنیا کا حال بھی عجیب ہے۔ یہ مادی دنیا کی محبتوں اور نفرتوں کی آماجگاہ بھی ہے، روحانی دنیا کے عجائبات کا محور بھی ہے اور اللہ عزوجل کے انوار و تجلیات کا مرکز بھی۔ تاریک ہو تو انسان شیطان بن جائے، روشن ہو جائے تو نہ صرف جبروت

بلکہ ملکوت ولاھوت وھاھوت کی خبر لائے۔

جس طرح جسمانی ورزش جسم کو قوی کرتی ہے، روحانی ریاضت قلب کی نورانیت کا سبب بنتی ہے۔اس میں مومن وکافر کی کوئی تخصیص نہیں۔اسی لئے سادھو نے ان کے دل کا حال معلوم کر لیا۔

صوفیاء کہتے ہیں: "طرق الوصول إلى الله بعدد أنفاس الخلائق (اللہ تک رسائی کے راستے تعداد میں مخلوقات کی سانسوں کے برابر ہیں)۔فرق صرف یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے قیامت تک کے لئے اللہ تک رسائی کا منظور شدہ سرکاری راستہ صرف اسلام کا راستہ ہے۔گویا اخروی نجات کے لئے اب صرف One way trafic ہے۔جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا چالان اور سزا سے نہ بچ سکے گا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ (شخص) آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(پیغمبر کے خلاف جس نے جو راہ بھی اختیار کی وہ منزل (مقصود) تک ہرگز نہ پہنچے گا)

ڈاکٹر صاحب بعد میں حضرت شاہ زوّار حسین صاحب مرحوم سے بیعت ہو گئے تھے۔فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کراچی سے واپس تشریف لے جا رہے تھے، ریل میں سوار ہو چکے تھے، رخصت کرنے والوں میں اسٹیشن پر میں بھی موجود تھا۔میرے دل میں خیال آیا کہ اس مرتبہ حضرت نے میرا سبق نہیں بڑھایا۔فوراً شاہ صاحب نے صوفی محمد احمد صاحب مرحوم کو مخاطب کر کے فرمایا: صوفی صاحب! بن

مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک - پھر فرمایا: صوفی صاحب! عابد صاحب کا سبق بڑھا دینا۔

کسی بزرگ سے اگر جنات کا تعلق ہو تو ان کا یہ تعلق دوستانہ یا منتقمانہ صورت میں ان کی اولاد تک سے قائم رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پردادا حاجی گوہر علی صاحب جنات کو بوتلوں میں بند کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا کہ کبھی کبھی جنات میری والدہ کو بھی ستایا کرتے تھے۔ میری خالہ بعض اوقات آدھی رات کو حویلی کی چھت پر بڑے بڑے پتھر پھینکنے کی آواز سنتیں اور تنگ آکر کہتیں کہ چچا میاں اب تو رحم کرو۔ وہ آواز بند ہو جاتی۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ سردیوں کی راتوں میں والد صاحب دیر سے گھر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو کنڈی خود بخود کھل گئی اور وہ اندر آگئے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا پیچھا جنات نے اب تک نہیں چھوڑا۔ فرمایا کہ گلشن اقبال کے جس مکان میں رہا کرتا تھا اس میں دوسرے غیر معمولی حالات کے ساتھ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک بچہ کمرے میں آیا اور میرے پلنگ کے نیچے گھس گیا، میں نے جھک کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔

فرمایا کہ کراچی یونیورسٹی کیمپس کے B-2 کے جس کمرے میں میری رہائش تھی، ہمیشہ دن کے ٹھیک بارہ بجے ایک بار چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز بارہا میری بیوی نے بھی سنی۔

فرمایا کہ اب بھی گلستان جوہر کے اس مکان میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ میں تسبیح وغیرہ کوئی چیز ایک جگہ رکھتا ہوں اور وہاں سے غائب ہو جاتی ہے، پھر دیکھتا ہوں تو اسی جگہ مل جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا کہ مراد آباد میں ایک بہت بڑا گھر "انگوروالا گھر" کے نام سے معروف تھا۔ اس گھر میں اتنے افراد رہتے تھے کہ تیس سیر آٹے کی روٹیاں ایک

وقت میں بکتی تھیں۔ اس گھر کی ایک بی بی نے اپنی باندی سے رات کے وقت کہا کہ بیت الخلا میں، جو فاصلہ پر تھا، پانی کا لوٹا رکھ آ۔ پھر اس کے ساتھ بیت الخلاء کے لئے نکلیں تو باندی سے کہا کہ تو نے لالٹین تو لی ہی نہیں۔ باندی نے اپنی انگلی پر پھونک ماری، وہ چراغ کی طرح روشن ہو گئی۔ گویا وہ کوئی بد روح تھی، جس نے ان کی باندی کی شکل اختیار کر لی تھی۔

فرمایا: مراد آباد میں ایک مجذوب لڑکی تھی۔ وہ "لا کنی" کہہ کر ایک آنہ مانگا کرتی تھی۔ جہاں یہ بیٹھتی تھی کتے اور کوے اس کے گرد ہوتے تھے اور حلوہ پوری مٹھائی وغیرہ کھایا کرتے تھے۔ جس کتے سے ناراض ہوتی اسے پکڑ کر اس کے حلق تک اپنا ہاتھ ڈال دیا کرتی تھی۔ کسی تانگے کو ٹھہرنے کا اشارہ کرتی اور وہ نہ رکتا تو اسے پیچھے سے پکڑ لیتی، تانگہ سرک بھی نہ سکتا تھا۔

فرمایا: سانپ دیکھ کر "أسكيتْ" کہہ دیا جائے تو اگر وہ جن ہے تو فوراً ٹھہر جاتا ہے اور کتا دیکھ کر اگر "مِنْ قِطْمِيْر" کہہ دیا جائے تو بھاگ جاتا ہے۔

فرمایا: میں ۱۹۳۶ء تک چشمہ لگاتا تھا۔ میں نے ہر فرض نماز کے بعد گیارہ بار "یا نور" پھر تین بار "**فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید**" (پھر ہم نے تیرا پردہ ہٹا دیا چنانچہ آج تیری بینائی تیز ہے) پڑھ کر دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں پر دم کر کے دونوں آنکھوں پر پھیرنا شروع کر دیا تو کچھ عرصے بعد میرا چشمہ چھوٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت (۱۹۹۶ء) اسی (۸۰) کے قریب ہے اور وہ چشمے کے بغیر اخبار پڑھ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو بزرگوں، مجذوبوں اور جنات وغیرہ کے اتنے واقعات ہیں کہ اگر انہیں مرتب کر لیا جائے تو ایک کتاب بن جائے۔ بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں اس طرح کے واقعات سناتے جاتے ہیں، لیکن جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے "پر طبیعت ادھر نہیں آتی"۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب علمی اور ادبی حلقوں کی ایک معروف شخصیت ہیں، لیکن ان کی شخصیت کا ایک رخ اور بھی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان کے اس نسبتہً غیر معروف رخ کی کچھ جھلکیاں پیش کروں۔

"کشفی" ان کے نام کا جز ہے، جسے انہوں نے تخلص کے طور پر بھی اختیار کر لیا ہے۔ پیدائش ہی سے ان کے نام کا یہ لاحقہ شاید قدرتی اشارہ تھا ان کی اس کشفی حالت کی طرف، جس کے شواہد ان کی زندگی میں بکثرت ملتے ہیں اور ان میں موروثی اثرات کا بھی بڑا دخل ہے۔

کشفی صاحب کے جد امجد حضرت شاہ غلام رسول، رسول نما کے بارے میں تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ وہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد اپنے کاندھے پر پڑا رومال کسی نمازی کے سر پر ڈال دیتے اور وہ بیداری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لیتا۔ حضرت شاہ رسول نما کا مزار اب تک مرجع خلائق ہے۔

کشفی صاحب کہتے ہیں کہ میرا میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا، مجھے اور لوگوں کو یقین تھا کہ اگر ریاضی میں پاس ہو گیا تو امتیازی کامیابی یقینی ہے۔ میں امتحان کے لئے جانے سے پہلے فاتحہ پڑھتے مزار پر حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ہر بات اللہ کے اختیار میں ہے، آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا، ہاں اگر آپ روحانی طور پر زندہ ہیں تو اپنے رب سے میری کامیابی کی دعا کیجئے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کوئی کان میں کہہ رہا ہے کہ جیومیٹری کی تیرھویں اور اٹھتیسویں تھیورم میں اور الجبرا کا فلاں فارمولا (جو انہیں یاد نہیں رہا) یاد کر لو۔ میں یاد کرتا ہوا امتحان گاہ پہنچا۔ جب پرچہ ملا تو ساری چیزیں پرچے

میں موجود تھیں۔

کشفی صاحب نے بیان کیا کہ حضرت شاہ رسول نما کے مزار کے سرہانے ہار سنگھار کا ایک بڑا درخت تھا جس کی شاخیں چھت تک پہنچتی تھیں۔ چھت تک مسجد کی سیڑھیوں کے ذریعہ پہنچا جا سکتا تھا۔ ایک بار رمضان المبارک میں دیکھا کہ چھوٹے بھائی ابوالحسنات حقی غائب ہیں۔ ابھی سحری کا وقت باقی تھا۔ تلاوت شروع ہو گئی۔ میں آوازیں دیتا ہوا مسجد میں پہنچا۔ کسی نے کہا اوپر جا کر دیکھو۔ چھت پر پہنچا تو دیکھا کہ یہ کھڑے کانپ رہے ہیں اور دامن ہار سنگھار کے پھولوں سے بھرا ہوا ہے اور بہت سے پھول قدموں میں پڑے ہیں، حالانکہ درخت پر ایک پھول بھی نظر نہ آیا۔ مجھ میں نہیں آیا کہ ہزاروں پھول درخت سے ابوالحسنات کے دامن اور قدموں تک کیسے پہنچے۔ بہت سے پھول میں نے اپنے دامن میں بھرے اور ہم دونوں بھائی گھر چلے آئے۔ ابوالحسنات نے بتایا کہ میں نے سوچا کہ امی اور پھوپھیوں کے دوپٹوں کو رنگنے کے لئے ہار سنگھار کے پھول توڑ لوں، اوپر پہنچا تو نہ جانے کیسے قدم لڑکھڑائے اور میں نیچے گرنے لگا۔ کسی نے روک لیا اور اوپر کھڑا کر دیا اور یہ سارے پھول مجھ تک پہنچنے لگے۔

کشفی صاحب نے بیان کیا کہ میں عشاء کی نماز خاصی تاخیر سے مسجد میں ادا کرتا تھا۔ بارہ بجے کے بعد گرمیوں میں، مسجد کے صحن میں لوگ سوتے تھے۔ میں اندر مسقف حصہ میں چلا جاتا تھا۔ ایک رات فرض نماز کا سلام پھیرا تو دیکھا کہ کئی بلند و بالا لوگ سفید کپڑوں میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ ہمارا راز کسی کو نہ بتانا، ہم حضرت شاہ غلام رسول اور حضرت شاہ احسان الحق کے زمانے سے یہاں مقیم ہیں۔ ہم میں سے کچھ نے دونوں کو دیکھا ہے اور کچھ نے صرف شاہ احسان الحق یا تمہارے دادا شاہ محمد اکبر کو، اجنہ بھی تمہاری طرح جیتے اور مرتے ہیں، مگر ہماری عمریں عام طور پر ڈیڑھ دو سو سال ہوتی ہیں۔

کشفی صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے تاخیر سے نماز پڑھنا ختم کر دیا اور

جماعت سے نماز پڑھنے لگا۔ کہتے ہیں کہ اب بھی جب اس واقعہ کا تصور کرتا ہوں، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کشفی صاحب کی زندگی میں خواب خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ رمضان ۱۴۱۵ھ کو میں مدینہ منورہ پہنچا۔ میرے بیٹے ابو احمد عاکف وہاں ڈپٹی ڈائرکٹر حج تھے۔ طے ہوا کہ ہم سب (بیوی اور بچیاں) حج کے بعد واپس ہوں گے۔ میں نے کہا اگر اجازت مل گئی۔ ہم لوگ قیام میں توسیع کے لئے درخواستیں دیتے رہے اور پندرہ پندرہ دن کی توسیع ملتی رہی اور ہم فی پاسپورٹ سو ریال دیتے رہے دو یا تین توسیعات کے بعد کہا گیا کہ مزید توسیع ممکن نہیں۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر درخواست دے دی۔ ایک صبح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ ایک آرام کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں کاغذ اور قلم ہے۔ آپؐ کے سامنے میں کھڑا ہوں۔ آپؐ میری طرف دیکھ کر تبسم فرما رہے ہیں اور میرے دل کو یقین ہے کہ آپ میرے ہی لئے کچھ تحریر فرمائیں گے۔ میں خواب ہی میں درود و سلام پڑھتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو نعیم حامد علی کھڑے تھے۔ پاسپورٹ ان کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے کہا: مبارک ہو۔

کشفی صاحب نے تقریباً دس گیارہ سال کی عمر میں بھی ایک خواب دیکھا تھا کہ پورے شہر میں پوسٹر لگے ہوئے ہیں کہ سید ابو الخیر کشفی اور شیطان کی کشتی ہو گی۔ عظیم الشان دنگل، کشتی کے دن ایسا ازدحام تھا کہ بیان کرنا مشکل۔ کشتی شروع ہوئی، کبھی ان کا پلہ بھاری ہوتا کبھی شیطان کا۔ ایک مرحلے پر شیطان نے ان کا گلا گھونٹنا شروع کیا۔ انہیں خیال آیا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری دن ہے۔ انھوں نے سورہ اخلاص کی تلاوت شروع کی تو شیطان نے انہیں چھوڑ دیا، انھوں نے پھر سورہ اخلاص کی تلاوت کی تو شیطان کانپنے لگا اور تیسری بار تلاوت کرنے پر دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ مجمع نے انہیں کاندھوں پر اٹھا لیا اور شہر میں جلوس کی صورت میں گشت

کیا۔

ایک مرتبہ کشفی صاحب نے مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی مرحومہ بیٹی زحمی کو خواب میں دیکھا کہ ان کی قبر میں چالیس چراغ ہیں۔ صرف ایک چراغ بجھا ہوا ہے، باقی سب روشن ہیں۔ معلوم ہوا کہ مرحومہ نے چالیس بچیوں کو قرآن پڑھایا تھا، ان میں سے ایک لڑکی قادیانی تھی۔

کشفی صاحب نے اپنی عالم بیداری کا ایک حیرت انگیز واقعہ مجھے یہ کہہ کر سنایا کہ یہ واقعہ آج تک میری زبان پر نہیں آیا، پہلی بار تحدیث نعمت کے طور پر آپ کے سامنے ذکر کر رہا ہوں۔ فرمایا: مسجد نبوی کی موجودہ توسیع سے پہلے بھی عورتوں کے لئے ایک حصہ مخصوص تھا۔ بلقیس (ان کی اہلیہ) اسی حصے میں بیٹھتی تھیں۔ ایک دن میں صفہ (اصحاب صفہ کی نشست گاہ) پر بیٹھا تھا کہ آواز سنائی دی: "آیئے آیئے صحن میں آیئے"۔ میں نے دیکھا کہ صفہ کے بعد جہاں سے صحن کا آغاز ہوتا ہے وہاں بلقیس کھڑی ہیں اور صرف اتنے حصے میں بارش ہو رہی ہے، سورج بھی چمک رہا ہے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچا اور ہم دونوں کھڑے بھیگتے رہے۔ اس عالم سرشاری اور لمحہ انعام میں یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ اس حصہ میں کیسے پہنچ گئیں جو عورتوں کے لئے ممنوع تھا اور یہ کیسے ہوا کہ وہاں صرف ہم دونوں ہیں اور وہ بارش کیا اور کیسی تھی؟ یہ بات آج تک سمجھ میں نہ آسکی۔ اس بارش میں بلقیس کی جرابیں بھیگ گئی تھیں، انہوں نے ان جرابوں کو احتیاط سے رکھ لیا۔ ہماری چھوٹی بیٹی ام ابیھا سلما کے پیروں میں ان دنوں شدید درد ہوتا تھا اور کسی علاج سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ واپسی پر ہم نے وہ جرابیں بیٹی کو پہنائیں اور اس کے بعد سے کبھی درد نہ ہوا۔

کشفی صاحب نے اپنے چند خاندانی اوراد و وظائف کا بھی ذکر کیا۔

۱۔ اگر کسی عزیز کا انتظار ہے اور آنے میں تاخیر ہو رہی ہے یا کوئی چیز گم ہو گئی ہے تو سورۃ والضحیٰ پڑھ کر تین مرتبہ دستک دیجئے۔ انشاء اللہ وہ شخص آجائے گا اور وہ چیز مل

جائے گی۔

۲۔ آنکھوں کی روشنی برقرار رکھنے کے لئے یہ مفید ہے کہ نماز عصر کے بعد سورۃ النبأ کی تلاوت کی جائے اور اسی طرح مغرب کے بعد دو رکعت نفل پڑھے جائیں اور دونوں رکعتوں میں تین تین بار سورۃ الکوثر پڑھی جائے۔

۳۔ جو بچے ہکلاتے ہیں ان پر سورۃ الرحمن کی پہلی چار آیات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا "**واحلل عقدۃ من لسانی**" پڑھ کر دم کیا جائے (اوّل وآخر درود شریف کے ساتھ) اور ہوسکے تو ان سے پڑھوائی جائیں۔ انشاء اللہ مرض ختم ہو جائے گا

کشفی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اگر سانپ دیکھ کر "**إنهم يكيدون كيداً وأكيد كيدا**" پڑھ دیا جائے تو سانپ وہیں ٹھہر جاتا ہے اور اگر پوری آیت "**فمهل الكافرين أمهلهم رويدا**" پڑھ دی جائے تو بھاگ جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد صابر صاحب

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ اسلام کے پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر الہ آبادی سے میرا رفاقت کا تعلق بھی رہا اور ہمسائیگی کا بھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک ذہین، خوش طبع، حاضر جواب اور مرنجان مرنج انسان ہیں۔ اپنے کراچی یونیورسٹی کے رفقائے کار میں سے مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کے سوا، جو میرے بچپن کے ساتھی تھے، میں کسی اور سے اتنا بے تکلف نہیں رہا جتنی بے تکلفی مجھے ڈاکٹر صابر سے تھی اور ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک عبرت انگیز قصہ یہ سنایا کہ سلطان بایزید اوّل نے بورصہ میں ایک مسجد "جامع سلطان" بنوائی۔ تعمیر کے بعد شیخ الاسلام اور انجینئر کو لے کر معائنے کے لیے گئے۔ شیخ الاسلام نے مسجد کی خوبصورتی کی تعریف کی، لیکن کہا کہ اس میں ایک خامی رہ گئی۔ انجینئر کانپ گیا۔ سلطان نے دریافت کیا: وہ کیا؟ جواب دیا کہ اس میں انجینئر نے سلطان کی شراب نوشی کے لئے کوئی کمرہ نہیں بنایا۔ سلطان نے اسی روز سے شراب نوشی ترک کر دی۔

ناظم ظہیرالدین صاحب مرحوم

میں جس زمانے میں ٹونک کی عدالت شرع شریف میں مفتی تھا، میں نے خود بعض ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو یکمشت و دو انگشت کی ڈاڑھیاں رکھے عدالت کے باہر موجود رہتے تھے اور دو دو روپے میں جھوٹی شہادتیں دیتے تھے۔ یہ اس لئے کہ اس عدالت میں کسی شاہد کی شہادت اس وقت تک قبول نہ ہوتی تھی جب تک اس کا چہرہ کم از کم یکمشت ڈاڑھی سے آراستہ نہ ہو۔

اس عدالت کے ایک ناظم ظہیرالدین صاحب کا واقعہ ہے کہ کسی نے عدالت شریعت میں مقدمہ دائر کیا اور شہادت میں نواب سعادت علی خان کو لکھوا دیا۔ سمن جاری ہو گیا اور نواب صاحب کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ نواب صاحب آکر اسی فرش پر جہاں گواہ بیٹھتے تھے، بیٹھے تو ناظم صاحب نے نظر اٹھائے بغیر دریافت کیا: گواہ کا نام؟ جواب: سعادت علی خان۔ باپ کا نام؟ جواب: نواب ابراھیم علی خان۔ نواب کیا ہوتا ہے، سیدھا نام بتاؤ۔ جواب: ابراھیم علی خان۔ ناظم صاحب نے اسی طرح نظر اٹھائے بغیر پیشکار سے کہا کہ دیکھو گواہ کے چہرہ پر ڈاڑھی ہے یا نہیں۔ پیشکار نے جواب دیا: نہیں۔ ناظم صاحب نے پیشکار سے فرمایا کہ گواہ سے کہہ دو کہ ڈاڑھی منڈانے کی وجہ سے وہ فاسق ہے اور فاسق کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، اس لئے وہ جا سکتا ہے۔ نواب صاحب نے یہ سن کر جواب دیا: "ناظم صاحب شریعت کا حکم سر آنکھوں پر، میں جاتا ہوں" اور اٹھ کر چلے آئے۔ جب شریعت کی روح کو نظرانداز کر کے اس کی صرف لفظی تعمیل کی جائے تو اسی طرح کے واقعات سامنے آتے ہیں۔

ناظم صاحب قائم اللیل اور صائم النہار بزرگ تھے۔ اس زمانے میں ایک روپے کی تیس روٹیاں آتی تھیں۔ افطار کے لئے ایک روپے کی روٹیاں منگواتے، ۲۹

تقسیم کر دیتے اور خود ایک روٹی پر اکتفا کرتے۔

ناظم صاحب طبیب بھی تھے اور اتنے حاذق کہ قارورہ دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ اتنے ماہ کا حمل ہے۔

ناظم صاحب میں ایک بری عادت یہ تھی کہ عدالت میں بیٹھے ہوئے بھی ان کے منہ سے بے اختیار لفظ "سالا" نکل جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ نواب سعادت علی خان نے ان سے کہا: ناظم صاحب! سنا ہے آپ عدالت میں بھی گالیاں بکتے ہیں! جواب دیا: کون سالا کہتا ہے۔

حکیم سید محمود احمد برکاتی

اخلاص و مروت، عجز و انکسار اور محبت و صداقت کو اگر کوئی شخص مجسم دیکھنا چاہتا ہو تو اس کے لئے حکیم سید محمود احمد صاحب برکاتی کو دیکھ لینا کافی ہو گا۔

اعلیٰ درجے کے علمی اور تحقیقی ذوق کے ساتھ ساتھ کریمانہ اخلاق کی جس بلندی پر وہ فائز ہیں، میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ میرے صف اول کے مخلص دوستوں کی مختصر سی فہرست میں برکاتی صاحب بھی شامل ہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان جیسے شخص نے مجھ جیسے شخص کو بھی اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔

بھٹو صاحب نے جب قادیانوں کو پارلیمنٹ سے کافر قرار دلوایا تو میں نے برکاتی صاحب سے اس کارنامے کی تعریف کی کہنے لگے کہ یہ جماعت اسلامی کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ میں نے غصے سے کہا کہ آپ ہر اچھائی کو اپنی جماعت کی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے کہ آپ چونکہ کسی جماعت سے وابستہ نہیں اس لئے جو اچھائی یا برائی جس جماعت میں دیکھتے ہیں اسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، لیکن جو شخص کسی جماعت سے وابستہ ہو اگر وہ ہر خوبی کو اپنے اور ہر خرابی کو مخالف کے پلّے میں نہ ڈالے تو اس کی جماعت پروان نہیں چڑھتی۔

اس زمانے میں برکاتی صاحب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔

میری سعودی عربیہ کی ام القریٰ یونیورسٹی کی ملازمت کی بنیادی اینٹ کراچی کے ایس۔ ایم۔ کالج کی ملازمت ہے۔ اسی ملازمت سے ترقی کر کے میں سندھ یونیورسٹی، پھر کراچی یونیورسٹی اور اس کے بعد ام القریٰ یونیورسٹی میں پہنچا۔ اپنی کتاب "حیات بقا" میں ایس۔ ایم۔ کالج کی ملازمت کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ

لکھ چکا ہوں کہ میری یہ ملازمت اللہ کے فضل کے ساتھ ساتھ اسباب کی دنیا کی حد تک برکاتی صاحب کی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔ اللہ انہیں دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے۔

حکیم صاحب نے جب لیاقت آباد میں اپنا مطب کھولا تو وہ مجھے مفت دوا دیا کرتے تھے اور مجھے بھی تعلقات کی نوعیت کے اعتبار سے قیمت پوچھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ایک عرصے بعد بالآخر میں نے یہ شرم توڑ دی اور جب قیمت لینے پر بہت اصرار کیا تو لینے لگے، لیکن ہر بار میں جانتا تھا کہ یہ دوا کی قیمت نہیں صرف قیمت کا نام ہے۔

برکاتی صاحب ایک ذہین طبیب ہیں اور ان کے سینے اور سفینے میں بے شمار نسخے ہوں گے۔ ایک نسخہ جو انہوں نے مجھے کمر کے درد کے لئے بتایا وہ درج کر رہا ہوں۔ ہم وزن خشک ہڑ، بہیڑہ اور آملہ لے کر سب کو ملا کر کوٹ کر لیا جائے، پھر انہیں آٹھ گنا پانی میں بھگو کر چوبیس گھنٹے بعد پانی پھینک دیا جائے۔ اس طرح تین بار کیا جائے، چوتھے روز کا پانی نتھار کر کسی لوہے کی کڑھائی یا توے میں، جس میں زنگ بالکل نہ ہو (جیسے دودھ والوں کی کڑھائی ہوتی ہے)، تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر سارا پانی جلا لیا جائے۔ کڑھائی کی تہ میں جو نمک جما ہو اسے کھرچ لیا جائے اور اس میں سے ایک رتی نمک روزانہ کیپسول میں رکھ کر کھا لیا جائے۔ میں نے اس پر عمل کیا۔ ایک مرتبہ میں صرف پندرہ روز کی خوراک نکلی، لیکن پندرہ روز ہی میں کمر کا درد کافور ہو گیا اور بھوک اتنی بڑھ گئی کہ باید و شاید۔ یہ نمک بے انتہا تیز ہوتا ہے۔ کیپسول کے بغیر کھایا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سینے کی پوری نالی کٹ گئی۔ یہ نمک بینائی اور دماغ کے لئے بھی بہت مفید ہے۔

ایک سال کراچی میں آموں کے درختوں میں کیڑا لگ گیا اور پورے پورے درخت سیاہ ہو گئے۔ یونیورسٹی کیمپس میں بھی، جہاں میری رہائش تھی، لوگوں کے گھروں میں بکثرت درخت تھے۔ خود میرے مکان میں بھی اچھے قسم کے بڑے بڑے تین

آموں کے درخت تھے۔ یونیورسٹی میں حالانکہ نباتیات کا شعبہ ہے اور اس سے وابستہ متعدد اساتذہ کیمپس میں رہتے تھے، لیکن کوئی بھی درختوں کی اس بیماری کا علاج نہ کر سکا اور سب نے درخت کٹوا دیئے۔ ایک روز برکاتی صاحب مکان پر تشریف لائے، آموں کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ برمے سے ان درختوں کے تنے میں جڑ سے تقریباً ایک گز اوپر سوراخ کرو، اس طرح کہ برما تھوڑا سا نیچے کی طرف مائل ہوتے ہوئے تنے کے وسط تک پہنچ جائے۔ پھر ہر درخت کے سوراخ میں ایک تولہ پارہ ڈال کر نکلے ہوئے برادے کو سوراخ میں بھر کر اسے مٹی سے بند کر دو۔ میں نے یہ عمل کیا تو چند روز میں درختوں کی ساری سیاہی دور ہو گئی اور پھر کئی سال تک درخت صحیح حالت میں قائم رہے۔

برکاتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ قصہ سنایا کہ نواب اسماعیل خان کے زمانے میں ٹونک کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں جوش صاحب بھی مدعو تھے۔ رات کو جب دونوں پینے پلانے بیٹھے تو سرور کے جوش میں جوش صاحب کی زبان سے نکلا: اسمٰعیل علی خان! اگر اس وقت نواب ابراہیم علی خان (نواب صاحب کے دادا) اور نواب محمد خان (جوش کے دادا) زندہ ہوتے اور ہمیں اس حال میں دیکھ لیتے تو اتنے جوتے مارتے کہ گنے نہ جاتے۔ نواب اسمٰعیل علی خان نے کہا: جوش صاحب۔ دادا زندہ نہیں تو کیا ہوا، ایک زندہ، جاوید ہستی تو ہے جو ہمیں دیکھ رہی ہے اور ہر طرح کی سزا دینے پر قادر ہے۔ یہ کہہ کر اسی وقت جام توڑ دیا اور کہا: جوش صاحب! اس مرتبہ تو آپ کا جب تک ٹونک میں قیام ہے شراب ملے گی، لیکن آئندہ اس توقع پر نہ آئیے گا کہ آپ کو شراب مہیا کی جائے۔

ایک مایوس مریض نے برکاتی صاحب کے علاج سے شفا پا کر انہیں کیمیا کا نسخہ بتانا چاہا۔ برکاتی صاحب کی عالی ہمتی اور استغنا، کہ سیکھنے سے انکار کر دیا، حالانکہ لوگ اس دھن میں عمریں گنواتے اور پیسے پھونکتے رہتے ہیں۔

برکاتی صاحب طبیب، عالم اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ اپنے اشعار وہ صرف مخصوص احباب کے سامنے زبان پر لاتے ہیں۔ بعض متفرق اشعار حسب ذیل ہیں:

جھکی جھکی سی نگاہیں، رکے رکے سے نفس
لیا گیا ہے مرا کتنے اہتمام سے نام

ooo

گُلوں میں بھی رنگ اور خوشبو ہے لیکن
تمہارے بدن کی سی گرمی نہیں ہے

ooo

نظارہ کر رہا ہوں نئے رُخ سے آپ کا
خود آ گیا ہوں آج میں اپنے ہی روبرو

ooo

دل ابھی تک ہے مرے قابو میں
اور دو ایک شکن گیسو میں

ooo

سوچتا ہوں آج پہلی بار ان کو دیکھ کر
جانے کتنی بار دیکھا تھا یہ چہرہ خواب میں

ooo

اتفاقاً آپڑی تھی رُخ پہ زلف
کتنے افسانوں کا عنوان بن گئی

برکاتی صاحب نے بعض نعتیں بھی بہت نفیس کہی ہیں۔

جام صاحب

جام صاحب نواب سعادت علی خان کے استاد تھے اور ان کی غزلوں پر اصلاح دیا کرتے تھے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ نواب صاحب کے نام سے خود غزلیں کہا کرتے تھے۔ بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ پیشانی پر گٹا، ہر وقت ہاتھ میں تسبیح اور تہجد گذار۔ نواب صاحب کے تھیٹر کے لئے مکالے اور گانے لکھنا اور اداکاروں کو تیار کرنا یہ بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ موصوف نے ایک ٹھمری لکھی اور اس میں ایک عام محاورے کو بڑی خوبصورتی سے الٹا۔ مشہور ہے "جو سویا سو کھویا"۔ جام صاحب نے جو ٹھمری لکھی پوری تو مجھے یاد نہیں، اس کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی بیوی کے خوشامدیں کرنے اور پیر پڑنے کے باوجود شوہر نوبیاہتا بیوی کو لے کر پردیس چلا گیا۔ پہلی بیوی نے ایک روز خواب میں شوہر کو گھر میں آتے دیکھا تو چیکی، کہتے ہیں:

جب راج کے پیاں پرن برھی ۔۔۔ من ہوک سے موری آنکھ کھلی
سب سوئے کے کھوئیں اے ری سکھی ۔۔۔ میں جاگ کے واکھو کھوئے گئی۔

جام صاحب ہی کا ایک استادانہ شعر ہے۔ الفاظ کے تغیر و تبدل سے کیا کام لیا ہے۔

میں مر چکوں تو وہ آئیں یہ انتظار انہیں
وہ آچکیں تو مروں میں یہ انتظار مجھے

جام صاحب کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں

کاش اتنا تو بڑھے جذبِ جنونِ الفت
کوئی پتھر کہیں پھینکے مرے سر تک پہنچے

○○○

شادابیٔ چمن کو حسرت سے دیکھتا ہوں
انجام میں نظر نے بے کار کردیا ہے

ooo

یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں   ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں
انہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں   مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

واصف ملک صاحب

انٹراور بی ۔اے کے امتحانات کے سلسلے میں جب بھی میں لاہور گیا میں نے واصف ملک صاحب کی کلاسوں میں شرکت کی ۔ واصف ملک صاحب نے لاہور میں ایک کوچنگ سینٹر قائم کر رکھا تھا اور خاص طور پر امتحانات کے زمانے میں امتحانات کی تیاری کراتے تھے سہرہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز اور بدن پر استری کیا ہوا بہترین بے داغ سوٹ ۔ انگریزی یا تو واقعتہً FLOWERY بولتے تھے یا پھر اس لئے FLOWERY معلوم ہوتی تھی کہ اس زمانے میں بلکہ اب تک میری انگریزی اور انگریزی ہی کیا ہر زبان و علم کی استعداد ناقص ہے ۔ ظاہر میں مسٹر تھے اور باطن میں صوفی وملا ۔ ملائیت کی قدرِ مشترک نے انہیں مجھ سے زیادہ مانوس کر دیا تھا ۔

انٹر کے پرچوں سے فارغ ہو کر عشاء کے بعد حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر مراقب تھا کہ ایک مردانہ ہاتھ نظر آیا ۔ کافی چوڑی کلائی اور کلائی پر کافی بال ، ہاتھ میں ایک فریم تھا اور اس کے اندر سرٹیفیکٹ جیسا کوئی کاغذ ۔

کراچی پہنچ کر مولوی نیاز احمد صاحب مجسٹریٹ مرحوم سے ذکر کیا (وہی نیاز احمد صاحب مرحوم جنہوں نے بچپن میں قرآن سر پر رکھوا کر مجھ سے نہ بھاگنے کی قسم لی تھی اور جس کے بعد میں پڑھنے سے کبھی نہیں بھاگا) ۔ ان کی اہلیہ مرحومہ ، جنہیں ان کی اولاد اور ہم بھی بوا کہتے تھے ، قریب ہی ایک چوکی پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں ۔ مجسٹریٹ صاحب نے بوا سے کہا کہ ذرا داتا صاحب سے پوچھو تو کہ کیا یہ پاس ہو جائے گا ؟ بوا نے قرآن شریف بند کیا ، مراقب ہو گئیں تقریباً تین منٹ بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ ہاں داتا صاحب کہتے ہیں کہ یہ پاس ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا بھی ۔

دوسرے سال بی ۔اے کے امتحان سے فارغ ہو کر حسبِ عادت عشاء کے بعد

داتا صاحب کے مزار پر جا بیٹھا۔ کسی بے پناہ مشغولیت، خصوصاً امتحان کی جان لیوا مشقت کے بعد اگر انسان دنیا سے آنکھیں بند کر کے دماغ کو اللہ کے سوا ہر خیال سے پاک کر کے اپنے اوپر مردوں جیسی کیفیت طاری کر لے اور کسی قبر کے قریب مراقب ہو جائے تو اس سے سکون ملتا ہے کیونکہ دو ہی تو قدرتی مسکن ہیں، عارضی مسکن نیند اور دائمی مسکن موت، بشرطیکہ اعمال ایسے نہ ہوں کہ "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" اور نیند کے بارے میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ "**النوم اخوالموت**" "نیند موت کی بہن ہے" (اردو محاورے کی وجہ سے مذکر کو مؤنث بنانا پڑا)۔

مجھے بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ کوئی صاحب میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ خیال ہوا کوئی نادان دانا ہوگا۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ انھوں نے زور زور سے حق حق کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ میں نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں کہ مظاہر جنوں کی طرف کون ملتفت ہو۔ جوش ٹھنڈا ہوا تو میری ران تھپتپائی۔ اس دخل درمراقبات پر میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا واصف صاحب ہیں۔ کہنے لگے اٹھو، تمہیں چائے پلاؤں۔ ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے فرمایا کہ قیامت میں اللہ کے اس سوال پر کہ کیا لائے ہو یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ بی۔اے کی ڈگری لایا ہوں، اس لئے اس طرف زیادہ توجہ کرو جو وہاں کام آئے۔ فرمایا کہ لوگ جمعہ کے لئے جاتے ہیں۔ اصل میں دینی جذبہ اور فرض کی ادائیگی کا احساس انہیں مسجد لے جاتا ہے۔ وہاں وہ خطیب کی باتیں بھی کڑوے گھونٹ کی طرح سن لیتے ہیں۔ تمہاری کلاس میں (میں اس زمانہ میں ایس۔ایم۔کالج کراچی میں لکچرر تھا) جو طبقہ آتا ہے اسے کوئی دینی جذبہ نہیں لاتا، بلکہ اس میں سے اکثر دین سے بیزار ہوتے ہیں۔ ان میں دین کا ذوق پیدا کرنا دین کی بڑی خدمت ہے اور اللہ کے یہاں کام آنے والی چیز بھی۔ لوگ تو پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ کام کیا کرتے تھے، اور اللہ نے تمہارے لئے یہ موقع اس طرح فراہم کر دیا کہ پیٹ کی خدمت بھی ہے اور دین کی خدمت کا موقع بھی۔

لاہور سے واپس آکر واصف ملک صاحب کی اس "جام وسنداں باختن" کی کیفیت جب میں نے اپنے مرشد حضرت شاہ زوّار حسین صاحب مرحوم کو لکھی تو جواب یہ آیا کہ ملامتیہ فرقے کی یہی کیفیت ہوتی ہے "ظاہر تاریک باطن روشن" لیکن؛

کچھ فرق انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

مدتوں کے بعد ایک مرتبہ پھر لاہور جانا ہوا تو واصف ملک صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اس وقت دورانِ گفتگو فرمایا کہ میں امتحانات کے بعد اپنے سارے طلبہ کے نام لکھ کر پیر صاحب دیول شریف کی خدمت میں بھیج دیتا ہوں کہ جو کام میرے کرنے کا تھا میں نے کر لیا، آگے کی بات آپ جانیں اور آپ کا خدا جانے۔

قاضی ایوب صاحب

ٹونک کے قاضی ایوب صاحب جو میرے بعد عدالت شرعیہ کے مفتی بھی ہوئے، بڑے ظریف عالم و شاعر تھے۔ زاغ تخلص کرتے تھے۔ لیکن جس طرز کے ظریفانہ اشعار کہا کرتے تھے، چونکہ وہ ان کے علمی بھرم اور ثقاہت کے لئے زیب نہ دیتے تھے، اس لئے اپنے ایک شاگرد کو اپنا کلام عنایت فرما دیتے تھے اور وہی زاغ بن کر اصالتہً نہ کہ نیابتہً مشاعروں میں سنایا کرتا تھا۔ لیکن سب جانتے تھے کہ؛

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(آئینے کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہوا ہے،
استاد ازل جو کہتا ہے وہی میں بھی دہراتا جاتا ہوں)

ان شاگرد کی ایک دوکان بھی تھی جس کے بورڈ پر کوے کی چونچ میں انگور کا خوشہ دکھایا گیا تھا اور اس کے نیچے قاضی صاحب ہی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا:

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

یہ تو میں جانتا ہوں کہ شاگرد کا رنگ سیاہی مائل تھا لیکن اگر یہ نقاب کشا شعر نہ ہوتا تو ان کی بیوی کے رنگ کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

ایک مرتبہ عیش صاحب ٹونکی نے دعوت کی۔ میں بھی موجود تھا۔ گرمی کی دوپہر تھی لہٰذا قاضی صاحب بار بار پانی پی رہے تھے۔ عیش صاحب نے کہا: قاضی صاحب کچھ کھائیں گے بھی یا پانی ہی سے پیٹ بھریں گے! فرمایا: تمہیں معلوم ہی نہیں، زیادہ کھانے کا اصول ہی یہ ہے کہ پہلے حلق تک پانی بھر لو، پھر جو لقمہ ڈالو گے عناپ سے

ڈوبتا چلا جائے گا۔

ایک مرتبہ چند علماء کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سامنے سے "انتا" نام کا ایک ہندو کلال آیا، قاضی صاحب بولے: آہا! جنتی آرہا ہے۔ کسی نے کہا: قاضی صاحب، کافر اور جنتی! فرمایا: یہی نہیں اس کی بیوی بھی جنتی ہے۔ معترض بولے: غضب خدا کا قاضی صاحب، توبہ کرو، کیا کہہ رہے ہو۔ فرمایا: میں کیا کہہ رہا ہوں، قرآن یہی کہتا ہے۔ اور جب لوگ آنکھیں پھاڑے انہیں گھورنے لگے تو بڑی سادگی سے فرمایا: کیا قرآن میں یہ نہیں "انت و زوجک الجنتہ" (حضرت آدم سے فرمایا گیا تھا) تم اور تمہاری بیوی جنت میں (رہو)۔

ایک مرتبہ قاضی صاحب نے ایک شخص کی خیریت دریافت کی۔ اس نے جواب دیا: آنکھیں آئی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا: انشاء اللہ چلی جائیں گی۔

ایک مرتبہ قاضی صاحب نے ایک شخص کی خیریت دریافت کی۔ اس نے جواب دیا: آنکھیں آئی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا: انشاء اللہ چلی جائیں گی۔

ایک مرتبہ گرمی کی دوپہر میں ناظم شریعت قاضی صاحب کا مکان پر آرام کر رہے تھے، جو ان کے بے تکلف دوست تھے۔ ایک شخص قاضی ایوب صاحب کے گھر پہنچا اور وہاں سے یہ معلوم کر کے کہ فلاں صاحب کے گھر گئے ہیں یہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صاحب مکان نے پوچھا کون؟ جواب دیا: فلاں ...، قاضی ایوب صاحب ہیں؟

قاضی ایوب صاحب نے فوراً التجاء کی: ارے یار کہہ دے کہ نہیں ہیں، اس شخص نے پریشان کر رکھا ہے۔ قاضی صاحب کچھ ایسے غائب دماغ ہوئے کہ بڑے ثقہ لہجے میں فرما دیا: نہیں بھائی وہ یہاں نہیں ہے۔ اور جیسے ہی ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، قاضی ایوب صاحب فوراً زور سے بولے: میں یہاں موجود ہوں۔ یہ ناظم شریعت ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ قاضی صاحب نے التجاء کی: ارے ظالم کیوں مجھے بدنام کرتا ہے!

فرمایا کہ: ہاں تو تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ اگر میں کنویں میں گرنے کو کہتا تو کیا تم گر جاتے؟

ایک مرتبہ ٹونک میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ اسی مشاعرے میں ماہر القادری مرحوم نے اپنی مشہور غزل پڑھی تھی، جس کا ایک شعر ہے:

اے دوست چاک دامنِ یوسف کا واسطہ
آجا کبھی تو دستِ زلیخا لئے ہوئے

قاضی صاحب نے بھی اس زمین میں غزل کہی تھی۔ اس کا ایک شعر ہے:

وہ آگے آگے وصل کا اقرار ساتھ ساتھ
میں پیچھے پیچھے سر پہ ہوں کھٹیا لئے ہوئے

جگر کی ایک غزل کا مقطع ہے:

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

قاضی صاحب نے اس پر تضمین کی۔ "جگر" اور "آج" کی کیسی مٹی پلید کی ہے۔

یار پرلے دن طبیعت اپنی آئی یار پر
پھیپھڑا پرسوں کیا قرباں ادائے یار پر
دل فدا کل کر دیا تھا حسن ہائے یار پر
جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

یاد نہیں رہا کہ تیسرے مصرعہ میں "حسن ہائے" تھا یا کچھ اور کہتے ہیں:

کہتے ہیں:

اک بلا ہے، عذاب ہے شادی — رہ گئے بن کے نقشِ فریادی
آج دے کر طلاق بیوی کو — ہم منائیں گے جشنِ آزادی

مولوی عبدالکریم صاحب

سرونج میں مولوی عبدالکریم صاحب ایک بزرگ تھے ۔ چونکہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اس لئے چمڑے والے مولوی صاحب کے نام سے مشہور تھے ۔ ناشتے کے بعد ڈاک خانے جاکر اپنی ڈاک خود لانا ان کا روز کا معمول تھا، تاکہ کاروباری خطوط کسی دوسرے کے ہاتھ نہ پڑیں ۔ فرماتے تھے کہ تجارت نام ہی رازداری کا ہے ۔ ڈاک سے فارغ ہوتے تو صندوقچہ لے کر ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے، مانگنے والوں کا تانتا بندھ جاتا اور ہر ایک کو مٹھی بند کرکے ایک ایک پیسہ دیتے جاتے ۔ پنج وقتہ نماز، جمعہ اور عیدین اور ڈاک کے علاوہ کسی نے انہیں کسی کام کے لئے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا۔ البتہ نمازِ جنازہ اور دفن میں شرکت کا حال معلوم نہیں ۔

مولوی صاحب بہت ذہین آدمی تھے ۔ کسی نے پوچھ لیا کہ مولوی صاحب والدین اور اولاد کی رگوں میں حالانکہ ایک ہی خون گردش کرتا ہے لیکن والدین کے دل میں اولاد کا جو درد ہوتا ہے وہ درد اولاد کے دل میں والدین کا نہیں ہوتا ۔ فرمایا: واہ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی ۔ چھری لے کر ران سے ایک بوٹی کاٹو اور اسے دور پھینک دو، درد کہاں ہوگا، ران میں یا بوٹی میں ؟

چمڑے کے کاروبار کی وجہ سے قصائیوں سے دن رات کا سابقہ تھا، لیکن ذہانت کے باوجود فرماتے تھے کہ ساری عمر گذر گئی لیکن قصائی کی ذات کو میں اب تک ٹخنوں تک بھی نہیں سمجھ سکا۔

مولوی عبداللہ صاحب

مولوی عبداللہ چمڑے والے مولوی صاحب کے صاحبزادے تھے، باپ ہی کی طرح ذہین۔ دیو بند کے فارغ التحصیل تھے۔ کہنے کو عالم کہلاتے تھے لیکن اسی طرح جیسے زنگی کا نام کافور۔ حافظہ ایسا پایا تھا کہ کافیہ کی عبارتوں کی عبارتیں زبانی یاد تھیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں کو فرفر دہراتے تھے۔ سرونج میں رزق سے تنگ ہوئے تو بمبئ جاکر ایک مسجد میں امام ہوگئے اور بزرگی کا ایسا ڈھونگ رچایا کہ ثریا اور نرگس تک زیرِ دام آگئیں۔ کہتے تھے کہ جب سرونج کے مفتی صاحب بمبئ میں میرے مہمان ہوئے تو ثریا یا نرگس (صحیح طور پر یاد نہیں رہا) نے ان کی دعوت کی اور ایک نامُ پیس بھی بطورِ نذر پیش کیا۔

بمبئ سے جھولیاں بھرنے کے بعد ٹونک میں ایک حویلی خریدی اور سنا ہے وہیں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔

ان صاحب نے ایک مرتبہ کسی صاحب کو سڑک کے کنارے ڈھیلا لیتے دیکھا اور بے خیالی میں سلام کر لیا۔ آگے بڑھے تو خیال ہوا کہ ایسی حالت میں تو سلام کرنا منع ہے، پلٹے اور کہا: ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔

ایک مرتبہ کہنے لگے: نواب سعادت علی خان اگر بھرے بازار سے ننگے پیر گذریں تو لوگ کہیں گے: کیا عاجزی وانکساری ہے اور اگر عبداللہ (وہ خود) اس طرح گذرے تو کہیں گے سالے کو جوتا بھی نصیب نہیں۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

(تواضع متکبروں کے لیے تو خوبی ہے
لیکن فقیر اگر تواضع کرے تو یہ تو اس کی عادت ہے)

انگریزی دور میں سونے کے نوٹ پر شیر کی تصویر ہوتی تھی، کہنے لگے: میاں پیسے میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ اگر دو وقت کا فاقہ ہو لیکن جیب میں ایک شیر چھاپ پڑا ہو تو جب ڈکار آتی ہے شیر جیسی آتی ہے "غاؤں" اور جب جیب میں ایک پائی بھی نہ ہو تو چاہے ابھی کھا کر نکلے ہوں ڈکار مسکین بلی کی طرح آتی ہے "میاؤں"۔

اگر زندہ ہیں تو اللہ بعافیت رکھے اور انجام بخیر فرمائے۔

ماسٹر سعید الحسن خان صاحب

ماسٹر سعید الحسن خان صاحب جے پوری سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میرا تقرر دوجانہ کے اورینٹل کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ہوا۔ ماسٹر صاحب دوجانہ کے ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ دوجانہ میں ملازمت کے بعد انہوں نے جے پور واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس عرصے میں چونکہ ان سے میری ملاقات کی نوعیت بالکل گھریلو قسم کی ہو چکی تھی اس لئے وہ مجھے بھی اپنے ساتھ جے پور لے گئے۔ پہلے وہ جے پور کے مسلم ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب وہ دوبارہ واپس آئے تو سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے اسکول جوائن کر لیا اور عربی اور اردو پڑھانے کے لئے مجھے بھی اسی اسکول میں ملازم رکھوا دیا۔ اور مجھے اپنے ساتھ اپنے ہی مکان میں رکھا۔

ماسٹر صاحب کو انگریزی اور حساب پڑھانے میں مہارت تھی اور ظاہر ہے کہ ان دو مضمونوں کی ہمیشہ قدر رہی ہے۔

اسکول کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ماسٹر صاحب نے بازار میں چٹنی، اچار، بسکٹ وغیرہ کی ایک دوکان بھی کھولی ہوئی تھی۔

ماسٹر صاحب نے جے پور آنے کے چند ماہ بعد ایک بڑی بلڈنگ کی ایک پوری منزل کرایہ پر لی، ایک حصہ میں رہائش اختیار کی اور دوسرے حصہ کو میٹرک کے طلبہ کے لئے ہوسٹل بنایا اور اس پوری منزل کا کرایہ وہ ہوسٹل کے طلبہ سے لیتے تھے۔

ان کا روزمرہ کا معمول یہ تھا:

فجر کی نماز پڑھ کر دوکان پر جانا، نو بجے تک دوکانداری کرنا اور ساتھ ہی ان

لڑکوں کو پڑھاتے بھی جانا جو ٹیوشن کے لئے ان کی دوکان پر آجایا کرتے تھے۔ نو بجے تک۔ اگر گھر سے کھانا نہیں آیا تو تنور سے روٹی منگوائی اور اچار، چٹنی نکال کر کھالی، پھر اسکول چلے گئے۔ اسکول سے شام کو سیدھے دوکان پر آئے اور مغرب تک کے لئے پھر دوکانداری اور ٹیوشن میں مشغول ہو گئے۔ مغرب کی نماز گھر جاکر پڑھی اور کھانا کھایا، پھر عشاء کی نماز پڑھ کر ہوسٹل کے لڑکوں کو دو گھنٹہ پڑھایا اور پھر سو گئے۔ تہجد کے وقت لڑکوں کو اٹھا کر پھر انہیں ایک گھنٹہ پڑھایا، پھر فجر کی نماز پڑھ کر دوکان پر چلے گئے۔

یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ان کی آمدنی وافر تھی، لیکن ساری آمدنی وہ اپنی بیوی کو دے دیا کرتے تھے۔ خود ان کی زندگی بے انتہا سادہ تھی، جو مل گیا کھالیا، جو بیوی نے بنا دیا پہن لیا۔ ان کی ذات کے برعکس ان کے گھر میں عیش و عشرت کے تمام سامان تھے، کھانا تقریباً روزانہ ایسا پکتا تھا جیسا دعوتوں میں پکایا جاتا ہے۔ آئے دن طرح طرح کی مٹھائیاں بنتیں اور پکوان پکتے۔ لیکن ماسٹر صاحب کو ان چیزوں کی طرف کوئی رغبت نہ تھی، سامنے آگیا تو کھالیا، ورنہ چٹنی روٹی پر گذر کر لیا۔ میں چونکہ انہی کے ساتھ رہتا تھا اس لئے ان کی ذات اور ان کے گھر والوں کا یہ فرق میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اپنی رہائش اور کھانے کا میں انہیں کوئی معاوضہ نہ دیتا تھا، وہ مجھ سے گھر کے ایک فرد کا سا سلوک کرتے تھے، البتہ میں ان کی ایک بچی کو پڑھا دیا کرتا تھا جو ادیب کی تیاری کر رہی تھی۔

میں نے ان کے ساتھ رہتے اور جے پور مسلم ہائی اسکول میں ملازمت کرتے ایک سال گذارا۔ بیوی اور بچی کی جدائی بھی شاق گذرنے لگی اور والد صاحب مرحوم نے بھی لکھا کہ تم سرونج آجاؤ۔ چنانچہ میں سرونج آکر پھر سعادت ہائی اسکول میں ملازم ہو گیا۔

جے پور سے روانگی سے قبل ماسٹر صاحب نے ایک روز تنہائی میں مجھے بٹھایا اور

کہا کہ میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں اس لئے ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ دوستوں کے بجائے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پیسہ کمانے میں صرف کرو اور جو کچھ کماؤ اس سے خود کوئی سروکار نہ رکھو، سب بیوی کو دیتے جاؤ، کیونکہ پیسے کے بغیر دوست احباب تو کیا بیوی بھی بیوی نہیں رہتی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میری زندگی کا بھی یہی رنگ ہے اور یہ میری اصل طبیعت کا رنگ نہیں، مصنوعی ہے جسے میں نے ایک واقعے کے بعد دانستہ اختیار کیا ہے۔ ہوا یہ کہ جب میں بھیں جے پور میں مسلم ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا تو ایک مرتبہ بیمار پڑا، بیماری طویل ہوئی۔ پہلے پوری پھر نصف تنخواہ پر اور اس کے بعد بلا تنخواہ رخصت لینی پڑی۔ گھر میں بے اجتماعی ہو گئی۔ میری یہ حالت کہ میں رات بھر جاگتا اور کھانستا رہتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خون بننا بند ہو گیا اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ نہیں کہہ سکتے کہ کب زندگی آپ کا ساتھ چھوڑ دے۔

ایک رات میں جاگ رہا تھا اور کھانستا جارہا تھا تو میں نے کانوں سے بیوی کو یہ کہتے سنا کہ اللہ انہیں اٹھا بھی تو نہیں لیتا! اپنے ساتھ ہماری زندگی بھی حرام کر رکھی ہے۔ کیا کر سکتا تھا، سن کر پی گیا۔

ایک رات میں نے ایک بزرگ کو خواب میں ایک بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس پر STOP THINKING لکھا ہوا تھا۔ اس خواب سے میں نے یہ سمجھا کہ میرا موجودہ مرض محض وہم کا نتیجہ ہے چنانچہ میں نے وہم ترک کر دیا۔ باغوں میں جاتا، تالاب کے کنارے وقت گذارتا، قوالی سنتا، رنڈیوں کے کوٹھوں پر جا کر گانے سنتا، اس طرح زندگی گذارتے ایک ہفتہ ہی گذرا تھا کہ ڈاکٹروں کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ آپ کا تو خون بننا شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ میں بالکل تندرست ہو گیا۔ اس کے بعد سے میں نے یہ وتیرہ بنالیا کہ زیادہ سے زیادہ کماؤ اور بیوی کو بھرتے جاؤ تاکہ اسے کسی وقت تنگی کی شکایت نہ رہے۔

اس کے بعد ان سے کراچی میں سڑک پر ملاقات ہوئی، اس طرح کہ گدھا گاڑی ہانک رہے تھے اور گاڑی میں لفافے لدے ہوئے تھے جن میں دوکاندار چیزیں رکھ کر دیا کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا کب آئے؟ میں نے کہا تین روز ہوئے ہیں۔ کہنے لگے بھیا کوئی فکر مت کرنا، گھر موجود ہے، اسی طرح لفافے بنائیں گے اور بیچیں گے اور گھر کا پتہ لکھا دیا۔ میں گھر پہنچا جو عیدگاہ میدان کے پچھلی سمت میں تھا۔ دیکھا کہ ایک کمرے میں محلہ کے بچے جمع ہو کر لفافے بنا رہے ہیں اور ایک حصے میں پرائمری اسکول چل رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے چونکہ چھٹے روز ہی ملازمت مل گئی اس لئے میں ان کے ساتھ ان کے کاروبار میں شریک نہ ہو سکا۔

امیر الدین صاحب

میں جس زمانے میں اورینٹل کالج دوجانہ میں پرنسپل تھا امیر الدین صاحب مجسٹریٹ تھے، جو جے پور کے ریٹائرڈ سیشن جج اور وہیں کے باشندے تھے۔

امیر الدین صاحب نے بیان کیا کہ ان کے دادا گھوڑوں کے تاجر تھے۔ ایک مرتبہ استنبول سے کچھ گھوڑے خرید کر لائے۔ جے پور پہنچ ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ دو ترک آئے اور منہ مانگے داموں پر ایک گھوڑے کا سودا کر لیا۔ سودا ہو چکنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ ہمیں حکومت کی جانب سے یہ گھوڑا ہر قیمت پر واپس لانے کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ یہ خالص عربی نسل کا گھوڑا ہے اور حدودِ مملکت سے اس کا باہر نکالنا ممنوع ہے۔ ان کے دادا کو تعجب ہوا کہ ایسے بدصورت گھوڑے میں جس کی پیٹھ اور کنوتیاں خچر کی طرح جھکی ہوئی ہوں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ اس کے باہر نکلنے پر حکومت نے قدغن لگا رکھی ہے۔ پوچھا تو ایک ترک نے جواب دیا کہ میں اس پر سوار ہوتا ہوں اور چند لوگ ایک دائرے کی شکل میں لاٹھیاں لے کر کھڑے ہو جائیں۔ جب میں گر جاؤں تو لوگ مجھ پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ پہلی بات تو یہ دیکھی گئی کہ جونہی ترک اس پر سوار ہوا اس کی پیٹھ کا خم دور ہو گیا دونوں کنوتیاں تن گئیں اور پہلے وہ جتنا بدصورت نظر آتا تھا اتنا ہی خوبصورت نظر آنے لگا۔ پھر جب سوار کے گرنے پر لوگوں نے لاٹھیوں سے حملہ کیا تو دیکھا کہ گھوڑا سوار کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا ہے اور اپنی دولتیوں سے کسی کو سوار کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔

باقی ماندہ گھوڑے بیچنے کے لئے ان کے دادا گنگا اور جمنا کے سنگم پر کمبھ کے میلے میں الہ آباد گئے۔ وہاں دیکھا کہ دو سپیروں میں ٹھن گئی اور بات یہاں تک بڑھی کہ تو اپنے سانپ سے مجھے ڈسا اور میں تجھے۔ پھر دیکھیں کہ ماہر فن کون ہے۔ چنانچہ ایک

سپیرے نے سانپ نکالا۔ دوسرے نے اسے دیکھ کر اپنے چیلے کو چار پڑیاں دیں اور کہا کہ اس کے کاٹنے پر میں بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا۔ پہلے مجھے یہ پڑیا دینا، جب منہ سے جھاگ آنے لگیں تو دوسری پڑیا دینا، جب رنگ زرد پڑ جائے تو تیسری دینا اور زردی دور ہو جائے تو چوتھی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور چوتھی پڑیا پر اسے ہوش آگیا۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے کہا کہ اس وقت تو میرے پاس وہ سانپ نہیں ہے جس سے ڈسانا چاہتا ہوں۔ اگر مرد ہے تو اگلے سال اسی جگہ آجانا۔ یہ بات مشہور ہو گئی اور دوسرے سال لوگ بکثرت یہ تماشا دیکھنے پہنچے، جن میں امیر الدین صاحب کے دادا بھی تھے۔ جب سپیرے نے نلکی سے ایک بالشت کا سفید سانپ نکال کر بتایا تو دوسرا سپیرا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ میں ہارا تو جیتا۔

جس کو اپنے فن پر اتنا اعتماد ہو کہ وعدہ کے مطابق دوسرے سال پہنچ گیا، اس کی یہ عاجزی دیکھ کر لوگ متعجب ہوئے تو سانپ والے نے اس کی جو خصوصیت بتائی وہ ناقابل یقین ہے۔ اس نے کہا کہ یہ سانپ اگر کاٹ لے تو نہ صرف وہ جسے کاٹا ہے بلکہ اس کے خون سے تعلق رکھنے والے تمام افراد مر جاتے ہیں۔ اس کا تجربہ کرانے کے لئے وہ لوگوں کو دریا کے کنارے اُگے ہوئے نرسلوں کے پاس لے گیا اور سانپ کو اس نرسل کی ایک شاخ پر چھوڑا جس کی جڑ سے متعدد شاخیں نکلی ہوئی تھیں۔ سانپ کے منہ سے ایک شعلہ لپکا اور اس جڑ سے متعلق تمام شاخیں بھک سے اڑ گئیں۔ واللہ اعلم۔

اچھن میاں

اچھن میاں عمر میں مجھ سے بڑے ہونے کے باوجود میرے دوستوں کی فہرست میں تھے ۔ شعری ذوق نہایت لطیف تھا، بہترین اشعار بکثرت یاد تھے ۔ پان بہت کھاتے اور چائے بہت پیتے اور پلاتے تھے ۔ شطرنج کا شوق تھا اور یہی شوق چند دوستوں کو فرصت کے اوقات میں ان کے بالاخانے میں جمع کر دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی شعر و سخن کی باتیں ہوتی تھیں ۔ اچھن میاں خود بھی شاعر تھے ۔ زار تخلص تھا۔ سنا ہے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے ۔ ان کا ایک شعر ہے:

دلِ بیتاب کی حالت ہے کتنی رحم کے قابل
نہ وہ اپنا سمجھتے ہیں ، نہ ہم اپنا سمجھتے ہیں

اچھن میاں ایک ٹپیکل (Typical) آدمی تھے ۔ کہتے تھے کہ میں نے آج تک (جبکہ اس وقت ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہو گی) کوئی پھل نہیں کھایا اور کھانے میں میری عادت یہ ہے کہ صرف صبح و شام کھانا کھاتا ہوں (اور ہمارے بچپن میں صرف دو وقت ہی کھانے کا رواج تھا، ناشتے کا رواج نہ تھا)۔ باورچی خانے میں بیٹھ جاتا ہوں، روٹی اترتی جاتی ہے، اس میں گھی لگایا جاتا ہے اور گائے کے کوفتوں کے ساتھ وہ روٹی کھاتا ہوں ۔ اگر کسی وقت کوفتے نہ ہوں، اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، تو گڑ سے ۔ کہتے تھے کہ میں نے کوفتوں کے سوا کوئی سالن نہیں کھایا اور چائے کو چھوڑ کر گڑ کے سوا کوئی مٹھاس نہیں چکھی ۔ کہتے تھے کہ میری اس عادت کی وجہ سے میری بیوی ایک روز کے لئے بھی کہیں نہیں جا سکتیں اور گوشت پیستے پیستے سل میں کافی گڑھا پڑ گیا ہے۔

ہم نے اچھن میاں کو کبھی کسی تقریب یا دعوت میں کھاتے نہیں دیکھا۔

پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد غالباً ۶۴ء میں، میں سرونج گیا تو دیکھا تو اچھن میاں کی جوانی لوٹ آئی ہے۔ سرخ و سفید رنگ اور بہترین صحت۔ میں نے کہا اچھن میاں یہ کیا، ہم تو اپنی عمر سے بھی چار قدم آگے چلے گئے اور آپ "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کا مصداق ہیں۔ کہنے لگے جب پاکستان واپس جانے لگو تو اس سے ایک روز قبل اس کا راز بتاؤں گا۔ میں ایک روز قبل پہنچا تو انہوں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ میرے کوٹ کی جیب میں ایک ڈلی پڑی ہے، وہ نکال لاؤ۔ سفید رنگ کی ایک چوکور ڈلی دکھا کر، جس کا وزن تقریباً ایک چھٹانک ہوگا، مجھ سے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے۔ میں نے کہا: مجھے تو سنکھیا معلوم ہوتا ہے۔ کہاں ہاں اور یہی میری صحت کا راز ہے۔ سنکھیے کی ایسی ہی ایک ڈلی لو، ہر طرف سے باریک ریگ مال سے اور پھر کپڑے سے اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لو کہ ذرات نکلنے کا اندیشہ نہ رہے۔ اس ڈلی کو زبان پر صرف ایک بار ہلکا سا مس کرو، ایک ہفتے تک اسی طرح کرتے رہو، پھر ایک ہفتے تک دو بار مس کرو اور تیسرے ہفتے میں تین بار۔ اس کے بعد ایک ہفتے تک زبان پر ایک بار رگڑو۔ دوسرے ہفتے میں دو بار اور تیسرے ہفتے سے ہمیشہ تک کے لئے تین بار۔ دودھ اور گھی کا اہتمام رکھو، میری ہی طرح ہو جاؤ گے۔

کراچی آکر میں نے حکیم عبدالکریم صاحب جیلانی (جن سے میرے قریبی تعلقات تھے) دریافت کیا کہ کیا آپ کے پاس سنکھیا ہے؟ فرمایا: تقریباً بیس سال پہلے دلّی سے خریدا ہوا بہترین قسم کا ڈھائی سیر سنکھیا رکھا ہوا ہے۔ اس میں سے انہوں نے تقریباً آدھ پاؤ کی ڈلی مجھے دے دی اور میں نے مذکورہ ترکیب کے مطابق اس کا استعمال شروع کر دیا۔

استعمال سے قبل اپنے بہت ہی قریبی دوست حکیم محمود احمد صاحب برکاتی سے بھی اس کا ذکر آیا تھا۔ برکاتی صاحب سمیات کے استعمال کے سخت مخالف ہیں۔ انہوں نے مجھے اس کے استعمال سے سختی سے منع کیا۔ میں نے کہا کہ اتنی سی مقدار سے کیا

نقصان ہو گا۔ کہنے لگے اگر اتنی سی مقدار سے نقصان نہیں ہوتا تو نفع کیوں ہوتا ہے؟ میں خاموش ہو گیا۔ لیکن از سر نو جوان بننے کے شوق کی وجہ سے استعمال سے باز نہیں رہا۔

استعمال کئے ہوئے پندرہ روز ہی گذرے تھے کہ دونوں مونڈھوں کے درمیان گردن کی جڑ میں ایک پھوڑا ابھرا، جس کی شدید تکلیف سے میں بے حال ہو گیا سوچا کہیں یہ سنکھیا کا اثر تو نہیں! برکاتی صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ لوہا گرم ہے، چوٹ کاری لگے گی، کہہ دیا کہ: میں تو پہلے ہی منع کرتا تھا۔ حالانکہ میں اور مجھ سے زیادہ برکاتی صاحب اس سے واقف ہیں کہ پھوڑے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں، ضروری نہیں کہ سنکھیا ہی کا اثر ہو۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، میں نے سنکھیا ترک کر دیا۔

میرے ایک قریبی عزیز تھے، ان کے بٹوے میں سنکھیا چھالیہ کے ساتھ کترا ہوا پڑا رہتا تھا۔ بہت عیاش تھے اور سنکھیا کی بدولت اپنی غیر ازدواجی زندگی میں پرستش کی حد تک مقبول تھے۔ ان کی آخری عمر ایک دھوبن کے گھر گذری جو اس حالت میں ان کی کفالت و خدمت کیا کرتی تھی جب سنکھیا ان کے پیروں سے خون اور پیپ کی شکل میں پھوٹ پڑا تھا۔ ہر وقت پیروں پر کپڑے لپیٹے رہتے تھے اور لکڑی کے سہارے کے بغیر قدم اٹھانا بھی دشوار تھا۔

سنکھیا خواہ کچا ہو یا کشتہ، اگر اس کے ساتھ مرغن غذا نہ ملے تو جیسا کہ سنا ہے، آخر عمر میں یہی رنگ لاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سنکھیا جسم سے خارج نہیں ہوتا، مرغن غذاؤں سے دبا رہتا ہے اور توانائی بخشتا ہے۔ جب نہ ملیں تو جسم کے کسی حصے، خصوصاً پیروں سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔

سنکھیئے کو عربی میں "سم الفار" کہتے ہیں یعنی چوہوں کا زہر۔ اگر سنکھیئے کا سفوف آٹے میں ملا کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر گھر میں ڈال دی جائیں، اس احتیاط کے ساتھ کہ گولی کسی بچے کے ہاتھ نہ لگے، تو ایک دو جو ہے تو مرتے ہیں باقی سب گھر چھوڑ کر

بھاگ جاتے ہیں۔ اس کا میں نے تجربہ کیا ہے۔

ایک بزرگ نے سنکھیئے کے استعمال کا یہ طریقہ بتایا کہ ایک تولہ سنکھیئے کا سفوف لے کر اس میں ایک تولہ چینی کا سفوف ملایا جائے۔ پھر اسے نصف کر کے اس میں ایک تولہ چینی ملائی جائے۔ اسی طرح ہر مرتبہ نصف کر کے ہر بار ایک تولہ چینی ملاتے جائیں اور سوویں بار جو بچے وہ استعمال کیا جائے اور اس طرح ایک تولہ سنکھیا ختم کر لیا جائے۔

حاجی محمد اعلیٰ صاحب نے بتایا کہ سنکھیئے کے آدھ پاؤ محلول میں ایک سیر پانی ملایا جائے اور اس میں ایک درجن انڈے ابال لئے جائیں۔ انڈوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے، کوئی ٹوٹا ہوا نہ ہو اور ابلنے کے بعد پھر دیکھا جائے۔ اگر کسی میں دراڑ پڑ گئی ہو تو اسے پھینک دیا جائے اور سالم انڈوں کی زردی نکال کر اس کا حلوہ بنا لیا جائے اور روزانہ ایک تولہ استعمال کیا جائے۔

سنکھیئے کے ہر استعمال پر دودھ اور گھی کا استعمال ضروری ہے۔

بیجو خان صاحب

بیجو خان صاحب اچھن میاں کے والد تھے۔ سرونج کے معززین میں سے شمار ہوتے تھے اور تجارت پیشہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ساہوان رتلام کی کوٹھی سے پندرہ اشرفیاں قرض لیں اور گھی کے چند کنستر رہن رکھے۔ کنستروں میں نیچے پانی بھرا اور اوپر گھی، سردیوں کا زمانہ تھا اوپر گھی جم گیا۔ وعدہ کے مطابق انہوں نے اشرفیاں ادا کیں اور کنستر چھڑالئے اور اس وقت منیب جی کو بتایا کہ نہ میرے پاس پیسے تھے اور نہ پندرہ اشرفیوں کی قیمت کا گھی اور پیسوں کی مجھے ضرورت تھی اس لئے میں نے یہ حرکت کی تھی، آپ معاف فرمائیں۔

لیکن اشرفیاں واپس کرتے وقت یہ صورت پیش آئی کہ منیب جی کچھ لکھنے میں مصروف تھے خان صاحب نے جب کہا کہ پندرہ اشرفیاں جمع کرلیجئے تو انہوں نے کہا کہ رکھ دیجئے، ابھی لیتا ہوں۔ لکھنے سے فارغ ہو کر انہوں نے اشرفیاں اٹھائیں تو نہ جانے کیسے ایک اشرفی دوات میں گر گئی اور پتہ بھی نہ چلا۔ منیب جی نے گن کر کہا کہ خان صاحب چودہ ہیں۔ خان صاحب نے جواب دیا: چودہ ہوں گی۔ منیب جی نے کھاتے میں ٹانک لیں۔

بڑے بڑے مہاجنوں کے یہاں سیاہ روشنائی کی بڑی بڑی پیتل کی دواتیں ہوتی تھیں جو ہر سال دیوالی کے موقع پر، جو ایک بڑا تہوار ہے، دھلا کرتی تھیں۔ دیوالی آئی اور دواتیں حسب معمول دھلیں تو ایک اشرفی ٹپکی۔ منیب جی کو معلوم ہوا تو کھلبلی مچ گئی، بہی کھاتوں کی پڑتال ہونے لگی۔ دفعتہً منیب جی کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ بیجو خان صاحب نے اشرفیاں جمع کرائی تھیں، یہ کہہ کر کہ پندرہ اشرفیاں جمع کرلیجئے۔ اور گن کر جب میں نے کہا تھا کہ خان صاحب چودہ ہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ چودہ ہوں

گی۔

خان صاحب کو بلوایا گیا اور اشرفیوں کا قصہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ منیب جی لایا تو میں پندرہ اشرفیاں ہی تھا، لیکن جب آپ نے کہا کہ چودہ ہیں تو ایک اشرفی کی خاطر آپ کی بات کیا جھٹلاتا!

اتفاق سے منیب جی اور خان صاحب میں کسی بنا پر نااتفاقی ہو گئی۔ خان صاحب نے منیب جی کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ دونوں چونکہ شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتے تھے اس لئے سرونج کے ناظم (کلکٹر) کے نام نواب سعادت علی خان صاحب کا حکم آیا کہ ان کا مقدمہ ہمارے پاس منتقل کر دیا جائے اور دونوں کو ٹونک بھیج دیا جائے۔

مقدموں کے فیصلے چٹکی بجاتے تو ہوتے نہیں، وہ بھی ایسے مقدمے جن کے فیصلے نوابوں کو کرنے ہوں۔ نوابوں کو ریاست کے اہم ترین امور اور دوسرے غیر شرعی مشاغل سے جب فرصت ملتی تھی تب وہ اس قسم کے مقدمات لے کر بیٹھتے تھے۔

دونوں کے قیام کا زمانہ طویل ہوا اور خان صاحب کا سفر خرچ جواب دینے لگا۔ ساہوان رنگلام کی کوٹھی چونکہ ٹونک میں بھی تھی اس لئے منیب جی کے لئے تنگی کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ منیب جی کو خان صاحب کی تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو ایک رات، رات گئے تانگہ پر پرانے ٹونک پہنچ کر خان صاحب کی قیام گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نکلے تو کہا! خان صاحب مقدمہ اپنی جگہ ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ کا ہاتھ تنگ ہو گیا ہے، دو توڑے روپیوں کے لایا ہوں، یہ رکھ لیجئے۔ خان صاحب نے یہ کہہ کر کہ آپ نے جو کچھ سنا ہے صحیح ہے، روپے رکھ لئے اور صبح نواب صاحب کے سرکار میں درخواست گذار دی کہ مجھے منیب جی سے کوئی شکایت نہیں، مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

کیسے وضع دار لوگ تھے!

محبوب عالم صاحب

محبوب عالم صاحب (تھانیدار) میرے بزرگوں میں سے تھے۔ ذاکر و شاغل تہجد گذار متقی و پرہیزگار۔ پولیس والوں میں ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں، ورنہ کہاں پولیس کی ملازمت اور کہاں تقویٰ و طہارت۔

یہ بات میں نے ریاست ٹونک کے بعض پولیس افسروں میں دیکھی کہ چہرے پر ناف سے ذرا اوپر تک لٹکی ہوئی ڈاڑھی ہے، پیشانی پر گٹا پڑا ہوا ہے، ہاتھ میں تسبیح ہے اور مجال ہے کہ تہجد کی نماز بھی فوت ہو جائے۔ ضدین کا یہ اجتماع ان لوگوں میں پایا جاتا تھا جو رشوت کو "فضل ربی" سمجھنے کے بجائے سچے دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ایمان رکھتے تھے کہ "**الراشی والمرتشی کلا هما فی النار**" (رشوت دینے اور لینے والا دونوں جہنم میں ہوں گے)۔

محبوب عالم صاحب کا شمار انہی پولیس افسروں میں تھا۔ انہوں نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ میری چھوٹی جوان بہن بیمار ہوئی، حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک صبح، رات بھر باری باری جاگنے کے بعد، سب لوگ بہن کو غافل چھوڑ کر کوٹھے سے نیچے اترے تاکہ ضروری حوائج سے فارغ ہو سکیں۔ سب سے پہلے میں فارغ ہوا اور کوٹھے پر چڑھا تو اندر قدم رکھتے ہی عجیب قسم کی خوشبو محسوس کی، ایسی کہ ناک پہلے کبھی اس طرح کی خوشبو سے مانوس نہ تھی۔ میں وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا، والدہ کو اشارہ سے بلایا۔ اوپر پہنچتے ہی انہوں نے پوچھا یہ خوشبو کیسی ہے؟ پھر بیوی کو بلایا۔ انہوں نے بھی وہاں قدم رکھتے ہی وہی سوال کیا، جو خود مبہوت ہو وہ دوسروں کو کیا جواب دیتا۔

میں آہستہ آہستہ بہن کے پاس پہنچا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ رکھتے

ہی اس نے آنکھیں کھول دیں، انتہائی غصے سے مجھے گھورتے ہوئے چلائی: تم کیوں آئے، نکل جاؤ یہاں سے اور رونے لگی۔ غصہ فرو ہونے پر میں نے پوچھا۔ رو رو کر کہنے لگی کہ میرے سرہانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر فرما رہے تھے کہ بیٹی گھبراؤ نہیں، تم اچھی ہو جاؤ گی۔ آپ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مجھے جگا دیا اور میں حضور کی رویت سے محروم ہو گئی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد بہن نے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے، بیوی نے مجھ سے کہا کہ ابھی تو اس کی پرہیزی غذا تیار نہیں۔ میں نے کہا کہ اب کیا پرہیز، جو کچھ موجود ہے وہی لاؤ۔ چنانچہ صحت مند آدمیوں کے لئے رات کے پکائے ہوئے کھانے کا پسماندہ اسے کھلایا گیا اور رفتہ رفتہ وہ ایسی صحت مند ہوئی جیسے کبھی بیمار ہی نہ پڑی تھی۔

عبدالوحید خان صاحب

عبدالوحید خان صاحب جاگیردار مرحوم سرونج کے معززین میں شمار ہوتے تھے انہوں نے ایک کنواری لڑکی سے شادی کی جبکہ وہ خود ۶۵ کے پیٹے میں تھے اور ان کی بیٹیاں بھی عمر میں اپنی سوتیلی ماں سے بڑی تھیں۔ سرونج میں یہ انوکھا واقعہ تھا، بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔

عبدالوحید خان صاحب کا برسوں سے معمول تھا کہ وہ سردیاں آنے سے پہلے ایک جوان اصیل مرغ لے کر پنجرے میں بند کر دیا کرتے تھے اور آٹے میں ملا کر اسے شنگرف کھلاتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ تمام پر جھڑ کر وہ صرف گوشت کا لوتھڑا رہ جاتا تھا پھر اسے ذبح کر کے ایک سیر خالص گھی میں تلواتے تھے اور وہ گھی اتار کر رکھ لیا کرتے تھے۔ پوری سردیوں میں اسی گھی کو ناشتہ میں استعمال کرنا ان کا معمول تھا۔

صاحبزادہ محمد علی خان صاحب

صاحبزادہ محمد علی خان صاحب میرے بزرگ ہیں۔ بعد میں موصوف نے مجھے دوست کا درجہ عطا فرما دیا۔ انتہائی ظریف، شیرینی کے رسیا، اتنے کہ قورمہ میں بھی شکر ڈال کر کھاتے تھے۔ ایک جگہ چائے سے تواضع ہو رہی تھی۔ میزبان نے ان سے دریافت کیا، شکر کتنی ڈالوں؟ فرمایا تین چمچوں سے شروع کرو، جب کوٹا پورا ہو جائے گا میں بس کہہ دوں گا۔ چنانچہ کوٹا آٹھ پر پورا ہوا، یہ کہتے ہوئے کہ اب آگے بڑھاتے شرم آتی ہے۔

ٹونک میں قافلہ کی مسجد میں نماز کے لئے لوگوں نے بہت انکار کے باوجود امام بنا دیا۔ انہوں نے مقتدیوں سے اس طرح انتقام لیا کہ بڑا لمبا قیام کیا، اسی مناسبت سے رکوع اور اسی مناسبت سے لمبا سجدہ۔ جب دوسرے سجدے میں گئے تو خاموشی سے اٹھے اور سب کے جوتے چادر میں باندھ کر بھاگ لئے۔ جب معمول سے زیادہ دیر ہوئی تو کسی نے کنکھیوں سے دیکھا، امام کا مصلا خالی تھا۔

سرونج میں ایک بزرگ تشریف لاتے تھے، پیر عبدالسمیع صاحب مرحوم۔ صاحبزادہ صاحب بھی ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے۔

ایک مرتبہ صاحبزادہ صاحب نے فضل الرحمٰن صاحب منیجر فارم سے گلتھی کی دعوت طلب کی۔ ان کے انکار پر کہا کہ میں تم سے دعوت کھا کر رہوں گا۔ یہ کہہ کر ان کے خلاف عدالت میں اپنی مرغی کی چوری کا مقدمہ دائر کر دیا اور جھوٹے گواہ بھی تیار کر لئے۔ مجسٹریٹ صاحبزادہ صاحب کی ظریفانہ عادت کو بھی جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے، لیکن قاضی چونکہ اپنے علم کے بجائے شہادت کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہے، اس لئے مقدمے نے ایسی نوعیت اختیار کر لی کہ فضل الرحمٰن

صاحب سزا یا جرمانے سے نہ بچ سکتے تھے۔ بالآخر فضل الرحمٰن صاحب کو دعوت کے وعدے پر راضی نامہ کرنا پڑا۔ اور طے یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کے لئے بطورِ خاص گلتھی پکوائی جائے گی۔

دعوت کے لئے جمعرات کا دن طے ہوا، بعد مغرب۔ وہ وقت پیر عبدالسمیع صاحب کے حلقے کا وقت ہوتا تھا۔ مغرب کے بعد صاحبزادہ صاحب نے اجازت چاہی تو پیر صاحب نے ڈانٹ کر کہا کہ حلقے میں بیٹھو۔ قہرِ درویش بر جان درویش بیٹھ گئے اور مراقبہ عشاء کے قریب ختم ہوا۔

پیر صاحب کی عادت تھی کہ مراقبے کے بعد مریدوں سے فرداً فرداً دریافت فرمایا کرتے تھے کہ تمھیں کیا نظر آیا۔ ایک صاحب نے کہا: مجھے تجلیاتِ باری تعالیٰ نظر آتی رہیں۔ پیر صاحب نے فرمایا: چلو بھگوے، تجلیاتِ باری تعالیٰ آج تک تیرے پیر کو نظر نہیں آئیں تجھے کہاں سے نظر آگئیں۔ صاحبزادہ صاحب کی باری آئی تو جواب دیا: حضور مجھے تو پورے مراقبے میں گلتھی نظر آتی رہی۔ مزاج جانتے تھے، سب ہنس دیئے۔

صاحبزادہ محمد صدیق خان صاحب

محمد علی خان صاحب کے والد صاحبزادہ محمد صدیق خان صاحب بڑے جاگیردار تھے ۔ نوابی ٹھاٹھ کے ساتھ ساتھ تجارتی کاروبار بھی تھا ۔ ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں پیرو بیچارے نے تین روپے قرض لئے کہ فلاں تاریخ کو واپس کر دوں گا ۔ حساب روزانہ چیک کرتے تھے ۔ وعدے کے مطابق پیرو روپئے نہ لایا ۔ ملازم کو بھیجا کہ اسے پکڑ لائے ۔ آیا تو پوچھا: تم نے وعدے کے مطابق قرض کیوں نہ ادا کیا؟ میاں انتظام نہ ہو سکا، اس نے جواب دیا ۔ فرمایا: اللہ کی نیاز سے (یہ ان کا تکیہ ، کلام تھا) شریعت میں وعدہ خلافی حرام ہے ۔ پھر سپاہی کو حکم دیا کہ اسے بند کر دو ۔ ان کا ذاتی جیل خانہ بھی تھا پیرو کو بند کر دینے کے بعد باورچی خانے کے مہتمم الیاس سے کہا کہ معلوم کرو کہ اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں ۔ ماں، بیوی اور دو بچے، کل چار افراد تھے ۔ الیاس سے فرمایا کہ ہم تو صرف ایک وقت کھاتے ہیں لیکن غریب محنت کش تین وقت کھاتے ہیں: ناشتہ، دوپہر کا کھانا پھر رات کا کھانا اور کوئی ضروری نہیں کہ گھر والوں پر روزے بھی فرض ہوں، لہذا ہر رات کو ہمارے خاصے کے کھانے میں سے اتنا کھانا اس کے گھر پہنچایا کرو کہ چاروں کے لئے تینوں وقت کو کافی ہو ۔ حکم کی تعمیل ہونے لگی ۔

عید قریب آئی تو فرمایا کہ غریب آدمی بھی اپنے بچوں کے لئے عید پر کپڑوں کا اہتمام کرتا ہے ۔ اگر پیرو آزاد ہوتا تو حسب حیثیت وہ بھی کرتا ۔ لہذا سب کے لئے کپڑے بنائے جائیں ۔ اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی ۔

الیاس نے یہ سوچ کر کہ تین روپئے سے زیادہ کا تو ایک وقت کا کھانا ہی ہو جاتا ہے، پیرو کو اپنے پاس سے تین روپے دیئے کہ سرکار کا قرض ادا کر دے اور پھر اسے صاحبزادہ صاحب کے سامنے پیش بھی کر دیا ۔ فوراً سمجھ گئے کہ یہ الیاس کی حرکت ہے ۔

بولے جیل کی کوٹھری میں تیرے پاس روپے کہاں سے آئے۔ پھر الیاس سے مخاطب ہوئے کہ تم سمجھتے ہو کہ ہم بیوقوف ہیں، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ تین روپے کے عوض اس پر اور اس کے گھر والوں پر کتنا صرف ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اپنے ہندو منیب کو بلایا اور کہا: منیب جی الیاس سے باورچی خانے کا انتظام لے کر کسی اور کے سپرد کر دو۔ ایسا بدنیت آدمی اگر باورچی خانے کا مہتمم ہو تو برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ پیرو کو جیل سے اور الیاس کو ملازمت سے رخصت کر دیا گیا۔

مہینوں بعد جب الیاس کی زوردار سفارش ہوئی تو اسے پھر ملازم رکھ لیا گیا، لیکن باورچی خانے کے بجائے اصطبل کا انتظام سپرد کیا گیا۔

صاحبزادہ حمید خان صاحب چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے اور جب تک ساٹھ آدمی دسترخوان پر نہ ہوں لقمہ نہ اٹھاتے تھے۔ اگر ۵۹ آدمی بھی ہیں تو فرماتے تھے اللہ کی نیاز سے کسی اللہ کے بندے کو لاؤ۔ چنانچہ کسی بھی راہگیر کو بلایا جاتا تھا۔

صاحبزادہ صاحب کا کھانا عشاء کے بعد سے فجر کی اذان تک چلتا تھا۔ مختلف انواع واقسام کے کھانے پک پک کر آتے رہتے تھے۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ سرکار اس وقت تو مُسلم بکرا ہوتا تو بڑا مزا آتا، اسی وقت بکرا ذبح کر کے بھونا جاتا تھا۔

صاحبزادہ افتخار علی خان صاحب

صاحبزادہ افتخار علی خان صاحب، نواب ابراہیم علی خان صاحب کے بیٹے تھے۔ لیکن ایک باندی سے۔ شکار کے بڑے شوقین تھے۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا کوٹ اور برجس ہی میں دیکھا۔ رائفلوں کا ان کے پاس بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ مانگنے پر دینا تو کجا، اگر کسی شخص نے کسی چیز کی تعریف بھی کر دی تو وہ اسی کو بخش دی، خواہ کتنی ہی بیش قیمت کیوں نہ ہو۔

ایک مرتبہ محلے کے برف فروش نے رمضان کے مہینہ میں برف کے دام دو پیسے کے بجائے ایک آنہ سیر کر دیئے۔ صاحبزادہ صاحب کو غصہ آگیا۔ خود برف منگوانے اور دو پیسے سیر فروخت کرانے لگے۔ برف والے نے بھی نرخ گرا دیا، وہ بھی دو پیسے سیر فروخت کرنے لگا۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک پیسہ کر دیا تو اس نے بھی ایک پیسہ کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اعلان کر دیا کہ جو چاہے اپنی ضرورت کے مطابق برف مفت لے جایا کرے۔ صاحبزادہ صاحب تو جاگیر دار تھے اور اس کا ذریعہ معاش ہی برف بیچنا تھا، ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ فرمایا ہاں یہ ہوئی نا بات، جاؤ غیر رمضان کی طرح دو پیسے سیر فروخت کیا کرو اور خود برف کا سلسلہ ختم کر دیا۔

سال بھر تک صاحبزادہ صاحب کا کام مہاجنوں سے چلتا تھا اور جاگیر سے وصولیابی پر قرض ادا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک فقیر نے صدا لگائی۔ صاحبزادے صاحب غصہ میں تھے اور ان دنوں ہاتھ بھی تنگ تھا۔ غصہ میں کہا کہ یہاں تو خود کھانے کو نہیں، آجاتے ہیں یہ مانگنے والے۔ فقیر نے کہا کہ میاں کھانے کو نہیں تو فقیر کی جھولی میں یہ سوکھے ٹکڑے ہیں یہ لے لو۔

چند ماہ بعد جاگیر کی آمدنی لے کر آرہے تھے کہ وہی فقیر راستے میں مل گیا۔ اسے روکا اور یہ کہا کہ کل تیرا دن تھا، آج میرا دن ہے۔ پوری رقم اسے دے دی اور خالی ہاتھ گھر واپس آگئے۔

انقلاب کے بعد ریاست بھی ختم ہوئی اور جاگیریں بھی اور اس طرح جاگیردار کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔

حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے مجھ سے بیان کیا کہ جن دنوں انہوں نے ٹونک میں مطب کھولا، صاحبزادہ صاحب انہی سے علاج کراتے تھے۔ ایک مرتبہ دوا لینے آئے۔ انہوں نے نسخہ لکھ دیا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دوا فروش ملازم سے نسخہ بندھوایا اور جانے لگے۔ ملازم نے کہا: آپ نے کل بھی پیسے نہیں دیئے تھے اور آج بھی پیسے دیئے بغیر جا رہے ہیں۔ یہ بات اندر برکاتی صاحب کے کانوں میں پڑی، دوڑ کر آئے، صاحبزادہ صاحب سے انتہائی معذرت کے ساتھ کہا: میاں آپ تشریف لے جائیں۔ پھر ملازم سے کہا: یہ بات تم کس سے کر رہے تھے، جانتے نہیں کہ کل تک ان کی فیاضی کا کیا حال تھا؟ آئندہ ان سے پیسے کبھی نہ لینا۔

جمالی صاحب

جمالی صاحب میرے دور کے سسرالی رشتہ دار محمود علی خان صاحب کے داماد تھے۔ گوالیار ان کا وطن تھا۔ نجوم، رمل، جوتش وغیرہ نہ معلوم کیا کیا فن جانتے تھے۔ سرونج میں میرا ہاتھ دیکھا تو کہا کہ سمندر کے کنارے واقع کسی بڑے شہر میں تمہاری سکونت ہو گی اور وہیں تمہاری قسمت کھلے گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان صرف ذہنوں میں تھا، دنیا کے نقشے پر ایک ملک کی حیثیت سے وجود میں نہ آیا تھا۔ واقعتہً ہوا بھی یہی کہ قسمت نے سرونج سے کراچی پہنچا دیا اور یہیں سے قسمت کھلنی شروع ہو گئی کہ حضرت مفتی شفیع صاحب کے دارالعلوم سے ایس۔ ایم۔ کالج منتقل ہوا، پھر سندھ یونیورسٹی، اس کے بعد کراچی یونیورسٹی اور وہاں سے مکہ مکرمہ کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جو اب جامعہ ام القریٰ ہے۔

کراچی میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تعلیم کو پی ایچ۔ ڈی تک پہنچا دیا۔

کراچی پہنچنے کے ابتدائی دور میں جب میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے پاس نائب مفتی کی حیثیت سے کام کرتا تھا، ایک روز جمالی صاحب دارالافتا پہنچ گئے، جہاں میں تنہا بیٹھتا تھا۔ وہ بھی مستقلاً پاکستان چلے آئے تھے۔ ابتدائی صاحب سلامت کے بعد کہنے لگے کہ ایک پرچے پر کوئی نام لکھو۔ میں نے ڈیسک کی آڑ کر کے، کہ قلم کی روش بھی ان کی نظر میں نہ آئے، ایک کاغذ پر "ملکہ وکٹوریہ" لکھا۔ کہا کہ اس کے پرزے کر دو، پھر کہا کہ ماچس ہو تو اسے جلا دو۔ میں نے جلا دیا۔ راکھ لے کر ذرا فاصلہ پر چلے گئے اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر دوسری ہتھیلی سے دو تین بار تھپتھپایا، پھر پینسل سے کاغذ پر کچھ حساب لگایا اور کہنے لگے کہ تم نے "ملکہ وکٹوریہ" لکھا تھا۔

جمالی صاحب نے حیدرآباد سندھ میں سکونت اختیار کی۔ قلعہ کے نیچے فٹ

پاتھ پر بیٹھ کر چار چار آنے میں لوگوں کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔

میرے دوست محمد یوسف اسحاقی صاحب مرحوم نے سوچا کہ ایسا باکمال شخص اگر کراچی میں ہو تو دولت کے انبار جمع کر سکتا ہے، کیونکہ کراچی میں دولت مند احمقوں کی کمی نہیں، چنانچہ وہ انہیں کراچی لے آئے اور اپنے مکان کی دوسری منزل پر ایک بڑا سا بورڈ پروفیسر جمالی کے نام کا بنوایا اور ایک فرنشڈ (Furnished) کمرے میں انہیں بیٹھا دیا۔ ان کا مکان ہاؤسنگ سوسائٹی میں شاہراہ فیصل پر واقع تھا، نیچے دوکانیں تھیں۔ جمالی صاحب جیسا ماہر فن، ہو اور یوسف اسحاقی صاحب مرحوم جیسا ذہین اور کثیر الاحباب شخص ان کا ایجنٹ ہو تو گاہکوں کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن چند روز ہی گذرے تھے اور کاروبار جمنے بھی نہ پایا تھا کہ جمالی صاحب کی طبیعت کراچی سے اکتا گئی اور حیدر آباد واپس جا کر اسی فٹ پاتھ پر چار چار آنے میں ہاتھ دیکھنے لگے۔

دوسروں کی روشن قسمت بتانے والے کی خود کی تاریک قسمت کا حال کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب دانی کے ہر فن کی نفی نہیں فرمائی بلکہ یہ تک فرمایا کہ ایک نبی ریت پر خطوط بنا کر غیب کا حال دریافت کیا کرتے تھے۔ جس کے خطوط ان کے موافق ہو جاتے ہیں ان کا جواب صحیح ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں اس علم کا ذکر ہے جسے علم رمل کہا جاتا ہے اور جو حضرت ادریس علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے پاس جانے اور ان سے قسمت کا حال دریافت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث میں ہے: "من أتى كاهنا أو عرافا فليس منا" ٥

(جو کسی کاہن یا عراف کے پاس جائے وہ ہم میں سے نہیں)

کیونکہ اول تو یہ کہ "نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند" (ایسا نہیں ہے کہ جو شخص بھی سر منڈا لے وہ قلندری جانتا ہو) ہو سکتا ہے کوئی جاہل کسی کامل کا روپ دھار

کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے بیٹھ گیا ہو۔

اگر فن جانتا بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے حساب کے ذریعہ جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ صحیح ہی ہو۔ ایک راجہ نے اپنے بیٹے کو غیب دانی کا فن سکھانے کے لئے کسی جوتشی کے حوالے کیا۔ جوتشی کو جو کچھ آتا تھا سب کچھ سکھا کر وہ راجکمار کو راجہ کے پاس لایا۔ راجہ نے اپنی انگوٹھی خاموشی سے اتار کر اپنی مٹھی میں دبالی اور راجکمار سے امتحاناً دریافت کیا کہ میری مٹھی میں کیا ہے۔ اس نے حساب لگا کر جواب دیا: چکی کا پاٹ۔ راجہ جوتشی سے مخاطب ہوا: کیا یہی سکھایا ہے تم نے؟ جوتشی نے راجکمار سے پوچھا کہ تم نے یہ کیسے کہہ دیا، راجکمار نے کہا کہ میرے حساب نے یہ بتایا کہ ہاتھ میں کوئی ایسی گول چیز ہے جس کے بیچ میں سوراخ ہے اور اس سوراخ میں کوئی چیز پھنسی رہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ چکی کے پاٹ کے سوا اور کسی چیز کی یہ کیفیت نہیں۔ وہ گول ہوتا ہے، اس کے بیچ میں سوراخ بھی ہوتا ہے اور اس میں کھوٹا بھی پھنسا ہوتا ہے جس سے پاٹ کو گھمایا جاتا ہے۔ جوتشی نے کہا کہ تم نے جواب دینے سے پہلے یہ نہ سوچا کہ چکی کا پاٹ مٹھی میں کیسے آسکتا ہے؟ راجکمار نے اپنی نادانی کا اعتراف کیا۔ جوتشی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور حساب تو ٹھیک تھا، اب یہ اپنی اپنی عقل و ذہانت ہے کہ کون کیا نتیجہ نکالتا ہے۔

اگر بالفرض نتیجہ صحیح بھی ہو تو غم کی خبر سے غم دوبالا ہو جاتا ہے۔ جو غمناک واقعہ پیش آنے والا ہے وہ تو آئندہ اپنے وقت پر پیش آئے گا ہی، لیکن انسان اس کے خیال سے پہلے ہی سے گھلنے لگتا ہے۔ بالفرض خود سائل کی موت کی خبر ہو تو کیا اس کی زندگی کے باقی ماندہ ایام موت سے بدتر نہ ہوں گے؟

ایک بادشاہ کا مٹاپا بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک طبیب نے علاج کا بیڑا اٹھایا، حافظے میں یہ ہے کہ یہ ابو بکر رازی تھے، ممکن ہے کوئی اور ہوں۔ طبیب نے کہا کہ علاج سے پہلے میں آپ کا زائچہ تو نکال لوں۔ دوسرے روز

غمگین صورت بنا کر بادشاہ کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے پوچھا تو عرض کیا کہ حضور زائچے نے بتایا کہ آپ کی زندگی کے صرف چالیس روز باقی رہ گئے ہیں۔ پھر علاج سے کیا فائدہ موٹے رہے تو کیا اور دبلے ہو گئے تو کیا۔ بادشاہ نے امورِ سلطنت چھوڑ کر مصلیٰ سنبھال لیا اور خور و نوش تک بقدرِ قوت لایموت رہ گئی۔ چالیسویں روز کا انتظار تھا، لیکن جب اکتالیسویں روز کا سورج طلوع ہو گیا تو طبیب کو بلوایا اور بپھرے ہوئے انداز میں طبیب سے باز پرس کی۔ طبیب نے آئینہ سامنے کر دیا اور عرض کیا کہ حضور آپ یہی تو چاہتے تھے کہ دبلے ہو جائیں، دیکھیئے آپ کی کیا حالت ہو گئی اور اتنے دن کی عبادت کا ثواب نفع میں رہا۔ دواؤں سے علاج کیا جاتا تو یہ ثواب کیسے ملتا۔

اور اگر کوئی خوشخبری ہو تو خوشی ادھوری رہ جاتی ہے۔ فرض کیجئے اگر کسی طالب علم کو ٹیبولیٹر (نتیجہ مرتب کرنے والا) کے ذریعہ قبل از وقت معلوم ہو جائے کہ وہ پاس ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ خوش ہو گا لیکن اس کی خوشی کی یہ کیفیت ہو گی کہ اعلان عام تو کیا شاید وہ اپنے قریبی دوست سے بھی اس کا اظہار نہ کر سکے۔ پھر جب نتیجہ شائع ہو کہ وہ پاس ہو گیا ہے تو وہ کہے گا کہ ہاں مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ نہ وہ خوشخبری سے قبل از وقت پورے طور پر لذت اندوز ہو سکا نہ وقت آنے پر۔

اس فن کے ماہرین کا کام صرف قسمت بتانا ہوتا ہے قسمت بنانا نہیں۔ جس کی قسمت میں جو ہے وہ اپنے وقت پر پیش آتا ہے۔ "القدر خیرہٗ و شرہٗ من اللہ" (اچھی اور بری تقدیر اللہ کی طرف سے ہے)، "الأمور مرہون باوقاتہا" (تمام کام اپنے وقت پر ہی ہوتے ہیں) اور اللہ کی بنائی ہوئی قسمت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

نہ معلوم کہاں پڑھا تھا اور نہیں معلوم کہ صحیح یاد بھی ہے یا نہیں۔ غالباً یونس نام کا کوئی یہودی ہے جس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ سلطنت آپ کی نسل سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں جائے

گی اور ان میں سے ایک خلیفہ کے ہاتھوں سلطنت کو بڑی وسعت و قوت و شوکت نصیب ہو گی ۔ اس شخص کا حلیہ تک ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے ۔ حضرت معاویہؓ نے عمائدین کو جمع کیا کہ ان میں سے کوئی شخص ہے؟ کہا کہ نہیں ۔ حضرت معاویہؓ نے اپنا آدمی ساتھ کیا کہ مکہ اور مدینہ جا کر دیکھو، کیونکہ ان ہی دو مقامات پر ایسا شخص ہو سکتا ہے جو خلیفہ بن سکے ۔ یونس مکہ پہنچا، عبدالملک بازار سے گذر رہا تھا (یا کسی مسجد میں بیٹھا تھا)، شبہ ہونے پر اسے روکا اور پہچان لیا کہ یہی وہ شخص ہے ۔ یونس نے کہا کہ اگر میں آپ کو کوئی بڑی خوشخبری سناؤں تو کیا آپ مجھے انعام دیں گے؟ عبدالملک نے جواب دیا کہ پہلے خبر سناؤ پھر انعام کی بات ہو گی ۔ اس نے بتایا کہ ایک روز آپ خلیفہ بنیں گے اور آپ کے ہاتھوں سلطنت کو اتنی وسعت ہو گی ۔ عبدالملک یہ سن کر جانے لگے ۔ یونس نے کہا کہ میرا انعام؟ عبدالملک نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمہیں انعام دے دوں تو جو کچھ مجھے ملنے والا ہے کیا کچھ اس سے زیادہ مل جائے گا؟ کہا کہ نہیں ۔ پھر پوچھا کہ اگر میں انعام نہ دوں تو جو ملنے والا ہے اس میں کچھ کمی ہو جائے گی؟ جواب دیا کہ نہیں ۔ عبدالملک یہ کہہ کر چل دیا کہ یہی تمہارا انعام ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ قسمت کا حال بتانے والے قسمتیں بنا بھی سکتے تو جمالی صاحب فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چار چار آنے میں ہاتھ کیوں دیکھتے ۔

۱۹۸۴ء میں جب میں تعطیلات میں پاکستان گیا اور حیدر آباد پہنچا تو جمالی صاحب بھی ملنے آئے ۔ بہت سی باتیں کیں، ان میں ایک یہ بری خبر بھی شامل تھی کہ آپ چار پانچ سال کے اندر اندر پاکستان واپس آجائیں گے، لیکن آپ اولاد کے محتاج نہ ہوں گے ۔ آپ کے پاس کم از کم ڈھائی تین لاکھ روپیہ ہو گا ۔ (اس واقعہ کو بارہ سال گذر چکے ہیں، میں بحمد اللہ اب تک سعودیہ میں ملازم ہوں) ۔

جو شخص مکہ ہی کی زمین کا پیوند ہونا چاہتا ہو اس کے لئے یہ خبر اچھی کیسے ہو سکتی ہے ۔ لیکن " بای أرض تموت " (کس زمین میں موت آئے گی) کی خبر کسے

ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بقیع میں دفن کے متمنی تھے، اسی لئے اس اندیشے سے کہ کہیں مدینہ سے باہر موت نہ آجائے حج کے سوا مدینہ سے کبھی باہر نہیں گئے۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہو جاتا تو میں مدینہ سے باہر جا کر ان تابعین سے بھی استفادہ کر سکتا جو مدینہ سے باہر قیام فرما ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پانچ انگلیاں انہیں دکھا رہے ہیں۔ حضرت ابن سیرین نے جو خواب کی تعبیر کے ماہرین میں سے تھے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علہ وسلم کا ارشاد قرآن کریم کی ان آیات کی طرف تھا جن میں فرمایا گیا ہے کہ پانچ باتوں کی خبر اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور انہی میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی۔ (ان الله عنده علم الساعة.....)

سائیں سلیمان شاہ بجنوری

جس زمانہ میں بنیا پن اختیار کیا ہوا تھا اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ سرونج میں ایک صاحب تشریف لائے: سائیں سلیمان شاہ بجنوری۔ گدرائی عمر، سرمئی رنگ، سیاہ ڈاڑھی اور نصف پنڈلیوں تک کا سیاہ کرتا۔ کون سا ضعیف الاعتقاد ہے جو اس ہیئت سے مرعوب نہ ہو اور سرونج کی اکثریت ضعیف الاعتقاد مسلمانوں ہی پر مشتمل تھی۔ ضعیف الاعتقادی کے لئے جہالت کی تخصیص نہیں۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات کو بھی اس نامراد مرض میں مبتلا دیکھا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ جیسا شخص کیوں ان کا معتقد ہوتا جو دارالعلوم دیوبند سے فراغت، مولوی فاضل منشی فاضل اور میٹرک کی اسناد اپنی پشت پر لاد چکا ہو، اس طرح کہ؛

چار پائے برو کتابے چند
نہ محقق شود نہ دانشمند

(چوپایہ جس پر چند کتابیں لدی ہوں، نہ وہ محقق ہوتا ہے نہ دانشمند)

علم جب تک دل و دماغ میں داخل نہ ہو اور عمل میں سرایت نہ کرے گدھے کی پیٹھ کا ایک بوجھ ہی ہوتا ہے۔

بہر حال ان کے معتقدین کی فہرست میں، میں بھی داخل ہو گیا اور چونکہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا، لوگ مولوی اور ہائی اسکول کے سابق ٹیچر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اس لئے دوسروں کو ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی مزید ترغیب ہوئی، کیونکہ مولوی جب گڑھے میں گرتا ہے تو تنہا نہیں گرتا۔

دو چار ہی روز ہی گذرے تھے کہ مقرب خاص بن گیا اور دوکان کو تالا لگا کر، سونے کے اوقات کے علاوہ ہمہ وقت ان کے ساتھ رہنے لگا۔ حد یہ تھی کہ بیڑی وہ پیتے

تھے اور سلگا کر میں دیا کرتا تھا۔

ان کے جو حالات دیکھنے میں آئے وہ عام آدمی کو ان کا اسیر بن جانے کے لئے کافی تھے۔

۱۔ حلقۂ ارادت جما ہوا ہے۔ بجنوری صاحب کی مجذوبانہ بڑ جاری ہے، جس میں کچھ ہوش کی باتیں بھی ہیں۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس میرے پاس ہے اور ان کی Chain Smoking کے لئے ماچس ذرا ذرا سے وقفے سے استعمال کر رہا ہوں۔ سامنے سے ریوڑی والا گذرتا ہے۔ پوچھتے ہیں خوانچہ میں کتنے کی ریوڑیاں ہیں؟ کہا پانچ روپے کی۔ فرمایا بچوں کو تقسیم کر دو اور جب اس نے تقسیم کر دیں تو ماچس میرے سامنے سے اٹھا کر اسے دے دی۔ اب جو وہ کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں پانچ روپے رکھے ہیں۔

۲۔ ایک جلسہ کراتے ہیں۔ خود صدر مقام سے دور بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے تلاوت ہوتی ہے، تلاوت کے بعد اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں۔ سیاہ کرتے کی چوڑی چوڑی جھلنگاسی آستینیں ہلاتے ہوئے آتے ہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ ہاتھ خالی ہیں۔ قاری کے سامنے پہنچ کر نذر پیش کرنے کے انداز میں جھکتے ہیں اور لوگ دیکھتے ہیں کہ دس روپے کا کرارا نوٹ ان کی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے۔

تلاوت کے بعد مجھ سے ترجمے کے لئے کہا گیا۔ ارشاد کی تعمیل ہوئی۔ حسب سابق ہاتھ ہلاتے ہوئے آئے اور اس مرتبہ ہتھیلی پر وکٹوریہ کے زمانے کا کلدار روپیہ رکھا ہوا تھا۔ وہ روپیہ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک میری اس تھیلی میں رہا جس میں دوکان کی آمدنی رکھا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسے ایک روپیہ سات آنے میں فروخت کر دیا۔ اس میں رائج روپیہ کے مقابلے میں چاندی کی مقدار زیادہ ہوتی تھی۔

البتہ اس بات پر حیرت ہوئی کہ جب میرے سسر کی درخواست پر وہ ریاض المدارس تشریف لے گئے تو وہاں جو انہوں نے پچیس روپئے نذر کئے وہ مجھ سے لے کر

نذر کئے۔دستِ غیب کے ماہر نے نہ معلوم ایسا کیوں کیا؟

ریاض المدارس سے قیام گاہ پر پہنچ کر موصوف نے صاحب خانہ سے کہا کہ زنانخانے میں جاؤ اور فلاں طاق سے پچیس روپے لا کر انہیں دے دو۔ چنانچہ مجھے پچیس روپے مل گئے۔

۳ ... سرونج میں ان کے قیام کی آخری رات تھی، عبدالحی صاحب کوتوال کے مکان پر عشائیہ کے لئے مدعو تھے، میں بھی موجود تھا کیونکہ ہر دعوت میں مقرب خاص کی ہمراہی ضروری تھی۔ کھانے کے بعد قاسم گھڑی ساز نے موصوف کے ساتھ چند آدمیوں کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ لیکن قاسم کے مکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کا جمِ غفیر ہمراہ ہے۔ تعداد ساٹھ ستر سے کم نہ ہوگی۔ سب کو مخاطب کر کے فرمایا "بھائیو! میزبان نے صرف چار پانچ آدمیوں کو بلایا ہے۔ پھر قدرے خاموشی کے بعد فرمایا کہ اچھا سب چلو، دیکھا جائے گا۔ میزبان کے گھر پہنچ کر وہ میزبان کے ہمراہ زنانہ حصہ میں گئے اور واپس آکر سب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آنی شروع ہو گئی اور ساٹھ ستر آدمیوں نے دو دو پیالیاں پیں۔

(بعد میں قاسم نے مجھے بتایا کہ سائیں نے اپنا لعاب دہن دیگچی میں ڈالا، اسی سے یہ برکت ہوئی)۔

وہ رات سائیں صاحب نے قاسم کے مکان پر ہی گذاری۔ جیسے جیسے رات بھیگتی گئی لوگ رخصت ہوتے گئے، یہاں تک کہ فجر سے قبل منشی عبدالعزیز صاحب بھی صبح اسکول جانے کی وجہ سے رخصت ہو گئے۔ منشی عبدالعزیز صاحب سعادت ہائی اسکول سرونج میں فارسی کے استاد تھے اور سائیں صاحب سے تقرب میں میرے بعد انہیں کا درجہ تھا۔ جب میں، قاسم اور سائیں صاحب رہ گئے تو سائیں صاحب نے قاسم کو اندر جانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ میں نے کہا کہ نیکی کی توفیق اور خاتمہ بالخیر کے سوا کوئی طلب نہیں۔ فرمایا کچھ اور؟ تین بار یہ سوال کیا اور

تینوں بار میں نے ایک ہی جواب دیا۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دعا ختم ہوئی تو قاسم کو آجانے کی اجازت دے دی۔

۴ ... کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے تعویذ کی درخواست کی۔ انہوں نے فضا میں اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ سب حاضرین کے ساتھ میں نے خود دیکھا کہ تعویذ فضا میں ایک گز کے فاصلہ سے ان کے ہاتھ کی طرف چلا آرہا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی کی درخواست پر تعویذ فضا سے آرہا ہے اور اسی درمیان میں کسی نے کہہ دیا کہ حضور مجھے بھی۔ انہوں نے اسی ایک تعویذ کے دو کئے (دو ٹکڑے نہیں دو تعویذ) اور دونوں کو دے دیئے۔

۵ ... جن دنوں سائیں سلیمان کا سرونج میں قیام تھا، سرونج کے مفتی صاحب، حضرت قبلہ عبدالمجید صاحب شہر میں نہ تھے۔ سائیں کی روانگی سے دو روز قبل واپس تشریف لے آئے۔ منشی ولایت محمد خان صاحب نے دونوں حضرات کو کھانے پر مدعو کر لیا۔ اس روز سائیں صاحب کی حالت قابلِ دید تھی۔ وقتِ مقررہ سے کئی گھنٹے قبل سے ان کی مجذوبیت میں خرد کے مقابلے میں جنوں کا پہلو غالب آگیا تھا۔ میزبان کے گھر پہنچ کر جب حضرت مفتی کی تشریف آوری کا انتظار کیا جارہا تھا، ان کی مجذوبانہ کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ اطلاع آئی کہ مفتی صاحب تشریف نہیں لائیں گے تو ان کے اضطراب میں کمی ہوئی، چہرے پر مسرت واطمینان کے آثار نمودار ہوئے اور زبان سے یہ کلمات نکلے "جہاں شیر ہوں وہاں لومڑیاں نہیں آتیں"۔

غرض یہ کہ اس طرح کے متعدد واقعات تھے، اور اس طرح کے واقعات جب پیش آتے ہیں تو اچھے خاصے تعلیم یافتہ، روشن خیال یا راسخ العقیدہ لوگوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

سائیں صاحب کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا اور جیسے جیسے عقل ٹھکانے آتی گئی ان کی بزرگی کا رعب اترتا گیا۔ جس کے صبح وشام میں ذکر و شغل اور نوافل تو کیا ہوتے، جو فرض نمازیں بھی ترک کر دیتا ہو وہ بزرگ کیسے ہوا۔ اور یہ خیال ہوا کہ کاش میں نے ان سے نیکی کی توفیق اور خاتمہ بالخیر کے بجائے شمع معرفت

حل دریافت کیا ہوتا، جس کی انعامی رقم ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی، بشرطیکہ تقسیم ایمانداری سے ہوتی ہو۔

ایک روز سرونج کے مفتی صاحب حضرت قبلہ عبدالمجید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سائیں صاحب کا ذکر کیا اور اپنا یہی خیال ان کے سامنے ظاہر کیا کہ ایسے شخص کا بزرگی سے کیا تعلق۔ فرمایا: ہاں میاں سچ کہتے ہو، بعض مرتبہ کوئی شخص کسی سفلی عمل کے ذریعہ کوئی خبیث روح تابع کر لیتا ہے اور اس کے ذریعہ اس طرح کے شعبدے دکھاتا رہتا ہے۔ فرمایا: دور کیوں جاؤ، بگرودہ (سرونج کے قریب ایک گاؤں) کے اندھے برہمن کو جا کر دیکھ لو۔ جب لوگوں کو کوئی کنواں کھودنا ہوتا ہے اسے لے جاتے ہیں۔ وہ صرف مٹی سونگھ کر بتا دیتا ہے کہ اتنی گہرائی پر پانی نکلے گا اور کھودنے میں اس رنگ کی مٹی کے پرت نکلیں گے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے (مفتی صاحب نے) اس سے دریافت کیا کہ تو کیسے بتا دیتا ہے، تو اس نے کہا کہ حضور میں کچے کلوے کا عامل ہوں، اسی سے پوچھ کر بتاتا ہوں اور کچے کلوے کو قابو میں رکھنے کے لئے مجھے روزانہ اپنے چیلے پیشاب کا ایک چلو پینا پڑتا ہے اور چیلے پاخانہ سے ایک انگلی چاٹنی پڑتی ہے۔

شاید سائیں سلیمان بھی کسی سفلی عمل کے عامل تھے، کیونکہ بزرگوں کے اوقات اس طرح کے نہیں ہوتے جس طرح سائیں صاحب کے تھے۔ اولیاء اللہ اس طرح کے کشف و کرامات بھی ہر وقت ظاہر نہیں فرماتے۔ حقیقی ولی تو کشف و کرامت کو اس طرح چھپاتا ہے جس طرح خواتین اپنے مخصوص نجس کپڑے کو چھپاتی ہیں۔ ان سے کوئی کرامت ظاہر ہوتی بھی ہے تو یا تو ضرورت کے موقع پر یا غیر اختیاری طور پر۔

عادت کے خلاف کوئی بات، جسے اصطلاحاً خرق عادت کہتے ہیں، اگر کسی نبی سے تحدی یا چیلنج کے ساتھ ظاہر ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ نبی کے کسی سچے متبع کے ہاتھوں ظاہر ہو تو کرامت کہلاتی ہے اور اگر کافر یا فاسق کے ذریعہ ظاہر ہو تو اسے

استدراج کہتے ہیں۔

غیر نبی سے خوارق عادات کا ظہور کبھی شدید ریاضتوں کے نتیجے میں ہوتا ہے اور کبھی کسی عمل کے نتیجے میں۔ یہ عمل علوی بھی ہوتا ہے اور سفلی بھی۔ کوئی کچے کلوے جیسی خبیث ارواح کو تابع کر کے خرق عادت دکھاتا ہے اور کوئی مؤکلوں کو تابع کرکے۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا واقعہ یاد آرہا ہے کہ مریخ کو تابع کرنے کے لئے چلّے میں بیٹھے تھے (اسی طرح پڑھا ہے، واللہ اعلم) اور اپنے تابع مؤکلوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی کامل گوالیار آئے تو اطلاع کرنا۔ شطاری سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ محمد منظور گوالیار پہنچے اور قلعے کے نیچے ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ مؤکلوں نے خبر دی۔ آقا نے کہا کہ میں چلّے سے کیسے اٹھ سکتا ہوں، جاؤ انہی کو اٹھالاؤ۔ مؤکلوں نے جواب دیا کہ ہم تو ان کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ فرمایا: اچھا اس مسجد ہی کو یہاں اٹھالاؤ۔ جب مسجد نے ذرا جنبش کی تو خواجہ محمد منظور نے زمین تھپتھپا کر فرمایا! کیوں ہلتی ہے؟ مسجد اپنی جگہ جم گئی۔ پھر انہیں تنبہ ہوا کہ یہ مؤکلوں کی حرکت تھی۔ سب کو سامنے بلایا اور وجہ دریافت کی تو انہوں نے واقعہ بیان کر دیا۔ حکم دیا کہ محمد غوث کو یہاں اٹھالاؤ۔ مؤکلوں نے جب شاہ محمد غوث کو یہ حکم سنایا تو انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں چلّے میں ہوں اور تم میرے تابع ہو۔ مؤکلوں نے جواب دیا۔ آپ چاہیں تو ہماری جان لے سکتے ہیں، لیکن ان کا حکم نہیں ٹل سکتا۔ چنانچہ اٹھایا اور لے جا کر مسجد میں بٹھادیا۔

خواجہ محمد منظور نے فرمایا: میاں! اللہ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے، نہ اس لئے کہ دوسروں کو اپنا بندہ بنائے۔

یہ کہہ کر توبہ کرائی اور سارے مؤکلوں کو آزاد کرایا۔ صدق مقال، اکل حلال اور تقویٰ تو پہلے سے موجود تھا، نسبت دی تو فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔ کہتے ہیں کہ شاہ محمد غوث گوالیاری اپنے نام ہی کی طرح اپنے زمانے کے غوث ہوئے ہیں۔

شوکت مجذوب

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دو نظام کار فرما ہیں۔ ایک نظام تشریع، دوسرا نظام تکوین۔ ہر نظام کے لیۓ اللہ تعالیٰ نے علحدہ علحدہ افراد پیدا فرمائے ہیں۔ تشریعی نظام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ چلتا ہے اور تکوینی نظام کا کام دوسروں سے لیا جاتا ہے۔

ان دونوں قسم کے نظاموں اور دونوں کے لیۓ رجالِ کار کی تفریق کا پتہ ہمیں قرآن کریم سے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ سے چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریع کے آدمی ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام تکوین کے اور دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی معیت میں حضرت خضرؑ تین تکوینی کام کرتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ جو تشریع کے آدمی ہیں تینوں پر اعتراض فرماتے ہیں۔ تیسرے کام پر اعتراض کے بعد حضرت خضرؑ، حضرت موسیٰؑ کو رخصت کرتے ہیں تو اپنے تینوں کاموں کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کیۓ (بلکہ اللہ کے حکم سے کیۓ ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نظام تکوین کے لیۓ جو افراد مقرر فرماتا ہے بسا اوقات ان سے عقل سلب فرمالیتا ہے، تاکہ وہ شرعی تکلیفات (اللہ اور بندوں کے شرعی حقوق) کے پابند نہ رہیں اور صرف تکوینی امور کی انجام دہی میں مصروف رہیں، کہ یہی ان کی عبادت ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو مجذوب کہا جاتا ہے۔ لیکن ارباب بصیرت کے سوا کسی اور کا دیوانے اور مجذوب میں فرق کرنا بہت دشوار ہے۔ شوکت صاحب، جن کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں ان کے بارے میں تقریباً یقین ہے کہ وہ مجذوب تھے، محض دیوانے نہ تھے۔

شوکت صاحب کو میں نے دیکھا ہے، گولی مار (گلبہار کالونی) کی ایک کوٹھری میں رہتے تھے۔ یہ تقریباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ میں نے انہیں بغیر کمر بند کا پائجامہ پہنے اور

نیفے پر سے اپنے بائیں ہاتھ سے سنبھالے دیکھا ہے اور وہ کوٹھری بھی دیکھی ہے جس میں وہ رہا کرتے تھے۔ لیکن ان کے جو واقعات ذیل میں ذکر کر رہا ہوں، وہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب کے بیان کردہ ہیں، جو انہیں خوب جانتے تھے۔

شوکت صاحب، کے۔پی۔ٹی، کراچی میں کمپونڈر تھے۔ کے۔پی۔ٹی کے گیٹ کے باہر ایک مجذوب بیٹھا رہتا تھا، شوکت صاحب اس کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ وہ مجذوب بغیر کمر بند کا پائجامہ بائیں ہاتھ سے نیفے پر سے سنبھالے رہتا تھا۔

ایک روز شوکت صاحب نے مجذوب کو چائے لا کر دی۔ اس نے تھوڑی سی پی اور باقی شوکت صاحب کو یہ کہہ کر دی کہ اسے پی لو۔ شوکت صاحب نے پی لی۔ اس کے بعد سے ان کی حالت میں تغیر شروع ہوا اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مجذوب تو رخصت ہو گیا اور شوکت صاحب نے اس کی جگہ سنبھال لی۔

ایک مرتبہ میں حاجی محمد اعلیٰ صاحب اور حضرت شاہ زوّار حسین صاحب گولیمار میں حکیم شجاعت علی صاحب کے پاس گئے تو شوکت صاحب کو حکیم صاحب کے مطب کے باہر چبوترے پر بیٹھے دیکھا۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ یہی ان کی مستقل بیٹھک تھی۔ نہیں معلوم کہ انہوں نے کے۔پی۔ٹی کا گیٹ چھوڑ کر کب سے یہ بیٹھک اختیار کر لی تھی۔

شوکت صاحب کبھی کبھی گنگناتے بھی تھے اور عام طور پر ان کی مجذوبانہ بڑ سمجھ میں نہ آتی تھی، اگرچہ گاہے گاہے بہت صاف اردو بھی بول لیتے تھے۔ وہ کبھی کبھی لکھا بھی کرتے تھے اور حاجی اعلیٰ صاحب، جو خود بھی خوش نویس ہیں، فرماتے ہیں کہ ان کا خط بڑا پاکیزہ اور انتہائی باریک ہوا کرتا تھا۔ حکیم صاحب کی دوکان پر آکر بیٹھنے کے بعد وہ نہایت باریک خط میں بسم اللہ اور اس کے بعد چار مصرعے لکھتے تھے اور اس کے نیچے دستخط کر دیا کرتے تھے، تاریخ بھی لکھتے تھے۔

حکیم صاحب کو اولیاء اللہ اور مجذوبوں سے بڑا ربط تھا۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب نے شوکت صاحب سے فرمائش کی کہ اپنے سردار کی زیارت تو کرائیں۔ سن کر خاموش

ہو گئے ۔ ایک روز ایک پٹھان کا رکشہ مطب کے سامنے رکا ۔ شوکت صاحب نے حکیم صاحب سے کہا: چلو چلو تمھیں سردار کی زیارت کراؤں ۔ حکیم صاحب نے مطب بند کیا اور رکشا میں بیٹھ کر دونوں روانہ ہو گئے ۔ نیٹی جیٹی کا پل پار کر کے ایک جگہ پہنچے ، شوکت صاحب نے رکشہ رکوایا، نیچے اترے اور اشارے سے ایک ٹیلے پر بیٹھے سر پر عمامہ باندھے ایک بزرگ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ ہمارا سردار بیٹھا ہے، یہ کہہ کر شوکت صاحب بھاگ گئے ۔ حکیم صاحب سردار کے پاس گئے، ان کے پاس مریم بھی تھی، جو کیماڑی میں بیٹھی رہتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ بھی مجذوبہ ہے ۔ حکیم صاحب نے قریب پہنچ کر سردار کو سلام کیا ۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا چلو چلو، تم بھی کس دیوانے کی باتوں میں آ گئے ۔ مریم نے کہا: آپ یہاں بھی آ گئے ۔ حکیم صاحب واپس آ گئے ۔

ایک مرتبہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب، حکیم صاحب کے پاس گئے ۔ بیچ فرش میں شوکت صاحب بیٹھے تھے ۔ حکیم صاحب نے شوکت صاحب سے کہا: تم اوپر کرسی پر بیٹھ جاؤ ۔ یہ سنتے ہی شوکت صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے؛ تم نے سمجھا کیا ہے، یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا، تمہاری قبر بنا دوں گا ۔ ۔ ۔ دو سال بھی نہ گذرے تھے کہ حکیم صاحب کو فالج ہو گیا اور بارہ سال بعد اسی فالج میں ان کا انتقال ہوا ۔

حاجی اعلیٰ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میری شوکت صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ بھائی شوکت! دیکھو تو اپنے حکیم صاحب کو کیا ہو گیا ہے ۔ صاف اردو میں کہنے لگے: میں کیا کر سکتا ہوں ۔

حاجی اعلیٰ صاحب نے ایک روز شوکت صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی بیوی کا قاتل اس وقت کیا کر رہا ہے؟ کہنے لگے ۔ جھاڑو دے رہا ہے ۔ حاجی صاحب کی اہلیہ کا قاتل ایک بھنگی تھا ۔ اس واقعہ کی تفصیل "مولانا عبدالغفور صاحب عباسی" کے ذکر میں ہے ۔

ہلّوبی

ہلّوبی ٹونک کی ایک مشہور مجذوبہ تھیں سکتے پاتیں اور ہمیشہ ننگی رہتی تھیں، لیکن حکیم برکات احمد صاحب نواب صاحب کے پاس جاتے ہوئے ادھر سے گذرتے تو سامنے آنے سے پہلے چلاتیں "کپڑے لاؤ، کپڑے لاؤ، مرد آرہا ہے" اور جب تک حکیم صاحب گذر نہ جاتے، بدن ڈھانپے رکھتیں۔

یاد آیا کہ کسی عارف نے دنیا کو خواب میں ایک دوشیزہ کی شکل میں دیکھا۔ دریافت کیا کہ اتنے خصموں کے ہوتے تو اب تک دوشیزہ کس طرح ہے۔ جواب دیا کہ جو مرد تھے انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں لگایا اور جنہوں نے ہاتھ لگایا وہ سب نامرد تھے۔

دو جن عورتیں

حاصل پور میں ایک حکیم صاحب تھے، حکیم مولا بخش مرحوم۔ ان کا ایک واقعہ مجھے حضرت شاہ زوّار حسین صاحب مرحوم نے سنایا کہ ایک روز حکیم صاحب مطب کر رہے تھے کہ دو برقعہ پوش عورتیں چہروں پر نقاب ڈالے مطب میں آکر بیٹھ گئیں۔ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے کہا کہ تمام مریضوں کے بعد ہم اپنا حال سنائیں گے۔ جب تمام مریض جا چکے تو انہوں نے اپنے نقاب الٹ دیئے۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت عورتیں نہیں دیکھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم جن عورتیں ہیں۔ اس طرف سے گذر رہے تھے کہ آپ کو بیٹھے دیکھا، سوچا کہ آپ سے مل بھی لیں۔ ہم دلّی میں آپ کے مطب میں آیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ پاکستان کیسے آنا ہوا تو انہوں نے جواب دیا کہ جس طرح کافروں اور مسلمانوں کی آبادیوں کے تبادلے ہوئے ہیں اسی طرح کافر اور مسلمان جنّات میں آبادی کا انتقال ہوا ہے۔ ہم چونکہ مسلمان تھے اس لئے پاکستان آگئے۔

جے پور کا ایک راجہ

میرے استاد مولانا منتخب الحق صاحب مرحوم نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ جے پور کا ایک وارثِ تخت (شاید مادھو سنگھ) ریاست بدر کر دیئے جانے کی وجہ سے ٹونک میں پناہ گزین تھا۔ نواب ابراہیم علی خان کی عنایات اور مسلمانوں کے درمیان کئی سال زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے پیشرو کے انتقال پر وہ تخت کا وارث ہوا اور جے پور جا کر گدی سنبھال لی۔

جے پور ایک خوبصورت شہر ہے۔ کشادہ سڑکیں، سیدھی سیدھی گلیاں کہ ہر گلی دونوں سروں پر کسی شاہراہ سے ملتی ہے۔ لیکن بعض سڑکوں کے بالکل وسط میں ہندوؤں نے مندر بنا دیئے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک خان صاحب کو غصہ آیا اور انہوں نے ایک مورتی کی گردن توڑ دی۔ پنڈتوں نے راجہ کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔ راجہ نے حیرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے پنڈتوں سے دریافت کیا کہ اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مہاراج! جس نے بھگوان کی مورتی توڑی ہے اس کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ اس کی مورتی توڑ دی جائے۔ راجہ نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن آج ہمیں بہت غصہ ہے اور غصے میں صحیح فیصلہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے قید کر دیا جائے اور پندرہ روز بعد دوبارہ یہ مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

پندرہ روز بعد مقدمہ دوبارہ پیش ہوا۔ راجہ کے دریافت کرنے پر پنڈتوں نے اپنا سابق جواب دہرایا کہ سزا میں اس کی مورتی توڑ دی جائے۔ راجہ نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ہمیں سخت غصہ ہے اور اس حالت میں ہم صحیح فیصلہ

نہیں کر سکتے۔ پندرہ روز بعد یہ مقدمہ پھر ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

اس عرصے میں راجہ نے خان صاحب کے اعرہ کو بلا کر پانچ سو اشرفیاں دیں اور کہا کہ میں جرمانہ کروں تو فوراً یہ اشرفیاں پیش کر دی جائیں۔

تیسری بار جب مقدمہ پیش ہوا تو راجہ نے کہا، آج ہماری طبیعت پر سکون ہے، آج ہم اس مقدمے کا فیصلہ کریں گے۔

راجہ: ہاں پنڈت جی، اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟

پنڈت جی: مہاراج! اس نے بھگوان کی مورتی توڑی ہے۔ اس کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ اس کی مورتی توڑ دی جائے۔

راجہ: بھگوان کی مورتی کیا دوبارہ بن سکتی ہے؟

پنڈت جی: ہاں مہاراج، انسان ہی کی بنائی ہوئی تھی، دوبارہ بھی بن سکتی ہے۔

راجہ: اور اگر اس شخص کی مورتی توڑ دی جائے تو کیا یہ دوبارہ بن سکتی ہے؟

پنڈت جی: مہاراج! یہ تو بھگوان کی بنائی ہوئی مورتی ہے، اسے دوبارہ کون بنا سکتا ہے۔

راجہ: اپنا انصاف یہ نہیں کہتا کہ جو مورتی دوبارہ بن سکتی ہے اس کے بدلے میں وہ مورتی توڑ دی جائے جسے دوبارہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن (مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے) اس نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میں اس پر پانچ سو اشرفیاں جرمانہ کرتا ہوں، تاکہ مورتی دوبارہ بنوائی جا سکے اور اگر اسی وقت جرمانہ ادا نہ کیا گیا تو گردن اڑا دوں گا۔

اعرہ نے فوراً اشرفیان پیش کر دیں۔

متفرقات

کراچی میں برائٹ پرنٹرز کے مالک نے ایک مرتبہ حسب ذیل واقعات سنائے:

○ ... ہماری دوکان بمبئی میں تھی۔ وہاں ایک مشہور موالی تھا۔ اسے حج کی سوجھ گئی۔ ہر ایک کو روک روک کر کہتا میں حج پر جارہا ہوں، میں نے تمہیں بہت ستایا ہے، مجھے معاف کر دو۔ حج کو آیا، مدینہ منورہ گیا لیکن مسجد نبوی کے اندر جانے کی جرأت نہ کی۔ باہر سڑک پر ٹہلتا جاتا تھا کہ میں تو اتنا گنہگار ہوں حضورؐ کو کیسے منہ دکھاؤں۔ بالآخر وہیں سڑک پر گرا اور روح پرواز کر گئی۔

○ ... رحیم یار خان میں ایک باؤلا سا ہے۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہاں کے کچھ متمول اہلحدیث تاجر حج پر جانے لگے تو مشورہ ہوا کہ اسے بھی ساتھ لے لیں، کام بھی کر دیا کرے گا اور دلچسپی بھی رہے گی۔ چنانچہ ساتھ لے گئے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ گئے اور جب مدینہ منورہ سے جدہ آنے لگے، سامان گاڑی میں رکھ دیا، تو کسی نے اس سے مذاق میں کہا کہ ارے فلانے! تو نے حضورؐ سے حج کی قبولیت کا سرٹیفکیٹ بھی لے لیا ہے یا نہیں؟ اس نے پوچھا۔ کیا تم سب نے لے لیا ہے؟ کہا: ہاں۔ بولا: میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر بھاگ کر مسجد نبوی پہنچا اور جالیوں میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے مجھے تو سرٹیفکیٹ دیا ہی نہیں اور پھر بھاگا بھاگا گاڑی پر پہنچا اور بتایا کہ میں سرٹیفکیٹ لے آیا ہوں۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بہت پرانے طرز کا کاغذ تھا اس پر لکھا تھا کہ تمہارا حج قبول ہو گیا اور نیچے "محمد رسول اللہ" کی مہر تھی۔ لوگ اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

○ .... محمد سعید دباس، سوری، ریاض میں کمپیوٹر کی ایک فرم میں ملازم ہیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کا قصہ ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کو سنایا اور ڈاکٹر زبیر احمد صاحب نے مکہ مکرمہ میں مجھے سنایا۔ اگر یہ دونوں حضرات انتہائی ثقہ اور متدین نہ ہوتے تو میں یہ قصہ درج نہ کرتا۔

قصہ یہ ہے کہ دباس صاحب کی والدہ کو پیٹ کا السر ہوا اور منہ سے خون آنا شروع ہو گیا اور مرض اس مرحلہ پر پہنچ گیا کہ دو تین ہسپتالوں میں لے گئے تو انہوں نے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر ایک عیسائی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس نے بڑے تردد کے بعد کہا کہ اچھا میں کوشش کرتا ہوں، چنانچہ آپریشن کا وقت متعین ہو گیا۔ آپریشن سے قبل ان کی والدہ پر غنودگی کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپؐ نے سینے اور پیٹ پر دستِ مبارک پھیرا۔ اس کے بعد ایکسرے لے لیا تو السر کا نام و نشان نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے کچھ گولیاں دے کر رخصت کر دیا۔

○ .... ۸/۷/۱۴۰۷ھ مطابق ۸/۳/۱۹۸۷ء۔

آج حرم مکی میں میرے مرکز البحث العلمی کے رفیق کار ڈاکٹر نجاتی نے ایک ترک جوان محمد یار یانق سے ملاقات کرائی، جو تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں اور رائے ونڈ میں رہنے اور وہاں باقاعدہ اردو سیکھنے پڑھنے سے کسی حد تک اردو میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نجاتی نے ان کا ایک خاص واقعہ ہمیں کئی ماہ پہلے سنایا تھا اور اسی واقعہ کی بنا پر ہم نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ محمد یار یانق نے غار حرا میں چلہ کرنے کی نذر مانی اور ضرورت کا سامان لے کر وہاں چلے گئے، لیکن چند روز بعد بیمار ہوئے اور بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ مکہ کے ایک صاحبِ ثروت شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب

میں فرمایا کہ ہمارا فلاں شخص غار حراء میں بیمار ہے، اسے جا کر لے آؤ۔ وہ وہاں پہنچا، اپنے ساتھ لایا، اپنے پاس رکھا، انہیں رہنے کے لئے ایک بنگلہ دیا اور سواری کے لئے ایک مرسیڈیز۔ آج کل وہ ترک اسی کے پاس ہیں۔

○ ... عبید الرحمن صاحب فیصل آباد (پاکستان) کے رہنے والے ہیں۔ یہ بچپن ہی میں اپنے والدین کے ساتھ مکہ معظمہ میں آ بسے تھے۔ ان کی تعلیم بھی یہیں ہوئی اور مدتوں جامعہ ام القریٰ کی لائبریری میں ملازم رہے۔

موصوف نے بیان کیا کہ ہم لوگ رباط ٹونک میں رہتے تھے۔ اوپر والدین تھے اور نیچے کے کمرے میں میرا قیام تھا۔ جس کمرے میں میری رہائش تھی اس میں ایک سانپ تھا۔ میرے والد نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ یہ سانپ تمہیں نہیں ستائے گا، تم بھی اسے مت ستانا۔ چنانچہ کبھی کبھی اپنے سامنے ادھر سے ادھر جاتے دیکھ لیتا تھا، کسی صبح سو کر اٹھتا تو دیکھتا وہ میرے پہلو میں سویا ہوا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہو کر کھونٹی سے کرتا اتارتا تو وہ آستین میں سے ٹپک پڑتا۔ مدتوں میں اسی حال میں اس کمرے میں رہا۔

مکہ معظمہ میں ٹونک (ہندوستان کی ایک سابق ریاست) کی دو رباطیں تھیں، ایک شامیہ میں جبل ہندی کی جانب، دوسری حارۃ الباب میں۔ عبید صاحب کا واقعہ حارۃ الباب والی رباط کا ہے۔ میں نے یہ دونوں رباطیں دیکھی ہیں لیکن بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے اب دونوں منہدم کی جا چکی ہیں۔ پہلے شامیہ والی منہدم کی گئی اس کے دو تین سال بعد حارۃ الباب والی۔
